رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے اُفق

کراچی

PDFBOOKSFREE.PK

ابتدائیہ

دستک — مشتاق احمد قریشی — 8
گفتگو — عمران احمد — 10
اقرأ — طاہر احمد قریشی — 20

سچی کہانیاں

اقرارِ گناہ — شہنی ارشاد — 122
کینہ پرور — قمر جہاں — 134
نیا سورج — نزہت جبیں ضیاء — 143
پریشان لمحات — نازسلوش ذشے — 185
خالی دامن — طاہرہ جبیں تارا — 188
پدرگرفتہ — یونس خلش — 199
تلاش مجرم — ریاض بٹ — 202

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مغربی ادب سے انتخاب

سازشی ذہن — اسرار احمد — 58
اقرارِ محبت — راحیلہ تاج — 68
سچے موتی — اقبال بھٹی — 74

مستقل سلسلے

بیت المقدس — الماس ایم اے — 22
بازی گر — حسام بٹ — 84
گردش — شہناز بانو — 148
خطروں کا کھلاڑی — اے حمید — 222
بزمِ سخن — روبین احمد — 212
خوشبوئے سخن — سیما بنت عاصم — 215
ذوق آگہی — عفان احمد — 219

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز، ای میل Info@aanchal.com.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

سیاسی ہَوا کا تازہ جھونکا.....!!

تحریک انصاف کی گڈی چڑھ رہی ہے۔ اہم شخصیات جن میں سابقہ وزراء اور بیوروکریٹس بھی شامل ہیں دھڑا دھڑ تحریک انصاف کا حصہ بن رہے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ معروف' غیر معروف شخصیات کا ایک بڑا سیاسی میلہ سج رہا ہے۔ کل کیا ہوگا؟ اللہ جانے' لیکن بظاہر آثار اچھے ہی نظر آ رہے ہیں۔ جس تیزی سے عمران خان کی گڈی اونچی چڑھ رہی ہے ان کے مخالفین کی نیندیں حرام ہو رہی ہیں۔ وہ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے یہ تمام مفاد پرست' موقع پرست لوگ عمران خان کے جلسوں کو دیکھ دیکھ کر ان کی طرف دوڑ پڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس معیار پر پورا نہیں اترتا جس کا ڈنکا عمران خان صاحب بجاتے پھر رہے ہیں۔ اگر غور کیا جائے اور سوچا جائے تو سیاست جس چڑیا کا نام ہے اس میں وہی لوگ کامیاب و کامران رہتے ہیں جو بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو وقت پر وقت کے مطابق فیصلے کرتے ہیں وقت کے مطابق چلتے ہیں اور جو لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں وہ لکیر ہی پیٹتے رہ جاتے ہیں اور سیاست تو نام ہی موقع پرستی کا ہے۔ سیاست کی اپنی اخلاقیات ہیں جس طرح کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے ایسے ہی کہہ سکتے ہیں کہ سیاست اور اقتدار میں سب جائز ہے پھر یہ کہ جو لوگ ماضی کو نظر انداز کرتے ہوئے حال بلکہ مستقبل پر نظر رکھتے ہیں وہی صاحبِ نظر سیاست میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اب پرانے سیاست دان یا سیاسی بازی گران جرأت آزماں لوگوں پر طنز و تنقید کر رہے ہیں جو انہیں پیچھے چھوڑ کر ایک قدم آگے بڑھ کر عمران خان کے ہم جولی بن رہے ہیں۔ یقیناً ان کے نزدیک عمران خان کی جماعت میں شامل ہونے والے موقع پرست مفاد پرست ہو سکتے ہیں لیکن یقیناً وہ تمام لوگ ایسے باصلاحیت ضرور ہیں جو وقت کی نبض پر پہنچتے ہیں اور ہَوا کے رخ پر چلنا جانتے ہیں۔ یقیناً ایسے ہی لوگ وقت کے ساتھ چلنا بھی جانتے ہوں گے۔ کہنے والی زبانیں کچھ کہتی

رہیں جن کے ہاتھ اقتدار کے انگور نہیں آتے وہ انہیں کھٹا ہی کہتے ہیں وہ کسی طرح مطمئن ہی نہیں ہوتے جب تک کہ خود اقتدار حاصل نہیں کر لیتے اور جب اقتدار حاصل کر لیتے ہیں تو وہ جس کرسی پر' کرسی نشین ہوتے ہیں وہ ان سے پہلے جانے والوں کی ہی کرسی ہوتی ہے جو انہیں ورثے میں ملتی ہے اقتدار کی ہر کرسی کے اپنے اصول اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ جب کوئی کرسی نشین ہوتا ہے تو کرسی اسے اپنے پھندے میں جکڑ لیتی ہے۔ اس کے اپنے اصول اور طریقہ کار ہوتا ہے۔ یہ زبانی کلامی انقلاب لانے والا جب کرسی نشین ہوتا ہے تو وہ اپنی چوکڑی بھول جاتا ہے اور وہ وہی کرنے لگتا ہے جو اس کرسی کا تقاضہ ہوتا ہے کرپشن بدعنوانی تو اسے اس کرسی کے سات ورثے میں ملی ہوتی ہے وہ کوئی نئی بات یا نیا کام نہیں کرتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اب نئی جماعت جو نئے عزم و حوصلے کا اعلان ہی نہیں کر رہی اظہار بھی کر رہی ہے کیا کرتی ہے کیا کر کے دکھاتی ہے کہیں علی بابا چالیس چور والی کہانی نہ دہرائی جائے۔ کچھ بھی سہی سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ وطن عزیز میں جو سیاسی جمود جو سیاسی گھٹن طاری ہو چکی تھی تحریک انصاف اس گھٹن زدہ ماحول میں تازہ ہَوا کا جھونکا محسوس ہو رہا ہے۔ ایک ایسے ماحول میں جب پرانے سیاسی شکاری ناکام و نامراد ہو رہے ہیں ایسی فضا میں اگر عمران خان نیا جال لے کر میدان میں اتر رہے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ملک کی واقعی تقدیر بدلنے والی ہو اور کوئی معجزہ رونما ہونے والا ہو کیونکہ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے جب وہ موسیٰ علیہ السلام کے جانی دشمن سے ان کی پرورش نگہداشت کرا سکتا ہے اور خود وطن عزیز میں ایک شراب کے رسیا سے شراب پر پابندی لگوا سکتا ہے تو اس ربّ کائنات کے لیے تو سب کچھ ممکن ہے وہ جو چاہے جس طرح چاہے کر سکتا ہے۔ وہ قادر مطلق ہے ہو سکتا ہے کہ اس قادر مطلق نے وطنِ عزیز کے لیے اب کوئی بہتری کا راستا بھلائی و فلاح کا راستا کھول دیا ہو۔ اللہ ہماری ہمارے وطن عزیز کی حفاظت فرمائے اور ہر قسم کی سیاسی اخلاقی مذہبی گندگی سے وطن عزیز کو پاک صاف فرمائے آمین۔ ہو سکتا ہے کہ عمران خان کی جماعت تحریک انصاف سیاسی ہَوا کا تازہ جھونکا ہی ثابت ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گفتگو

عمران احمد

حدیث نبوی ﷺ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان و مال کے بارے میں امن میں ہوں اور مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے اور مہاجر وہ ہے جو نافرمانی کی راہ ترک کردے۔'' (مشکوٰۃ)

عزیزانِ محترم..... سلامت باشد!

نئے عیسوی سال کا دوسرا شمارہ حاضرِ مطالعہ ہے۔ امید ہے آپ کے معیار پر پورا اترے گا۔

آج کل ہر طرف مہنگائی کا دور دورہ ہے۔ ہر شے لوگوں کی پہنچ سے دور اور دور ہوتی جارہی ہے۔ کسی زمانے میں موت سستی تھی لوگ مسائل سے چھٹکارے کا آسان حل حرام موت کو سمجھتے تھے کوئی پھندے سے لٹک کر جان ہار جاتا تھا تو کوئی زہر پھانک کر زندگی جیسی قیمتی شے گنوا بیٹھتا تھا' مگر اب تو وہ بھی مہنگی ہوگئی ہے کہ قبر کے لیے دو گز زمین بھی پندرہ سے بیس ہزار میں ملتی ہے پھر اس کے ساتھ دیگر لوازمات الگ۔ اب بچوں کو دو وقت کی روٹی' عید پر انہیں کپڑے بنا کر نہ دینے والا مجبور باپ کوشش کے اور نیت کے باوجود خودکشی کا نہیں سوچتا کہ اس کی بیوہ اس کے لیے کفن کہاں سے خریدے گی۔ دوسری طرف ہمارے رنگیلے سیاست دان جلسوں کے مقابلے میں لگے ہوئے ہیں ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخالف سے بڑا اور شاندار جلسہ کرے۔ اگر ان جلسوں پر آنے والے اخراجات کا اندازہ لگایا جائے تو ایک جلسہ کا تخمینہ لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں جا پہنچتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ اس عوام کی محبت میں کرتے ہیں جو 70 روپے کلو دودھ خریدنے کی سکت نہیں رکھتے۔ دوسری طرف حکمرانوں سمیت بہت سی جماعتیں نئے صوبوں کی تشکیل کے لیے واویلا کررہی ہیں کہ نئے صوبوں کی تشکیل سے 32 روپے کلو آٹا اور 60 روپے کلو چینی خریدنے پر مجبور عوام کے مسائل حل ہوجائیں گے۔ ان ''رہبرانِ قوم'' کے نزدیک مہنگائی' بیروزگاری' گیس' پیٹرول اور قومی سلامتی اہم مسائل نہیں بلکہ نئے صوبوں کی تشکیل بڑے بڑے جلسے اہم ہیں۔ دوسری طرف اگر ہم خود اپنے گریبانوں میں جھانکیں تو وہاں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے۔ عیسائیوں کے نئے سال کی خوشی میں پاکستانی مسلمانوں نے جشن مناتے ہوئے ایک رات میں کروڑوں روپے پھونک دیے۔ اسٹیٹ بنک کی ایک رپورٹ کے مطابق غریب پاکستانیوں نے جنہیں پینے کو صاف پانی بھی میسر نہیں' سال گزشتہ میں 2 ارب روپے سے زائد صرف سگریٹ کے دھوئیں میں اڑا دیے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس سمت میں جارہے ہیں۔ کیا گائے' بھینسوں کا چارہ آسٹریلیا سے درآمد کیا جاتا ہے جو دودھ 70 روپے کلو فروخت ہوتا ہے جب کہ گزشتہ سال سیلاب کی تباہ کاریوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے گندم' کپاس' گنے اور چارہ کی بھرپور پیداوار دی۔ پھر ملک میں قائم 80 فیصد شوگر ملیں ان سیاست دانوں کی ہیں جو عوام کے دکھ میں بیمار ہوکر بیرونِ ملک علاج پر مجبور ہوجاتے ہیں لیکن اپنے منافع میں رتی برابر کمی کرنے پر تیار نہیں۔ امریکہ اور اسرائیل کو للکارنے والی جماعتیں مقامی منافع خوروں سے نجانے کیوں خوف زدہ ہیں کہ وہ زبانی کلامی بھی ان تاجروں' آڑھتیوں' ہول سیلروں کو دھمکی نہیں دیتیں کہ اگر انہوں نے اشیائے خوردونوش کے دام کم نہ کیے یا منافع کا مارجن کم نہ کیا تو ان کی مارکیٹوں کا گھیراؤ کرلیا جائے گا۔ جلسوں پر کروڑوں' اربوں روپے خرچ کرنے والے عوام کی محبت میں اس رقم سے ایسے ٹرسٹ قائم کیوں نہیں کرتے جو اشیائے ضروریہ خرید کر عوام کو نفع نقصان کے بغیر فراہم کریں۔ حالانکہ اس کی مثال موجود ہے' گزشتہ دنوں پڑوسی ملک سے ایک خبر آئی جو ہمارے قومی اخبارات نے بڑے نمایاں انداز میں شائع کی کہ بھارتی حکومت نے کھانے پینے کی اشیا کی قیمتیں کم کرنے کے لیے دو سو ارب

روپے سے زائد کی سبسڈی دی تاکہ عوام کو آٹا ایک روپے کلو گھی اور چینی چار روپے کلو اور دالیں ایک روپے کلو دستیاب ہوسکیں۔ اتفاق سے وہ بت پرست ہے اسلامی قدروں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ انہیں تو خوفِ خدا بھی نہیں اور ایک ہم کہ.....؟ یاد رکھیں اللہ تعالیٰ اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا جسے خود اپنی حالت بدلنے کا خیال نہ ہو۔

آپ کے خطوط آپ کی محبت کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے اپنی کارکردگی جانچنے کا پیرومیٹر بھی ہوتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ گفتگو میں زیادہ سے زیادہ قارئین شامل ہوں لیکن ہمارے بعض دوست بیس بیس صفحات پر مشتمل خطوط ارسال کردیتے ہیں جو اگر مکمل شائع کردیے جائیں تو صرف دو تین قارئین کے سوا کسی کو موقع نہ ملے اور ان خطوط کی ایڈیٹنگ کی جائے تو وہی شکوہ کرتے ہیں۔ یاد رکھیں پندرہ بیس صفحات میں اپنے خیالات کا اظہار قابلیت نہیں بلکہ اصل لطف اور حسن تو یہ ہے کہ اپنے خیالات اپنا مافی الضمیر اختصار کے ساتھ سامنے والے تک پہنچ جائے اس لیے ہماری قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے خطوط میں اختصار سے کام لیا کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین کو موقع مل سکے۔

محمد ارشاد قریشی..... اسلام آباد میرے سب لکھاری ساتھی جب میرا یہ خط پڑھ رہے ہوں گے تو نئے سال کے پہلے مہینے کا آدھا حصہ گزر چکا ہوگا۔ میں اپنے سب ساتھیوں کو نئے سال کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ سب کے لیے امن' سکون اور صحت و سلامتی کی دعا۔ بہت سارے دوستوں نے گزرے سال کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ میں جاری سال کے بارے میں دعا گو ہوں کہ ربِ کائنات اس سال کو ہمارے ارضِ پاک کے لیے شادمانی کا سال بنادے۔ ارضِ پاک میں امن ہو۔ اس میں بسنے والے ہر شخص کے چہرے پر کبھی دکھ کا نشان نہ ہو۔ جو اس ملک اس کی غیور افواج اور عوام کے دشمن ہیں وہ نیست و نابود ہوں۔ اپنے میگزین نے افق کا ہر طرف بول بالا ہو۔ اس کی انتظامیہ اور اس میں لکھنے والے سب دوست سلامت رہیں۔ کوئی بھی کبھی دکھ کا منہ نہ دیکھے' آمین۔ اب آتا ہوں خطوط کی جانب! عبدالمالک کیف' شہناز بانو نے اپنے خطوط میں یاد رکھا بہت بہت شکریہ۔ کامران شاہ کامی کی واپسی ہوئی' محفل میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی' آکاش بخاری' محمد فہد' راؤ چاند' ملک ظفر شاہین' شہنی ارشاد۔ بھئی آپ سب کی کمی محسوس ہورہی ہے' گفتگو میں حاضری دے دو۔ کہانیوں میں اس مرتبہ حقیقی مسرت' شہنی ارشاد۔ گردش' شہناز بانو۔ سراب' دعا فاطمہ۔ بازی گر' حسام بٹ۔ کردار' فاخرہ سلطانہ۔ عشق نامراد' عثمان خالق مجھے پسند آئیں۔ باقی کہانیاں اپنے معیار کے مطابق تھیں۔ شہنی ارشاد نے حقیقی مسرت میں جو نماز کے بارے میں لکھا' اللہ کرے ہر گھر میں ایسی ماں ہو جو نماز کی پابندی کرائے۔ خوش بو سخن میں شہناز بانو' مجاہد ناز عباسی' ریحانہ سعیدہ' عصمت اقبال عین۔ عبدالمالک کیف' کی غزلیں بہت اچھی تھیں۔ عبدالرحمن ساغر نے کیا خوب لکھا' کا کامنا۔ آخر میں دعا گو ہوں کہ میرے مالک تو اپنے حبیب کے صدقے جناب فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب کو صحت و تندرستی عطا فرمادے۔ مجھ سمیت جو بھی بیمار ہیں سب کی بیماری کو شفا میں بدل دے' آمین۔ جو دوست ایس ایم ایس اور فون پر رابطہ رکھتے ہیں اللہ پاک ان کے لیے آسانیاں عطا فرمائے' آمین۔

مجاہد ناز عباسی..... سنجر پور۔ محترم جناب عمران احمد صاحب السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ آپ اللہ کے فضل و کرم اور ہماری دعاؤں سے ٹھیک ہوں گے۔ محترم سب سے پہلے میں آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری تحریر ''عورت کا کردار'' کو نئے افق کی زینت بنایا اور میری غزل اور خط کو بھی نئے افق میں جگہ دی۔ بھائی میں پہلے بھی ایک رسالے میں لکھتا رہا ہوں لیکن آپ یقین مانیں مجھے وہاں سے اتنی عزت نہیں ملی جتنی مجھے نئے افق سے مل رہی ہے۔ نئے افق واحد ادارہ ہے جس میں نئے لکھنے والوں کو تہہ دل سے خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ نئے افق کے تمام رائٹرز ماشاءاللہ نئے رائٹروں کی بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں' جس سے ہمیں مزید لکھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اس بار جنوری کا شمارہ ٹائم پر ملا' ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ ''دستک'' میں مشتاق احمد قریشی صاحب نے ہمیں حکمرانوں کی پالیسیوں پر غور کرنے پر مجبور کیا۔ چند منٹ غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ عمران بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ''گفتگو'' میں سب سے پہلا نام میرے پیارے دوست عبدالمالک کیف کا تھا کیف نے بہت اچھا لکھا۔ کیف بھائی آپ کہاں ہیں؟ کئی مہینوں سے آپ سے نہ بات ہوئی ہے نہ ملاقات؟ بھائی میرے پاس آپ کا نمبر تھا لیکن میں بس میں سفر کررہا تھا میرا موبائل کسی نے نکال لیا اور بدقسمتی سے وہ سم بھی میرے نام پر نہیں تھی اس لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے مجبوراً دوسری سم لے لی۔ بھائی اب میرا یہ نمبر ہر وقت آن رہتا ہے 0306-2877737۔ محمد اسحاق انجم بھائی کیسے ہیں آپ؟ کامران شاہ کامی ہمیں خوشی ہے کہ آپ ایک بار پھر نئے افق میں حاضر ہوئے ہیں' ویلکم جی! عصمت اقبال عین صاحبہ کا تبصرہ کافی مختصر تھا۔ محمد اسلم جاوید نے بھی بہت اچھا لکھا۔ ان کا تبصرہ پڑھتے پڑھتے میں اچانک خیالوں میں گم ہو گیا۔ ناز سلوش ذشے' شہناز بانو' عالیہ انعام الٰہی' فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب' ریاض حسین قمر' سید عبداللہ شاہد' طاہرہ جبیں تارا اور محمد ارشاد قریشی صاحب کو محفل گفتگو میں پا کر دل کو بہت راحت محسوس ہوئی۔ وعلیکم السّلام ارشاد بھائی! آپ کیسے ہیں؟ ''اقراء'' میں طاہر قریشی صاحب نے ہمیں امانت میں خیانت نہ کرنے سے آگاہ کیا۔ بزم سخن کی ساری شاعری اپنی مثال آپ تھی۔ خوش بو سخن میں عبداللہ عاطر' شہناز بانو' میثم علی آغا' عبدالمالک کیف' عصمت اقبال عین' ریحانہ سعیدہ اور عبدالحکیم ساجد کی غزلیں قابل تعریف تھیں۔ ذوقِ آگہی میں انجم نذیر نے ہمیں جمعہ کی غفلت کے بارے میں بتایا' محمد حذیفہ کی تحریر ''نیکی کی ہدایت'' بھی بہت اچھی تھی۔ کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں ان کے بارے میں اگلے خط میں تبصرہ کروں گا۔ آخر میں تمام نئے افق اسٹاف اور تمام نئے رائٹرز اور پڑھنے والوں کو میری طرف سے نہایت ادب و احترام سے السّلام علیکم!

ریاض بٹ...... از حسن ابدال۔ جناب عمران صاحب السّلام علیکم! سالِ نو کا پہلا شمارہ ایک مختصر سرورق کے ساتھ نگاہوں کے سامنے ہے۔ سرخی کول اور صدوری کے اشتہارات سے مستفید ہونے کے بعد فہرست پر جا کر نظر ٹھہری۔ بہت خوب آپ نے تو اسے نئے انداز میں پیش کر کے ہمارے دل جیت لیے ہیں' ویل ڈن۔ اس کے بعد پہنچے دستک تک۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کو اللہ زندگی دے اور ان کے لازوال قلم کو جلا بخشے۔ بڑے منفرد' اچھوتے اور خوب صورت انداز میں موجودہ حالات کی بالکل صحیح اور سچی تصویر پیش کی۔ ویسے تو یہ بات کہی جاتی ہے کہ امید پر دنیا قائم ہے لیکن مجھے نہیں امید کہ عمران خان کوئی بڑا کارنامہ انجام دے سکے گا۔ کرکٹ کی پچ اور سیاست کی بساط میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے۔ آگے اللہ خیر کرے۔ اس کے ارد گرد بھی آزمائے ہوئے سیاست دان اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ جسے پیا چاہے وہی سہاگن اور ہمارا ''پیا'' تو امریکہ بہادر ہے۔ اس موضوع پر اگر بات کی جائے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اس لیے بوجھل دل لیے اپنی محفل میں قدم رکھتے ہیں۔ پہلا محبت نامہ ہے جناب عبدالمالک کیف کا۔ بہت خوب بھائی اچھا تبصرہ ہے۔ کافی مدت کے بعد کامران شاہ کامی آئے ہیں اور آتے ہی چھا گئے ہیں۔ جیسے ساون کی بدلی چھا جاتی ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ دوبارہ لکھنے لکھانے کا کام شروع کر رہے ہیں۔ محمد اسحاق انجم آپ کا شعر پسند آیا۔ ناز سلوش ذشے بہن محکمہ ڈاک والوں کی مہربانیاں عروج پر ہیں۔ اب تو رجسٹرڈ خطوط بھی گم ہونے لگے ہیں۔ آپ کا تبصرہ اچھا ہے۔ بہن شہناز بانو آپ کی باتیں دل موہ لینے والی ہیں۔ موجودہ حکمرانوں کا رونا کہاں تک رویا جائے۔ آپ کی یہ بات بھی بالکل سچ ہے کہ اس ہوش رُبا مہنگائی میں اتنی کم قیمت پر ایسا پرچہ نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ جس کے لیے نئے افق کی پوری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب ''گردش'' آپ کے خوب صورت قلم سے صفحہ قرطاس پر بکھرے گی۔ اس پر تبصرہ ان شاء اللہ آئندہ کروں گا۔ عالیہ انعام بہن' محمد ارشاد قریشی کے تبصرے بھی بہت پسند آئے۔ فقیر محمد بخش لنگاہ بھائی آپ کی نیک تمنائیں اور دعائیں مجھ تک پہنچ گئیں۔ خدائے بزرگ و برتر آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ اس بار میری کہانی موجود ہے۔ اس کے متعلق ضرور بتائیے گا۔ سید عبداللہ شاہد آپ کا تبصرہ خوب ہے۔ لفظوں کا چناؤ منفرد ہے۔ لفظوں سے دلوں میں آگ لگانے کی سعی کی ہے۔ جس میں کامیاب رہے ہو۔ طاہرہ جبیں بہن! یہ جان کر افسوس ہوا کہ خط لکھنے تک پرچہ آپ کو نہیں پہنچا...... اب بات ہو جائے کہانیوں کی۔ الماس ایم اے کی تاریخی کہانی ''بیت المقدس'' اپنی مثال آپ ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے متعلق بہت سے رسالوں اور کتابوں میں پڑھ چکا ہوں لیکن الماس ایم اے کے قلم کی بات ہی دوسری ہے۔ واقعات سلطان کی وفات کے بعد کافی آگے بڑھ چکے ہیں۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ اسرار احمد کی واپسی مختصر مگر کاٹ دار تحریر ثابت ہوئی۔ ملاقات بھی اچھی کہانی ہے۔ دعا فاطمہ ایک ہندی کہانی کا ترجمہ لے کر آئیں۔ اچھی اور ایک خوب صورت کہانی ہے۔ جن میں ایک عام شکل و صورت کی حامل عورت کی فطرت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ احساس محرومی اور احساس کمتری ایسی ہی کہانیوں کو جنم دیتا ہے۔ تہنی ارشاد بہن! تمہاری تحریر کردہ کہانی ''حقیقی مسرت'' کی جتنی تعریف کی جائے اتنی کم ہے۔ تم نے لفظوں سے

کہانی میں جان ڈال دی ہے۔ حالانکہ اس موضوع پر میں پہلے بھی کئی کہانیاں پڑھ چکا ہوں لیکن تمہارے اندازِ تحریر نے اس کہانی کو امر کر دیا ہے۔ قرآن و سنت کا حوالہ دے کر تم نے اس کہانی کو مزید نکھارا اور خوب صورت بنا دیا ہے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ جاتے جاتے کچھ باقی سلسلوں کے متعلق اظہارِ خیال کرتا چلوں۔ بزم سخن میں محمد سلیم پھلواری' علی ممتاز کے اشعار زیادہ پسند آئے۔ خوش بو سخن میں شہناز بانو کا ''لو ایک سال اور بیت گیا'' نمبر لے گیا۔ باقی غزلیں بھی اچھی ہیں۔ آخر میں ایک شکایت ہے کہ مجھے کئی ماہ سے بزم میں نظر انداز کیا جا رہا ہے' والسّلام۔

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب السّلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں' شدید سردی میں پیدل شہر پہنچا وہاں بک اسٹال ہے۔ ماہ جنوری سالِ نو کا تازہ پرچہ ''نئے افق'' دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ سرورق اپنی مثال آپ تھا ایسا خوب صورت پرچہ نکالنے پر میری طرف سے دلی مبارک باد ہو۔ پرچہ قارئین میں بہت مقبول ہے ہی ایک معیاری پرچہ ہے جو کہ وقت پر ہمیں مل جاتا ہے۔ آپ جس خلوص اور محبت سے ہماری رہنمائی کرتے ہیں اس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ غزل اور طویل خط گفتگو میں شائع کرنے پر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آئندہ بھی آپ میرے ساتھ تعاون کریں گے۔ ابتدائیہ ''گفتگو' اقراء' دستک'' اچھے سلسلے ہیں۔ سچی کہانیاں ''عشق نامراد' کردار' مکافات' ملاقات'' اچھی تحریریں تھیں۔ مترجم کہانیاں ''واپسی' سراب' چکر' جس سے میں بے حد متاثر ہوا۔ مستقل سلسلے وار تحریریں ''بیت المقدس' گردش' بازی گر' خطروں کے کھلاڑی'' بہت خوب صورت تحریریں تھیں۔ تمام لکھاریوں کو میری طرف سے آداب ہو۔ دیگر تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر اچھے تھے۔ ہمارے دل میں ہمیشہ آپ کے لیے نیک جذبات رہیں گے۔ چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں کسی قریبی شمارے میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں بشرطیکہ آپ کا تعاون ہمارے ساتھ رہے۔ میری طرف سے تمام اسٹاف اور قارئین کی خدمت میں نیا سال مبارک ہو اور اچھے دن دیکھنے نصیب ہوں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے' صحت دے۔ تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی زندگی میں سدا خوشیوں کا راج رہے آپ کے گلشن میں رنگ برنگے پھول ہمیشہ کھلتے رہیں۔ جب تک پرچہ پڑھ کے آپ کو خط تحریر نہ کر لوں' دل کو سکون نہیں ملتا۔ پرچے پہ تبصرہ لکھنا بھی بہت مشکل فن ہے۔ کوئی قابلِ ذکر بات نہیں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہو گی' اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ' نیک تمناؤں کے ساتھ' والسّلام!

عبدالحکیم ساجد...... منچن آباد۔ السّلام علیکم جناب عزیز من عمران احمد قریشی اور محترم و مکرم حاجی مشتاق احمد قریشی! اور امید ہے کہ آپ اور آپ کا تمام اسٹاف بخیریت ہو گا۔ میری طرف سے تمام اہل گفتگو اور قارئین کو سالِ نو کی مبارک باد۔ خداوند کریم ہمارے وطن کا ہمیشہ بول بالا فرمائے' آمین۔ نئے سال ماہ جنوری کا دلچسپ شمارہ ایک منفرد اور جاذب ٹائٹل کے ساتھ بروقت ملا اور تمام جریدے کو ایک الگ طریقے سے سجے ہوئے پایا تو دل خوش ہو گیا۔ فہرست کو الگ الگ گروپس میں بانٹ کر دکھایا گیا تھا' بہت اچھا لگا۔ ''دستک'' میں حاجی صاحب نے میڈیا کی کارروائیوں پر روشنی ڈالی تھی اور سیاستدانوں کے ہتھکنڈوں کے بارے میں بتایا تھا' واقعی ہمارے وطنِ عزیز میں ایک نیا تماشا ہی کھڑا ہوتا ہے۔ ''گفتگو'' میں ابتدائیہ میں عمران صاحب نے ''گانے کی کراہت'' کے بارے میں حدیث کا مفہوم پیش کیا تھا جو آج کے دور کی عکاسی کر رہا تھا۔ عمران صاحب نے ہمیں وطنِ عزیز کے دشمن عناصر سے آگاہی دی' جس سے ہمیں سبق سیکھنا چاہیے۔ صدارتی سیٹ پر عبدالمالک کیف براجمان تھے' بھئی خوب! آپ نے تمام دوستوں کا حال احوال پوچھ کر دلکش جواب دے کر اچھا تبصرہ کیا۔ یاد آوری کا شکریہ! کامران شاہ کامی' محمد اسحاق انجم نے اچھے اشعار کے ساتھ مختصر تبصرے کیے۔ عصمت اقبال عین جی پچھلی دفعہ تو آپ نے بہت دلچسپ اور زبردست تبصرہ کیا اس دفعہ مختصر کیوں؟ آپ کی غزل عمدہ تھی' ہمیشہ زورِ قلم کو آزماتی رہیں۔ ناز سلوش ذشے جی! یاد رکھنے کا شکریہ اور ویسے بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے' آپ کا نامہ بھی جامع تھا۔ محترمہ بڑی آپا شہناز بانو جی! آپ کی دعاؤں سے بہت اچھے مزاج ہیں۔ نامے کی پسندیدگی کا شکریہ اور اصل میں منچن آباد والے سمجھتے ہیں کہ انہیں اچھا پروٹوکول نہیں دیا جاتا۔ ہماری بات الگ ہے کہ اسٹڈی کی وجہ سے حاضر نہیں ہو پاتا اس کے لیے معذرت۔ مجاہد بھائی! اس دفعہ تو آپ خوش ہو جائیں کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شکایت پر عمل درآمد ہوگیا ہے اور آپ کے نام کے آگے سنجر پور لکھ دیا گیا ہے' یاد کرنے کے لیے شکریہ۔ عالیہ انعام الٰہی کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت اور جان دار تھا۔ انہوں نے حالات کی تلخیوں کا چٹخارے الفاظ کی صورت میں خوب طریقے سے نکالا۔ مبارک باد قبول کریں۔ محمد ارشاد قریشی! آپ کا شعر اچھا لگا۔ اگلی نشست پر ہمارے بزرگوار فقیر بخش صابر لنگاہ جی براجمان تھے۔ آپ نے میرے بارے میں جو الفاظ استعمال کیے وہ تو آپ کی نوازش ہے ورنہ ہم تو اس کے اہل نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ اور شفاء عطا فرمائے۔ میرے تمام بھائیوں کو سلام! ریاض حسین قمر جی! آپ کو آپ کے بیٹے کی شادی مبارک ہو' قبول کیجیے یاد آوری کا شکریہ۔ اب آگے تشریف رکھتے ہیں نئے افق کے ہر دل عزیز اور جانے مانے جناب سید عبداللہ شاہد جی! آپ کا لمبا تڑنگا اور جامع بھرپور تبصرہ پڑھ کر دل سرشار ہوگیا۔ کیا بات ہے جی آپ کے محبت نامے کی۔ آپ نے ہر کہانی پر علیحدہ تبصرہ کر کے محفل کو لوٹ لیا۔ آپ نے میری نظم کی تعریف کے لیے جو گوہر نایاب جیسے الفاظ استعمال کیے اس کے لیے شکریہ! ہمیں آپ کی آئندہ کہانیوں ''کمپنی' ترازو'' کا انتظار رہے گا۔ طاہرہ جبیں تارا جی! لاہور شہر سے رقم طراز تھیں اور اپنی مصروفیت اور ڈاک کی نااہلی کا رونا رو رہی تھیں۔ آپ کی سچی کہانی ''تہی داماں'' کا بھی انتظار رہے گا۔ ''اقراء'' میں طاہر بھائی نے خیانت پر تشریح سے تبصرہ کیا اور ہمیں اس خباثت سے دور رہنے کی تلقین فرمائی اور دعا ہے کہ ہم اس پر عمل پیرا ہوں' آمین۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے میں بات کروں گا سلسلے وار کی۔ اس میں ہر رنگ کی کہانی پڑھنے کو ملی۔ ''بیت المقدس'' میں تاریخ کے بہت سے دریچے ہم پر وا ہوئے' اچھی رہی خوب۔ آگے ''بازی گر'' میں مصنف نے محبت کے کچھ لمحات کا ذکر کیا اور دو کرداروں' خوش دلی اور اسد کے کارناموں کو تجسس اور ایکشن کے انداز میں تحریر کیا۔ فرحانہ کو اغواء کس نے کیا اور کیوں کیا؟ یہ تو اگلے ماہ ہی پتا چلے گا۔ ''گردش'' بھی اچھے موڑ پر جا رہی ہے۔ خوشی ہوئی کہ ایک بار پھر شہناز بانو کے قلم سے تحریری ناول پڑھنے کو ملے گا۔ اس دفعہ شاہ زمان بھی نئے نام کے ساتھ اور نئی شخصیت کے ساتھ سامنے آیا ہے' انتظار رہے گا۔ ''خطروں کے کھلاڑی'' کی تو بات ہی کیا ہے۔ وہ بھی کیا زمانے تھے کہ 100 روپے بھی بہت ہوتے تھے۔ آپ کا سفر نامہ دل کو خوش کر گیا' بہت خوب۔ ''زر گزیدہ'' ریاض بٹ کی تحریر قبل پر مبنی تھی اور ایک تلخ حقیقت پر مشتمل تھی۔ ''مکافات'' اور ''کردار'' بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ باقی تحریریں ابھی زیر مطالعہ ہیں اس کے لیے معذرت۔ اندرونی صفحات میں سید عبداللہ شاہد اور سہیل عمران ساحل کی غزل پڑھی' اچھی لگی۔ ''بزم سخن'' میں اشعار کا انتخاب بہت خوب تھا۔ ''خوش بوئے سخن'' میں سیما بنت عاصم نے اچھا انتخاب کیا۔ غزلیات میں میثم علی آغا' سمیع جمال' اسلم جاوید' مجاہد ناز عباسی' وسیم اختر' حسین خان بلوچ' ایمن جی اور عرفان حیدر اچھے رہے۔ نظموں میں شہناز بانو' عبدالرحمن ساغر' عبدالمالک کیف اور ریحانہ سعید ٹاپ پر رہے۔ ''ذوق آگہی'' کا انتخاب ایک سے بڑھ کر ایک تھا' عمران جی میری نظم کی اشاعت کے لیے شکریہ۔ جو دوست محفل میں شامل نہ تھے ان کو سلام۔

سید عبد اللہ شاہد..... حیدر آباد السلام علیکم! خدائے برحق سے امید واثق ہے کہ خیریت سے ہوں گے اور اپنی تمام وحدتوں' چاہتوں اور وسعتوں سے میرے محبوب رسالے ''نئے افق'' کی ترقی و سربلندی کے لیے برسرِ پیکار ہوں گے۔ اچھی زندگی کے اسباب کی تگ و دو میں یہ سال رواں بھی گزر گیا۔ اس دوران جو کاوشیں صفحۂ قرطاس پر بکھیریں' وہ نئے افق کے صفحات کی نا صرف زینت بنیں بلکہ ان تحریروں کو قارئین کے حلقے میں پزیرائی بھی حاصل ہوئی۔ مجھے یاد ہے سرور شاز صاحب نے کہانی نویسی کے حوالے سے گزشتہ دو برس پہلے طنزیہ جملے مجھ پر چست کیے تھے اور اپنے خط میں لکھا تھا کہ عبداللہ شاہد کو میری تحریروں پر تنقید تو کرنا آتا ہے اور وہ مجھے غیر معتبر کہتے ہیں لیکن وہ خود کہانی لکھ کر دکھائیں تو انہیں پتا چلے کہ کہانی لکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان دو سالوں میں یکے بہ دیگرے میری کئی کہانیاں ''نئے افق'' میں شائع ہوئیں اور پسند کی گئیں۔ بات یہ ہے کہ (شاذ بھی سمجھ لیں) علم و ادب سے بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔ بچوں کے لیے لکھتا رہا تھا' اس لیے جب چیلنج ہوا تو الله کا نام لے کر بڑوں کے ادب کے لیے طبع آزمائی کی اور اب تک یہ سفر کامیابی سے جاری ہے۔ نئے افق سے وابستگی کا یہ حاصل ہے کہ جو پڑھا اور جس شوق و ذوق سے لکھا یہ ساری ہنر مندی میرے ہر دل عزیز رسالے نئے افق کی رہین منت ہے۔ اس سال یعنی 2011 میں بھی سیکھنے سمجھنے اور لکھنے کا سلسلہ چلتا رہا۔ 2012ء میں کچھ نئے آئیڈیاز پر طبع آزمائی کا سوچا ہے۔ خدا کرے کہ

میں اپنے ارادوں میں کامیاب رہوں۔ نئے سال کی آمد پر مجلس ادارت میں شامل محترم اقبال بھٹی' جناب طاہر احمد قریشی صاحب' سیما بنت عاصم صاحبہ' برادر عفان احمد صاحب اور اسرار احمد صاحب اور دیگر احباب و رفقا کو سالِ نو کی ڈھیروں مبارک باد اور آپ سب کی خدمت میں نیک خواہشات' دلی تمنائیں اور پُر خلوص جذبات کے تحفے' قبول کیجیے گا۔ نئے سال کا پہلا شمارہ بروقت مل گیا تھا لیکن کیا تبدیلی موسم کے سرورق سے پر اثرات مرتب ہوئے ہیں کہ پری پیکر و دلکش حسینہ نیلگوں تاریکیوں سے جھانکتی اور مختلف تشبیہات کے اسرار و رموز سے آشکار ہوتی محسوس ہوئی۔ خلاف توقع یہ ایک مہیب پُر اسرار اور خوف ناک سرورق تھا۔ جسے دیکھ کر ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر سرایت کرتی محسوس ہوئی اور یخ بستگی دو چند ہوگئی تھی۔ شاید اس دفعہ آپ نے محترمہ عالیہ انعام الٰہی کی حسبِ تلاش و جستجو کسی گلیمر گرل کے بجائے پُر اسرار ٹائٹل دیا۔ امید ہے کہ عالیہ جی اپنی بات منوانے پر بے حد خوش ہوں گی۔ کیا بات ہے ہمارے عمران بھائی کی کہ سب کو نبھاتے ہیں۔ اس مرتبہ سال کی شروعات خوش گوار تبدیلیوں کی صورت میں جدت اور انفرادیت کا احساس دلا رہی ہے۔ اداراتی صفحہ اور فہرست کے عنوان اپنی درجہ بندی کے لحاظ سے سادہ اور پر کار انداز میں سج رہے تھے' ترتیب و تزئین بھی خوب صورت اور جاذبِ لگ رہی تھی۔ اللہ عزوجل سے دعا گو ہوں کہ یہ تبدیلیاں نئے افق کے لیے خوش آئند ثابت ہوں' آمین ثم آمین۔ چند تجاویز میرے دماغ میں کلبلا رہی ہیں لیکن ذرا توقف سے اگلی سطور میں عرض کروں گا۔ اس سے پہلے مغربی کہانیوں پر بات ہو جائے۔ ''ملاقات (راحیلہ تاج)'' باقی دونوں تراجم سے زیادہ اچھی اور دلنشین تحریر ثابت ہوئی۔ میری اور جم کے حادثاتی عشق کی حسین توضیح فرم کے ڈرائیور ہیری کے ایکسیڈنٹ سے بامحاورہ ''نگاہوں کے تصادم کے'' خوب انداز میں ہوئی۔ خط و کتابت اور ٹیلی فونک بات چیت تو محض آدھی ملاقات ہوتی ہے اپنے محبوب سے بنفسِ نفیس ملنا ہی وصال یار کی سچی خوشیوں کا صائب ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ اقبال بھٹی صاحب اس دفعہ ''چکر'' کے عنوان سے ایک پُر لطف اسٹوری لے کر آئے۔ بن کر اینٹن کی سادہ لوحی پر افسوس ہوا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ خدا جب چھپر پھاڑ کر دے اور خوش قسمتی سے اس کا کوئی گواہ بھی نہ ہو تو ڈرنے کی بجائے اسے دونوں ہاتھوں سے سمیٹنا چاہیے۔ اس مرتبہ اسرار احمد کی کہانی ''واپسی'' مابعد الطبعیات کے موضوع پر عمدہ تحریر لگی۔ رابرٹ ڈنکن نے اسٹوری کے تانے بانے یوں دلچسپ پیرائے میں بیان کیے کہ خوف و تجسس سے پڑھتا چلا گیا' محسوس ہوا کہ رابرٹ میرے سامنے اپنی سرگزشت بیان کر رہے ہیں۔ اختتامی لائنوں کو پڑھتے ہوئے قرب و جوار میں آسیبی سردی سے رگ و پے میں خوف و سنسنی پھیل گئی تھی۔ گھر کی جانب واپس پلٹ کر پہنچنے والا کوئی خاکی انسان نہیں تھا بلکہ محض اس کی روح تھی۔ محترم بزرگوار بابا مشتاق قریشی کی پر مغز و دستک میں اس مرتبہ پاکستان کے مستقبل کے لیے گہرا فکر و تدبر دل پر کچوکے لگا تا رہا۔ آپ نے بجا فرمایا کہ آج کی سیاست میں وہ خود غرضی اور بے غیرتی لازم و ملزوم ہوگئی ہے کہ محض ذاتی مفاد کی حرص و ہوس میں سگے رشتوں کا ایثار اور جذبۂ پاسداری بھی مفقود ہو گئے ہیں۔ ارض پاک کی ملی حمیت و آبرو کا احساس تو دور کی بات ہے۔ عمران خان کا کامیاب کرکٹ کیریئر میرے پاکستان کی وحدتوں سے جدا نہیں ہے۔ وہ اپنی سنجیدہ قیادت سے پاکستانی عوام کو امریکی اور اس کی اتحادی طاقتوں کے دباؤ سے باہر نکال کر انہیں خود داری کے راستوں پر چلا سکتے ہیں لیکن اس سے پہلے خان صاحب کو امریکہ بہادر کو قومی مفاد کے حوالے سے خود مختاری کے احساس کو باور کرانا ہوگا۔ کاش ہم سائنس و ٹیکنالوجی اور جدید ٹریڈنگ موڈ کے دعویدار امریکیوں سے مکمل طور پر اپنی مذہبی غیرت اور سودی معیشت کو نجات دلا سکتے۔ اے کاش ہماری دوسری نہیں تیسری نسل میں یہ حق غیرت سرخرو ہو جائے۔ اس بار ''اقراء'' کے ایمان افروز صفحات پر میرے مربی طاہر قریشی صاحب ''خیانت کی خفی قسمیں'' کے موضوع پر درس و تدریس دے رہے تھے اور سہل اور عام فہم لفظوں میں یوں تشریح فرما رہے تھے جیسے دیگ کا ایک ایک چاول نکھر اتھرا ہو کر آئینہ بن گیا تھا اور دل و ذہن یقین کے جذبوں سے سرشار ہو گیا تھا۔ اللہ عزوجل طاہر قریشی صاحب کو سلامت رکھے اور انہیں جزائے خیر عطا فرمائے' آمین ثم آمین۔ ابتدائی صفحات کا معرکتہ الآرا ناول ''بیت المقدس'' کی تازہ قسط کا مطالعہ کیا۔ ارض مقدس کے شہر یروشلم اور ہیکل سلیمانی کی ۲۰۰۰ ق م کے تاریخی پس منظر کو دلچسپ اور سہل پیرائے میں بیان کیا گیا تھا۔ یہ نہایت عمیق نگاہ کا کمال تھا کہ صدیوں پر محیط اسلامی اوراق کو تحقیق و تدبر کے ساتھ جمع کر کے مختصر اور جامع اندازِ تحریر میں پیش کیا گیا۔ نئے افق کے ایڈیٹرز اور پروف ریڈرز کو میری جانب سے پُر خلوص مبارک باد۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کی محنت اور مشاقی طبع قابل تعریف ہے۔ ''بیت المقدس'' کے اختتامی صفحات پر اپنی غزل دیکھ کر خوشی کے مارے چیخ نکل گئی۔ دیٹس سرپرائز عمران بھائی! ''ہم بھول گئے ہر بات'' کے مصداق میں تو اپنی غزلوں کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اس پر مچل کر دوبارہ سے شاعری میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔ میری کچی پکی انگریزی سے اس لیے گزارا کر لیجیے گا۔ اب خطوط کی محفل میں پُرخلوص دوست واحباب سے خیریت شیریت ہو جائے۔ سب سے پہلے زید بن ارقم سے روایت کی گئی حدیث اور تمہید سے مستفید ہوا۔ صادق آباد کے عبدالمالک کیف کو آپ نے مسندِ اول سے سرفراز کیا۔ میری جانب سے مالک صاحب کو کرسی صدارت کی مبارک باد۔ آپ نے رسالے پر پہلی بار بھرپور تبصرہ کیا اور اپنی صلاحیتوں کو منوالیا۔ ڈیئر کیف! تم نے میری عدم موجودگی کو محسوس کیا اور یاد کیا، بہت خوشی ہوئی۔ احمد علی کیف شاید اس لیے بھگوڑے ہوئے کہ ایک پنجرے میں دو شیر کیسے رہ سکتے ہیں۔ کیا بھول گئے کہ یہ محترم بھی تمہاری طرح (فلمی کترینہ کے) کیف سمجھے جاتے ہیں۔ (ویسے مذاق کی بات ہے، کترینہ کو ہم پاکستانیوں سے نہیں بلکہ اپنے لمبے اور اونچے قد وقامت سے عشق ہے)۔ کیا خیال ہے؟ کامران شاہ کامی اور محمد اسحاق انجم اپنا تعارف کراتے ہوئے خود کو شرکائے گفتگو سے گزشتہ سے پیوستہ کے مصداق باور کرا رہے تھے۔ ان کی واپسی خوش آئندہ ہے۔ کامی شاہ تو بہت خوب صورت کہانیاں اور افسانے لکھتے رہے ہیں۔ موصوف اب مجھ سمیت تمام دوست اور قارئین بھی تمہاری سچی کہانیوں کے شدت سے منتظر رہیں گے اور انجم صاحب آپ شاعری میں ایک حسن ورنگین صنف ''دکنگن'' پر طبع آزمائی فرمایئے گا۔ محفل سے آپ کے بے وقت کے ناغے گراں گزرتے ہیں۔ خوبی تعلقات اور سلسلۂ رفاقت کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں انہیں نبھانا چاہیے۔ امید ہے میری بات کا بُرا نہیں منائیں گے۔ عصمت اقبال عین مختصر نامے سے شریک ہوئیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے عصمت جی! میں تو آپ کے بھرپور تبصرے سے متاثر ہوں اور آپ کی شاعری کا بھی دلدادہ ہوں۔ پلیز آئندہ مفصل تبصرے کے ساتھ شامل ہویئے گا۔ محمد اسلم جاوید گفتگو کے دیرینہ ساتھی ہیں۔ انہوں نے نئے افق سے وابستگی پر جن پرخلوص لفظوں سے اظہارِ خیال کیا اسے پڑھ کر دل محبت ومروت سے گداز ہو گیا۔ گزشتہ سال یعنی 2011ء آپ نے تفکر آمیز جذبات سے کامیابیوں اور ناکامیوں پر تاسف کا اظہار کیا۔ بات یہ ہے کہ اجتماعی تبدیلی اور بہتری کے لیے ہمیں سب سے پہلے انفرادی اور ذاتی سنجیدگی سے ملک وملت کی بھلائی کے لیے سوچنا ہوگا۔ تب جا کر ہم من حیث القوم وقت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لائق ہو سکتے ہیں۔ محفل میں اگلی نشست پر شہناز بانو متمکن نظر آ رہی ہیں، میں ان ہی سے مخاطب ہوں اور باور کرا رہا ہوں کہ دیکھیے شہناز صاحبہ ''کالی عورت'' پر ذشے صاحبہ رائے زنی کرتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ سید عبداللہ شاہد کی یہ تحریر بہت مزے کی اسٹوری تھی۔ یہ کیا شہناز جی ستائشی انداز میں مسکرا رہی ہیں۔ آپ دونوں کی خاطر طبع اور حوصلہ افزائی سے خوب سے خوب تر کے مصداق اچھا لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ ناز سلوش ذشے کا خط رجسٹری کا مشورہ پکا پکا اچھا ہے لیکن اس سے محکمہ ڈاک کے افسران کی گردن میں بانس چڑھ جائے گا۔ نازش! ہم لوگ اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مار لیتے ہیں اور پھر بدعنوان افسران کا رونا روتے ہیں۔ حکومت کی مقرر کی گئی عام سہولتیں کیا ملائک وارواح کے لیے ہوتی ہیں؟ جہاں مہنگائی ہوشربا ہو اور اشیائے ضروریات آدمی کی دسترس سے باہر ہوں، وہاں خط وقومی مواصلات کے لیے عام ڈاک کی سہولت سے بحق شہری فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ایک دو صفحے کے خط کو محض اس ڈر سے رجسٹری کروانا کہ خط کھو نہ جائے، اجتماعی ظلم کی بات ہے۔ ذشے! اس اختلاف سے ناراض مت ہویئے گا۔ اپنے پروجیکٹ کے بارے میں کچھ تفصیل سے روشنی ڈالیے۔ ممکن ہے اس حوالے سے کچھ اپنے طور پر کر سکوں۔ ہماری مصنفہ شہناز بانو صاحبہ کا مدبرانہ تبصرہ گفتگو کی شان میں اضافہ کر رہا تھا۔ شہناز جی! آپ کی مکمل کہانیاں میرے ذوق وشوق میں تحریک پیدا کرتی ہیں۔ آپ نے ''گردش'' لکھنے کی ذمہ داری کیوں قبول کر لی؟ اب طویل انتظار ہوگا ''گردش'' ختم ہوگی تب جا کر مکمل کہانیاں پڑھنے کو دستیاب ہوں گی۔ بہرکیف آپ کی تحریر کردہ ''گردش'' کی پانچویں قسط لاجواب ہے۔ مجاہد ناز عباسی ٹائٹل کی حسینہ پر فریفتگی کے جذبات پرمزاح اور دلچسپ ہیں لیکن عباسی میاں کو جذبہ سرشاری میں یاد رکھنا چاہیے کہ بند مٹھی کھل جائے تو خاک ہو جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ زبان کی شرانگیزی سے بڑھ کر کوئی اور فتنہ نہیں ہے۔ محترمہ عالیہ انعام الٰہی کا تبصرہ اس مرتبہ خلافِ توقع اچھا اور مصالحانہ رویئے کا حامل رہا۔ میں مانتا ہوں کہ آپ فکری زاویوں کو اپنی رائے زنی سے اجاگر کرتی ہیں لیکن تاریخ کو بڑا بے رحم کہتے ہوئے

آپ زیادتی کر جاتی ہیں۔ علم وادب کا بیش بہا خزانہ اسلاف ہمیں دے گئے ہیں، اس میں بے شمار ایسے ابواب بھی موجود ہیں جو نقد ونظر کے لحاظ سے سرمایۂ افتخار ہیں۔ یہ تاریخی ابواب سنہرے لفظوں سے عبارت سمجھے جاتے رہے۔ آپ اس تاریخ کے لیے سنہرے لفظوں سے کیوں گریز کرتی ہیں اور اسے اسلاف واکابرین کا احسان کیوں نہیں گردانتیں؟ ممکن ہو تو جواب دیجیے گا۔ محمد ارشاد قریشی آپ کی صحت یابی کے لیے خدائے بزرگ وبرتر سے دعا گو ہوں۔ آپ نے یاد کیا احسان مند ہوں۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ کا بھرپور تبصرہ ان کی استطاعت سے بڑھ کر تھا۔ آپ کی ہمت کو داد دیتا ہوں۔ یاد آوری کا شکریہ۔ ریاض حسین قمر گوان کے فرزند صدیق کی شادی خانہ آبادی پر مبارک باد اور نیک تمنائیں پیش کرتا ہوں۔ قبول کیجیے قمر صاحب! طاہرہ جبیں تارا آخری نشست پر موجود اپنی مصروفیات کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ طاہرہ جی! آپ آتی آتی کہاں رہ جاتی ہیں؟ ریحانہ سعیدہ کو سلام کہیے گا۔ آپ کی کہانی بھی پڑھنے کو نہیں مل رہی کیوں...... ! اس کے علاوہ بہت سے دوست واحباب اس مرتبہ بھی اپنی کمی کا احساس دلا رہے ہیں۔ شہنی ارشاد قرآنی تعلیمات پر ایک عمدہ اور تاثر کن کہانی لے کر آئی ہیں۔ ''حقیقی مسرت'' ایک خوب صورت اور بے مثل اسٹوری ہے لیکن شہنی جی! خط کا اپنا مزہ اور اپنی اہمیت ہے۔ اپنائیت کے جذبوں سے دل سرشار ہو جاتا ہے۔ محترم ریاض بٹ بھی اس بھیڑ چال میں آ گئے ہیں اور تبصرے کے بجائے اسٹوری سے دل بہلا رہے ہیں۔ ان کی تحریر ''زرگزیدہ'' لاجواب تھی۔ اس سے پہلے ''عشق نامراد (عثمان خالق)'' نہلے پہ دہلا کے مصداق تحریر ثابت ہوئی۔ باقی سچی کہانیاں ''سراب (دعا فاطمہ)'' مکافات (زین نقوی) اور کردار (فاخرہ سلطانہ)'' بھی اچھوتے منفرد موضوع پر تھیں۔ سلسلے وار ناول میں ''بازی گر'' کی دوسری قسط میں فیصل اور نرگس کی کہانی سے دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ اسداللہ کی ''شاگردن'' اپنی محبت بھری شوخیوں سے کہانی کے منظرنامے میں کشش پیدا کر رہی ہے۔ یہ غیر سنجیدگی کہیں اسد کو مصیبت میں نہ ڈال دے۔ سفرنامہ ''خطروں کا کھلاڑی'' مطالعے کے نشے کو دو آتشہ کیے ہوئے ہے اور اپنی اہمت کا احساس دلا رہی ہے۔ دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا، والسلام۔

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم محترم عمران بھائی السلام علیکم! امید کرتی ہوں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آپ بالکل خیریت سے ہوں گے۔ دعا ہے کہ پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی مختلف رنگوں سے سجا نئے افق قریہ قریہ جگمگاتا رہے۔ بات کی جائے ٹائٹل کی تو ایک ہی رنگ کے مختلف شیڈز سے سجا اچھا لگ رہا تھا۔ ''دستک'' میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے ''ہوتا ہے شب وروز تماشا مرے آگے'' کے عنوان سے ملکی صورت حال کو بیان کیا۔ ایک نقاد کا کام ملکی حالات ومسائل کی نشاندہی کرنا ہوتی ہے کہ شاید اس سے حکمران کچھ سبق سیکھیں اور ملکی حالات میں کوئی بہتری پیدا ہو سکے۔ اقراء میں جناب طاہر احمد قریشی صاحب نے خیانت کی بعض خفی قسمیں بیان کیں۔ عام طور پر ایسی باتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے بظاہر تو لگتا ہے کہ یہ عام سی باتیں ہیں لیکن اکثر اوقات ان پر توجہ نہ دینے سے آپس کے تعلقات پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ کہانیوں کی بات کروں تو کہانیوں میں ''زرگزیدہ، سراب'' اور ''حقیقی مسرت'' اچھی لگیں۔ ''ذوق آ گہی'' میں عورت کے کردار پر لکھی گئی تحریر اچھی تھی۔ ''بزم سخن'' کا تقریباً سارا انتخاب اچھا تھا۔ ''خوش بُو سخن'' کی نظموں میں عبدالرحمٰن کی ''کاکامنا'' عبدالحکیم ساجد ''نیا سال'' اور عبدالمالک کیف کی ''ماں'' اچھی تھیں۔ غزلوں میں میثم علی آغا کی غزل اچھی تھی۔ ''گفتگو'' کے تمام احباب کو سلام۔ محمد ارشاد قریشی صاحب غزل پسند کرنے کا شکریہ اور عبدالمالک کیف صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ محترم محمد بخش لنگاہ صاحب امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ خدا آپ کو صحت وتندرستی عطا فرمائے اور آپ اسی طرح اس محفل کی رونق کو دوبالا کرتے رہیں۔ آپ کی حوصلہ افزائی سے مرا دل بڑا ہو گیا۔ باقی ہمیں تو آپ کی دعاؤں اور حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ پچھلے دنوں محترم ریاض حسین قمر صاحب کے بیٹے کی شادی تھی۔ ربّ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ شادی ان کے سب گھر والوں کے لیے خوشیوں اور راحتوں کا پیغام لائے۔ میرا تبصرہ اور غزل پسند کرنے اور حوصلہ افزائی کرنے پر میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔ یہ آپ کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کا نتیجہ ہے کہ میں اور اچھا لکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ سید عبداللہ شاہد صاحب تبصرہ اور غزل پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ آخر میں دعا ہے محترم مشتاق احمد قریشی صاحب، طاہر قریشی صاحب، عمران احمد صاحب، سیما بنت عاصم، عفان احمد صاحب اور ادارے کے تمام اراکین اسی طرح محنت ولگن سے نئے افق کو معیاری دلچسپ اور خوب صورت بناتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاوید اقبال ورک ...... سرگودھا جناب ایڈیٹر صاحب نئے افق کراچی۔ السلام علیکم! امید ہے کہ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا ماہنامہ کسی وقت بہت اچھا تھا اور بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا لیکن اب وہ بات نہیں رہی۔ اس کی بہتری کے لیے چند تجاویز دینا چاہتا ہوں۔ (۱) نئے افق کا جب آغاز کیا گیا تو اس میں ابنِ صفی کی عمران سیریز کا ناول ہر ماہ شائع ہوتا تھا جسے قارئین بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے لیکن اب عرصہ دراز سے یہ سلسلہ ختم کردیا گیا ہے۔ آپ ہر ماہ ابنِ صفی کا عمران سیریز مکمل ناول شائع کریں تاکہ قارئین ہر ماہ اسے پڑھ سکیں اور یقین کریں کہ صرف اس سے آپ کے رسالے کی سرکولیشن بہت بڑھ جائے گی۔ (۲) ہر ماہ پاکستان کے کسی مشہور مقام یا جگہ یا کسی سلسلہ کو منتخب کرکے اس کی تفصیل دیا کریں مثلاً ریلوے موٹروے تاریخی مقام ان کے بارے میں تفصیل سے معلومات دیں۔ (۳) کوئی ایک سلسلہ وار کہانی قارئین کے ذوق کے مطابق دیں۔ ان شاء اللہ آپ کے اس ماہنامے میں قارئین کی دلچسپی میں بہت اضافہ ہوگا۔ خاص کر ابنِ صفی کا ناول ہر ماہ اور وہ بھی مکمل دیا کریں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ ہمارے اس ماہنامے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔

فقیر محمد بخش لنگاہ همراہ حسنین و ثقلین صابر لنگاہ ...... خانیوال رقم طراز ہیں' عزیزی عمران احمد' بزرگوار قریشی صاحب خداوند کریم آپ سب کو اپنی نوازشوں اور رحمتوں میں جگہ دے' خوش رہو آمین۔ نئے سال 2012ء کا شمارہ جب ہاتھ میں آیا تو بڑی خوشی ہوئی۔ دعا کہ گروپ آف نئے افق اور پیارے مصنفین کو خداوند پاک اپنی امان میں رکھے تاکہ وہ تاریخی سلسلہ وار سچ بیانیوں' بزم سخن' خوشبوئے سخن اور ذوق آ گہی جیسے ادبی شاہکاروں کے موتیوں کی مالا سجا کر پیش کرتے رہیں۔ گفتگو کا آغاز عمران صاحب نے کیا' واہ واہ پر خطوط کے آغاز میں کرسی سنبھالنے کا شرف حاصل کیا محترم عبد المالک کیف صاحب نے صادق آباد سے' بہت خوب صورت انداز میں تبصرہ کیا۔ موتی پرو دیئے اپنی طرف سے دل خوش کردیا' سلام محبت دعا کا پیغام ہے' خوش رہو سیدھے راستہ پر چلانے والی خدا کی ذات ہے۔ برادر ہم تو آپ کو یہی کچھ بول سکتے ہیں سو بول دیا۔ دل سے دعا نکلی اور زبان پر آئی کہ سدا خوش رہو۔ صاحب زادی عصمت اقبال عین فقط آپ کی حاضری تھی پھر بھی دل خوش ہوگیا بھرپور گفتگو میں حصہ لو' خوش رہو۔ محترم محمد ارشاد قریشی صاحب بہت دیر کے بعد آپ کو ہماری یاد آئی۔ صاحب زادی عالیہ انعام الٰہی صاحبہ! خوش رہو' ہر ماہ آؤ محفل میں اور شاد وآباد رہو۔ بیٹی کو اگر کمی نظر آتی ہے تو فقیر نے جب بھی مانگی ہے دعا تو اس وقت عالیہ سامنے کھڑی نظر آتی ہے بھرپور تبصرہ لکھا آپ نے مگر بہت کم ارے سابقہ کی طرح دل کھول کر لکھا کرو۔ ریاض حسین قمر صاحب نے دل خوش کردیا اپنی مہربان تحریر اللہ پاک آپ کو اور لکھنے نظم غزل شعر اقتباس اور خطوط کے علاوہ سچ بیانیوں میں زور آزمائی کی توفیق دے۔ طاہرہ جبیں تارا صاحب' سلام ودعا جہاں مہنگائی اور لوڈشیڈنگ کا رونا تھا اور کہانی ''تہی داماں'' کی اشاعت کا سندیسہ تھا۔ وہیں امید پر دنیا قائم ہے۔ حیدرآباد کے منفرد سلجھے ہوئے لکھاری جنہوں نے ''گفتگو' بزم سخن' خوشبوئے سخن' ذوق آ گہی'' میں ماشاء اللہ اپنے قلم کے جوہر منوالیے ہیں اور خوب اچھے سے اچھا مواد ایکشن اور تیزی اور میلان کو برقرار رکھتے ہوئے پیش کررکھا ہے۔ وہ محترم نام ہے محترم سید عبداللہ شاہد صاحب کا۔ ہم سب کا دل سلام ودعائیں عرض ہیں۔ کشمیر جنت نظیر کی وادیوں سے جگمگاتا ہوں' بیانی تبصرہ لکھنے والی ہیں صاحب زادی ناز سلوش ذشے صاحبہ نے مختصر وقت میں صاحبزادی نے بہت اچھا اندازِ بیان نئے افق میں پیش کرکے مقام حاصل کیا' دعائیں۔ مجاہد ناز عباسی صاحب نے اپنے مختصر بیان میں دل خوش کردیا۔ کامران شاہ صاحب کا قطعہ پسند آیا اور گفتگو بہت کم مگر یادِ ماضی کروانے کا باعث رہی' سلام ودعا۔ محمد اسحاق انجم صاحب کا قطعہ سبق لیے ہوئے تھا اور دل سے پڑھا گیا۔ محمد اسلم جاوید صاحب ماشاء اللہ ہر ماہ کی طرح آپ کا اس ماہ بھی تبصرہ گفتگو خوب رہا' پسند آیا۔ صاحبزادی شہنی ارشاد صاحبہ! سدا مسکراؤ اور ماہنامہ نئے افق کی ہر بزم میں نظر آؤ۔ گفتگو کی محفل میں غیر حاضری آپ کی شدت سے محسوس کی گئی باقی ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ایک سبق آموز سچ بیانی رہی کہ بغض وانتقام سے بچیں 20 صفحات میں موتی پرو کر ہم سب کا دل خوش کردیا۔ عزیزی محترم بزرگ بھائی ریاض بٹ صاحب! دن دگنی رات چوگنی ترقی کرو۔ خیر تو ہے جناب گفتگو کی محفل میں غیر حاضر ہوئے بہت یاد آئے۔ نمک کی طرح جیسے نمک کے بغیر کوئی چیز لطف اندوز تیار نہیں ہوتی۔ ہر ماہ حاضر ہوا کریں' پر آگے جا کر 11 صفحات پر ''زرگزیدہ'' تفتیشی کہانی قلم آپ کا خالد صاحب کی زبانی جس کو آپ کافی

ماہ سے پیش کرتے آرہے ہیں۔ علیحدہ علیحدہ جرموں اور مجرموں کے سنگ اس کارکردگی نے دل خوش کردیا۔ بزرگ انکل وبھائی جناب ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب کے منفرد قلم نے گفتگو میں غیر حاضر ہوکر ہاتھ دعا کرنے کے لیے اٹھوا دیئے کہ اللہ خیر کرے' خیر ہو۔ ''بیت المقدس'' کی تیسری قسط جہاں دل سے پڑھی جانے والی محترم تحریر ہے وہیں پر پڑھتے پڑھتے آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔ حسام بٹ صاحب کی ''بازی گر'' پھولوں کی جگہ کانٹے جس کے مقدر میں ہوئے مگر اس نے حوصلہ نہ چھوڑا۔ تیزی اور میلان کی برقراری ''اسد تم جاگ رہے ہو۔ میرا نام بہادر علی ہے''۔ ''عشق نامراد'' عثمان خالق صاحب کے قلم سے لکھی گئی سچ بیانی جس میں حقیقت بھی ہے' جذبات بھی ہیں۔ ''خطروں کے کھلاڑی'' اے حمید صاحب جرم وایکشن' سیاسی رنگوں میں گندھی ہوئی تحریر تھی۔ باقی سلام ودعا کے بعد والسّلام۔

محمد عبد اللہ عاطر ...... منگلا کینٹ محترم جناب عمران قریشی صاحب' سلام مسنون! امید ہے مزاج گرامی اچھے ہوں گے۔ کراچی کے حالات میں کچھ تو بہتری آئی۔ اللہ کرے آئندہ بھی اچھی خبریں ملیں۔ کیسے حالات نے پلٹا کھایا ہے پہلے اموات کی خبر کبھی کبھی آتی تھی اب خیر کی خبر کبھی کبھی ...... ''گفتگو'' میں احباب نے خوب حصہ لیا اور بہت خوب لکھا۔ بہت سے دوستوں نے یاد کیا گفتگو میں ہماری عدم شمولیت کو محسوس کیا۔ ان کی یاد آوری کا شکریہ۔ جنہوں نے شاعری پسند کی ان کا بھی شکریہ۔ ''اقراء'' میں احادیث کا چناؤ جو ہماری معاشرتی برائیوں کے متعلق تھا۔ خوب تھا' ہم کو زندگی کیسی گزارنی چاہیے؟ ان احادیث سے ہمیں بہت اچھی راہنمائی ملتی ہے۔ زندگی سکون سے گزرے اور ثواب بھی ملے۔ ہم خرمہ وہم ثواب۔ ''خوشبوئے سخن'' کی تیاری' شاعری اچھی تھی۔ عصمت اقبال عین کی شاعری دن بدن نکھرتی جارہی ہے۔ ''ذوق آ گہی'' خوش بُو دار اور خوب صورت پھولوں سے سجا گل دستہ تھا۔ مجموعی طور پر ڈائجسٹ متاثر کن تھا' آئندہ ملاقات تک کے لیے اجازت' اللہ حافظ۔

قمر جہاں ...... لطیف آباد ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ اس سے پہلے میں نے تقریباً تین ماہ قبل اپنی ایک سچی کہانی بعنوان (کینہ پرور) معہ ایک تفصیلی خط کے ارسال کی تھی۔ مگر ہنوز نہ تو کہانی چھپی اور نہ ہی خط کا جواب ملا۔ (کہانی اسی شمارے میں شائع ہورہی ہے)۔ اس خط میں میں نے اپنے ساتھ گزرے حادثے کی تفصیل اور ساتھ ہی ان تمام قارئین بھائی' بہنوں اور بزرگوں کا شکریہ ادا کیا تھا جنہوں نے مجھ سے میری خیریت کے ساتھ تفصیل بھی دریافت کی تھی مگر اب میں دوبارہ یہ کہانی لکھ کر ارسال کررہی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک نئی غزل بھی بھیج رہی ہوں۔ امید ہے کہ نئے شمارے میں جگہ دے کر ممنون ہونے کا موقع دیں گے۔ میں دراصل 2 جنوری 2011 کی رات پونے بارہ بجے اپنے کمرے کی سیڑھیوں سے گری تھی' جس کے نتیجے میں میرے بائیں پاؤں میں فریکچر کی وجہ سے انگلیاں ٹوٹ گئیں اور پورا پنجہ اور تلوا بُری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا۔ جس کی وجہ سے میں چلنے پھرنے سے بالکل قاصر ہوں۔ وہیل چیئر پر صرف گھر میں چل پھر سکتی ہوں تا حال میرے پنجے کی اوپری ہڈیاں نہیں جڑیں نہ ہی ورم اتر رہا ہے جب کہ تقریباً گیارہ ماہ ہونے کو ہیں' تکلیف بھی ابھی خاصی ہے' اللہ سے دعا ہے کہ وہ میری تکلیف دور کردے۔ اب آتے ہیں اس ماہ کی اشاعت کے بارے میں! گفتگو پڑھ کر جذبہ' ایمانی اور پختہ ہوگیا۔ عید قرباں گزری ہے' جس میں ہم سب مسلمان سنتِ ابراہیمی کی پیروی کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں حسبِ توفیق اپنی اپنی قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ موجودہ شمارے میں دستک پڑھ کر ایک مرتبہ پھر ''ہر کمال کو زوال ہے'' کا قائل ہونا پڑا۔ واقعی وہ قومیں جو اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھتی ہیں یا وہ افراد یا حکومتیں جو خود کو فرعون سمجھ کر عوام کے جان ومال کی حفاظت کے بجائے ان کو اپنے پیروں تلے روندھنا یا رگیدنا شروع کردیتے ہیں وہ اسی طرح ذلیل وخوار ہوتے ہیں جس طرح دستک میں نقشہ کھینچا گیا ہے۔ خیر اب ذرا بات ہوجائے تحریروں کی۔ اس شمارے میں ''بیت المقدس'' کے بعد حسام بٹ کی ''بازی گر'' نے بہت متاثر کیا۔ ایک مرتبہ پھر میں اپنے تمام ساتھی مصنفین وقارئین کی تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں جو میری خیریت دریافت کرتے رہے' فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ خدائے بزرگ وبرتر آپ تمام کو' ادارے کو' جملہ اسٹاف اور اہل خانہ کو اپنی امان میں رکھے' آمین۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

ایفاء وعدہ اور وعدہ خلافی:۔

وعدہ کر کے پورا کرنا درحقیقت سچائی ہی کی ایک عملی قسم ہے اور وعدہ خلافی ایک طرح کا عملی جھوٹ ہے' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اخلاقی تعلیم میں وعدہ خلافی سے بچنے اور ہمیشہ وعدہ پورا کرنے کی بھی سخت تاکید فرمائی ہے۔

پہلے وہ حدیث گزر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اچھے اخلاق کا ذکر کر کے فرمایا' کہ:۔ جو شخص ان باتوں کی پابندی کی ذمہ داری لے' میں اس کے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں۔ اور ان میں آپ نے ایفاء وعدہ کو بھی گنایا۔

اور ''کتاب الایمان'' میں ''شعب الایمان'' کے حوالے سے حضرت انسؓ کی وہ حدیث گزر چکی ہے' جس میں فرمایا گیا ہے کہ:۔ جو شخص اپنے کیے عہد کا پابند نہیں اس کا دین میں کوئی حصہ نہیں...... اب چند حدیثیں اس سلسلہ کی یہاں اور بھی درج کی جاتی ہیں۔

(۲۱۳)

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں:۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے' وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے اور جب اس کو کسی چیز کا امین بنا دیا جائے تو خیانت کرے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ''کتاب الایمان'' میں بھی گزر چکی ہے اور وہاں پوری تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ ان باتوں کے منافق کی نشانی ہونے کا کیا مطلب ہے...... وہاں کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ جھوٹ' خیانت اور وعدہ خلافی دراصل یہ منافقوں کے اخلاق ہیں اور جس شخص میں یہ بری عادتیں موجود ہوں' وہ خواہ عقیدہ کا منافق نہ ہو لیکن عمل اور سیرت میں منافق ہی ہے۔

اسی حدیث کی صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں۔ ''ان صلی وصامہ وزعمہ انہ مسلمہ''، یعنی وہ آدمی اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور اپنے کو مسلمان بھی کہتا اور سمجھتا ہو' پھر بھی ان بداخلاقیوں کی وجہ سے وہ ایک قسم کا منافق ہی ہے۔

بہر حال اس حدیث میں وعدہ خلافی کو نفاق کی نشانی اور ایک منافقانہ خصلت بتلایا گیا ہے۔

(۲۱۴)

(ترجمہ) حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔ وعدہ بھی ایک طرح کا قرض ہے۔ (لہٰذا اس کو ادا کرنا چاہیئے۔)

(معجم اوسط للطبرانی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو کچھ دینے کا یا اس کے ساتھ کوئی سلوک کرنے کا یا اسی طرح کا کوئی اور وعدہ کیا گیا ہے تو وعدہ کرنے والے کو چاہئے کہ وہ اس کو اپنے پر قرض سمجھے اور اس کو پورا کرنے کی فکر کرے...... لیکن اگر بالفرض کسی برے کام میں ساتھ دینے کا' یا کسی اور ایسے کام کے کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے جو شرعاً صحیح نہیں ہے' یا اس سے کسی دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے تو اس وعدہ کا پورا کرنا ضروری نہ ہوگا' بلکہ اس کے خلاف ہی کرنا ضروری ہوگا' اور اس وعدہ خلافی میں کوئی گناہ نہ ہوگا۔ بلکہ اتباع شریعت کا ثواب ہوگا۔

(۲۱۵)

(ترجمہ) عبداللہ بن ابی الحمساء سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے (یعنی آپ کے نبی ہونے سے پہلے) آپ سے خرید و فروخت کا ایک معاملہ کیا (پھر جو کچھ مجھے دینا تھا اس کا کچھ حصہ تو میں نے وہیں دے دیا) اور کچھ ادا کرنا باقی رہ گیا تو میں نے آپ سے وعدہ کیا کہ میں اسی جگہ لے کر آتا ہوں پھر میں بھول گیا' اور تین دن کے بعد مجھے یاد آیا (میں اسی وقت لے کر پہنچا) تو دیکھا' کہ آپ اسی جگہ موجود ہیں آپ نے فرمایا کہ:۔ تم نے مجھے بڑی مشکل میں ڈالا اور بڑی زحمت دی' میں تمہارے انتظار میں تین دن سے یہیں ہوں۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) گویا نبی ہونے سے پہلے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وعدہ کی ایسی پابندی فرماتے تھے کہ تین دن تک ایک جگہ رہ کر ایک شخص کا انتظار فرماتے رہے...... واضح رہے کہ وعدہ کی اس حد تک پابندی کرنا شرعاً ضروری نہیں ہے (جیسا کہ اس کے بعد والی حدیث سے معلوم بھی ہو جائے گا) لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت میں جو ''خلق عظیم'' ودیعت فرمایا تھا' اس کا تقاضا یہی تھا۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

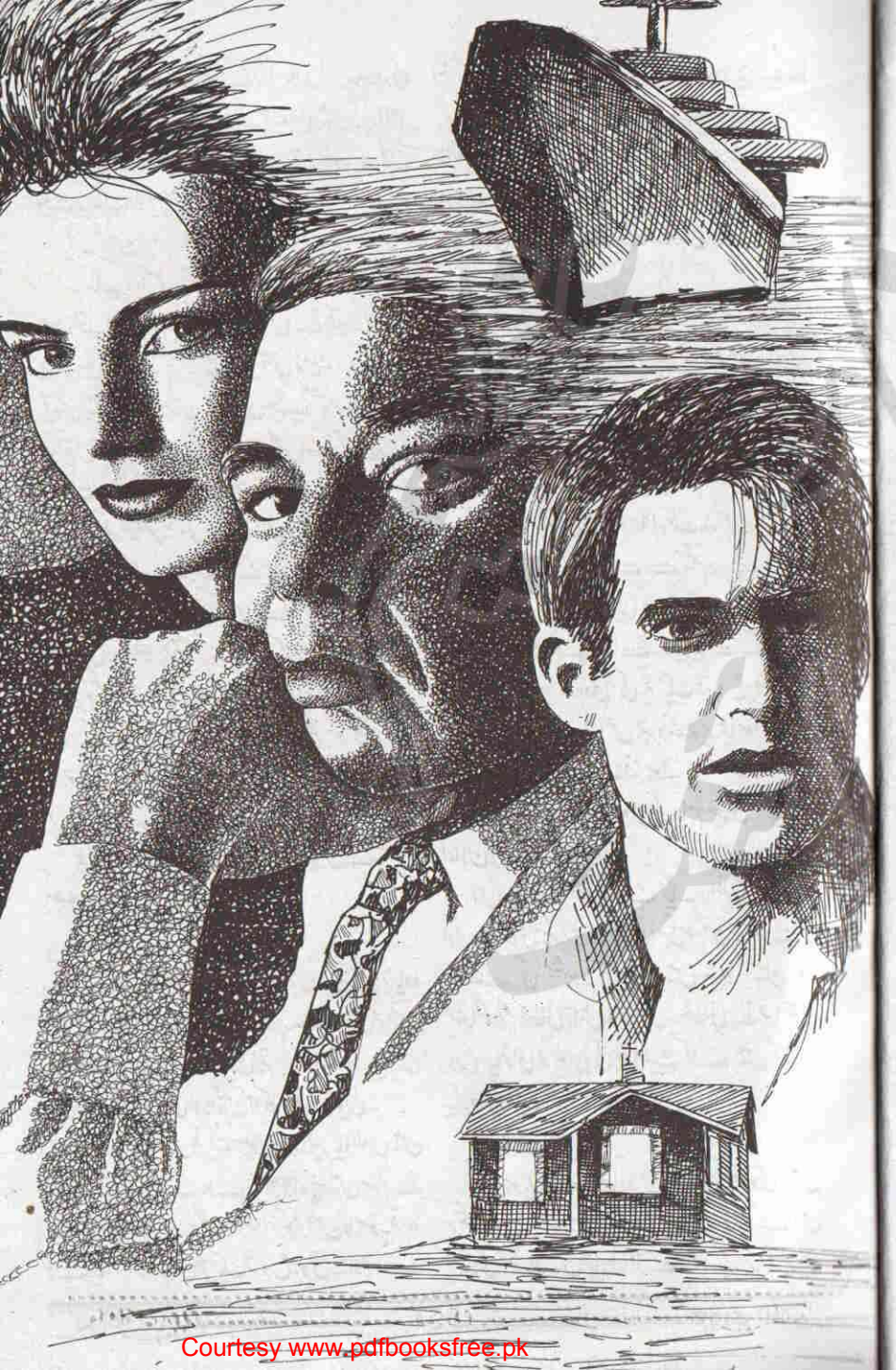

بیت المقدس

الماس ایم اے

بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول اور وہ شہر ہے جہاں سے مولائے کائنات پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش بریں کا سفر کیا۔ وہ شہر جو مسلمانوں کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بعد سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ شہر جو نصف صدی سے یہودیوں کے زیر تسلط ہے۔ جہاں کلمہ گو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا ہے۔ جہاں یہودیوں کے مظالم پر دنیا نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ وہ شہر جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے جہاں متعدد پیغمبروں اور صحابہ کرام کے مزارات واقع ہیں۔ یہ شہر آج بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور کسی صلاح الدین ایوبی کا منتظر ہے۔ یہ شہر کیسے فتح ہوا اور کس طرح اس کا سقوط ہوا آئیے اسے ممتاز مورخ اور ادیب الماس ایم اے کی نظر سے دیکھیے۔

تاریخ کے جھروکوں سے لہو کو گرماتی ایمانی جذبوں کو جھنجھوڑتی تحریر

نہر سویز کے متعلق مصر اور برطانیہ میں معاہدہ ہو گیا۔ جس میں برطانیہ نے ۱۹۵۷ء میں مصر سے اپنی فوجیں نکالنے کا معاہدہ کیا۔ اب ملک میں ایک مضبوط حکومت قائم تھی۔ ۱۹۶۷ء میں امریکہ اور برطانیہ کی شہ پر اسرائیل نے مصر پر حملہ کردیا۔ اردن کو بھی اسرائیل نے نشانہ بنایا۔ پھر اقوام متحدہ کی کوششوں سے جنگ بندی ہوگئی۔

مصر کی مشہور شخصیات میں بخور ڈرامہ نویس، مغنیہ ام کلثوم، ڈاکٹر طٰہٰ حسین مشہور عالم اسلام کے نام قبل ذکر ہیں۔

۴۔ سوڈان:

انیسویں صدی کے اختتام پر سوڈان میں انگریزوں اور مصریوں کی مشترکہ حکومت قائم ہوگئی۔ ۱۷ نومبر ۱۹۵۸ء تک سوڈان میں پارلیمانی نظام حکومت قائم رہا۔ مگر اُسی دن جنرل عبود کی قیادت میں فوجی انقلاب برپا ہوا۔ جنرل نے فوجی حکومت بنا لی جو آٹھ سال تک قائم رہی۔ پھر چھ سیاسی جماعتوں کی متحدہ کوششوں سے ایک انقلاب برپا ہوا۔ جس نے فوجی حکومت کا خاتمہ کردیا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں امہ پارٹی نے حکومت بنائی اور اسلامی شریعت کو قانون سازی کا اساسی مصدر قرار دیا۔

پھر ۱۹۶۹ء میں یہاں فوجی انقلاب آیا اور جملہ اختیارات انقلابی کونسل نے سنبھال لیے۔ سوڈان نے ۱۹۷۳ء میں تین جنوبی صوبوں کو علاقائی خود مختاری دے دی۔

۵۔ لیبیا:

طرابلس یا لیبیا، سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ اٹلی نے ۱۹۱۱ء میں اس پر قبضہ کرلیا۔ دوسری عالمگیر جنگ میں اتحادیوں نے یہ ملک فتح کرلیا اور اس کی قسمت کا فیصلہ اقوام متحدہ پر چھوڑ دیا گیا۔ ۱۹۵۱ء میں اس کے لیے ایک نظام مرتب ہوا جس کی رُو سے لیبیا کا نظام موروثی بادشاہت کے ساتھ وفاقی قرار پایا اور یہ ملک اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ آزادی کے وقت اس ملک میں دس لاکھ کی آبادی میں صرف چودہ گریجویٹ تھے۔ ۱۹۶۹ء میں کرنل قذافی بادشاہ ادریس کو تخت سے اتار کر خود برسر اقتدار آ گئے۔ انہوں نے برٹش پٹرولیم کمپنی کو قومی ملکیت قرار دیا۔ امریکہ اور برطانیہ کے فوجی اڈوں کا خاتمہ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا۔ بنک قومی ملکیت بن گئے۔ اسلامی تعلیمات کی نشر واشاعت شروع کی گئی اور ۱۹۷۳ء میں لیبیا اور تیونس کو ملا کر اسلامی عرب جمہوریہ قائم ہوگئی۔ اس وقت یہ ملک اقوام متحدہ کا ممبر ہے۔

۶۔ تیونس:

یہ ملک دراصل سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کا حصہ تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اس پر فرانس نے قبضہ کرلیا۔ یہاں کی تمام زرخیز زمینیں فرانسیسی زمینداروں نے آپس میں تقسیم کرلیں۔ دوسری جنگ عظیم میں محوری طاقتوں نے اسے فتح کرلیا۔ پھر جب محوریوں کو شکست ہوئی تو یہ فرانس کا حصہ بن گئی۔ فرانسیسیوں کو کمزور دیکھ کر امریکنوں اور برطانیہ والوں نے یہاں اپنے قدم جما لیے۔ جنگ کے بعد یہاں آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ فرانس نے تشدد کی پالیسی اختیار کی۔ آخر بڑی قربانیوں کے بعد ۱۹۵۷ء میں تیونس کو مکمل آزادی ملی اور اسی سال بادشاہت کا خاتمہ کر کے یہاں جمہوری حکومت قائم ہوگئی۔ پھر ۱۲ جولائی ۱۹۷۴ء کو لیبیا اور تیونس متحد ہو کر "اسلامی عرب جمہوریہ" بن گئے۔

عمار فرحت اور جلال بن عبداللہ تیونس کے مشہور مصور ہیں۔

۷۔ الجیریا:

اس ملک کو الجزائر بھی کہتے ہیں۔ یہاں زیادہ آبادی بربر قوم کی ہے۔ اس ملک پر ۱۸۲۷ء میں فرانس نے قبضہ کیا تھا۔ اس کی آبادی تقریباً ۶۵ لاکھ ہے جس میں دس لاکھ فرانسیسی اور پچپن لاکھ مسلمان ہیں۔

۵۷۔۱۹۵۶ میں فرانسیسیوں اور الجیریا والوں میں بڑے خونریز معرکے ہوئے۔ ۱۹۶۴ء نپولین سوم نے ایک شاہی اعلان کے تحت الجزائر کو فرانس کا صوبہ قرار دے دیا مگر آزادی کی تحریک شروع ہوگئی۔ ۱۹۶۴ء کے الیکشن میں الجزائر کو ایک آزاد ریاست کا درجہ دے دیا گیا۔ ۱۹۶۳ء میں احمد بن بیلا یہاں کے صدر ہوئے مگر ۱۹۶۵ء میں فوجی انقلاب آیا۔ بن بیلا کو گرفتار کرلیا گیا اور نائب صدر بومدین نے اقتدار سنبھال لیا۔ ان میں سے حواری "بومدین" ملک کے صدر بن گئے۔

۸۔ مراکش

۱۹۰۴ء میں یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ ایک حصہ فرانسیسیوں کے زیر اثر اور دوسرا حصہ اسپین والوں کے زیر اثر تھا۔

۱۹۱۲ء میں اس ملک کے تین حصے ہوئے۔

۱۔ جرمنی، ۲۔ برطانیہ، ۲۔ فرانس۔

فرانسیسی مراکش میں ۱۹۲۶ء تک مارشل لاء ڈیوٹی ریزیڈنٹ جنرل کی حیثیت سے مقیم رہے۔ انہوں نے گیارہ سو میل لمبی ریل کی پٹڑی، سڑکیں، بندر گاہیں اور ہوائی اڈے بنوائے۔ ریزیڈنٹ کے جانے کے بعد وہاں آزادی کی تحریک شروع ہوگئی۔ استقلال پارٹی بنی۔ فرانس جبر وتشدد پر تلا ہوا تھا۔ یکم مارچ ۱۹۷۲ء کو نیا آئین نافذ ہوا۔

۱۹۷۵ء میں ۲۱۱ مجرموں کو عام معافی دینے کا اعلان ہوا۔

اس وقت مراکش عرب لیگ، افریقی اتحاد کا ادارہ، اسلامی سیکرٹریٹ اور اقوام کی انجمن کا ممبر ہے۔

ملک کی مشہور شخصیتوں میں شاہ حسین اور عبدالکریم خطابی قابل ذکر ہیں۔ خطابی نے فرانسیسی اور ہسپانوی فوجوں کی مزاحمت کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

۹۔ نائیجیریا:

سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں پرتگیزیوں، انگریزوں اور دیگر یورپی اقوام نے اس اسلامی مملکت میں تجارتی اڈے قائم کیے مگر انیسویں صدی کے آخر میں برطانیہ نے اس ملک پر یونین جیک لہرایا اور مسلمانوں کی طاقت ختم کرنے کے بعد برطانیہ نے اس ملک میں اپنے انتظامی ادارے قائم کر دیئے۔ اور نائیجیریا کی وفاقی مملکت تین انتظامی حصوں میں تقسیم ہے۔

موجودہ وقت میں وفاقی جمہوریہ نائیجیریا کی ریاست میں تقریباً چھ کروڑ انسان آباد ہیں۔ ملک کی اس آبادی میں ۴۸ فیصد مسلمان ہیں۔ صدر مقام لاگوس ہے۔ اس وقت نائیجیریا دولت مشترکہ، افریقی یونین ساتھی قوموں کی انجمن کا ممبر ہے۔

۱۰۔ جبوتی:

۱۸۶۲ء میں فرانسیسیوں نے جبوتی کی سرزمین پر قدم رکھا۔ عصر قبیلہ کے سلطان احمد ابوبکر کو معزول کرنے کے بعد انہوں نے اوبوک کے علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح مشرقی افریقہ میں یہ پہلی فرانسیسی نو آبادی قائم ہوئی۔ وہاں فرانس نے جنوب مشرقی ایشیاء کی طرف بحری جہازوں کی روانگی کا مرکز بنایا۔ اٹلی اور برطانیہ کی سیاسی سرگرمیوں کے پیش نظر فرانس نے بہت جلد اوبوک کے علاوہ تاجورہ، علی صبیح اور دیگر بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کرلیا۔

اس ملک کا دارالخلافہ جبوتی ہے۔ یہاں سیاسی رہنما اپنی رہائش رکھتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں عوام جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جن کا معیار زندگی پست ہے۔ یہ لوگ جاہل اور مفلوک الحال ہیں ان میں اجتماعی زندگی بسر کرنے کے آثار نہیں پائے جاتے۔ ان کمیوں کے باوجود یہ لوگ کٹر روایتی مسلمان، سخی اور مہمان نواز ہیں۔ صحرائی علاقہ ہونے کی وجہ سے ان کی اقتصادی زندگی کا انحصار چراگاہوں پر ہے۔

جبوتی کے باشندے عیس اور عصر قبیلوں میں تقسیم ہیں۔ ان میں عیس ساٹھ فیصد اور عصر چالیس فیصد ہیں۔ ان میں قبائلی عصبیت زوروں پر ہے۔ دونوں قبیلے ملک کے الگ الگ حصوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ سال میں ایک ہفتہ جشن مناتے ہیں۔ ان دنوں میں یہ اعلیٰ قسم کا کھانا کھاتے اور پیتے ہیں۔ ان ایام میں ہر قسم کی کاروباری سرگرمیاں بند کر دی جاتی ہیں۔ ان میں کافی لوگ سرمایادار ہیں۔

پایہ تخت جبوتی میں کوکا کولا کی فیکٹری اور آئس فیکٹری کے مالکان ملک کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ سربراہ مملکت علی عارف کے خاندان والے بھی کافی مالدار ہیں۔

۱۱۔ صومالیہ:

اس ریاست کا علاقہ بحر ہند اور خلیج عدن کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کا رقبہ ۶۲۰۱ مربع میل ہے۔ اور آبادی ۳۲ لاکھ ہے۔ یہاں کے لوگوں کا مذہب اسلام ہے اور قومی زبان صومالی ہے۔ مگر تعلیم عربی، انگریزی اور اطالوی زبانوں میں دی جاتی ہے۔ اس ریاست کی آب وہوا گرم خشک ہے۔ بارش کا اوسط دس انچ ہے۔ زرعی پیداوار مکئی، چاول اور نیشکر پر منحصر ہے۔ اور معدنیات میں قلعی، لوہا اور نمک ہیں۔ ۱۹۵۰ء تک اس ریاست کا نظم ونسق برطانیہ کے ہاتھ میں رہا۔ اس کے بعد دس سال تک اقوام متحدہ اور اٹلی کی زیر نگرانی رہا۔ پھر ۱۹۶۰ء میں جمہوریہ صومالیہ کے نام سے دنیا کے نقشہ پر اُبھرا۔ جون ۱۹۶۱ء میں یہاں جدید آئین نافذ ہوا۔ پھر جنرل محمد سعید باری فوجی کمانڈر کو پچیس ممبروں پر مشتمل انقلابی کونسل کا چیئرمین بنایا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں یہاں سوشلزم نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک قانون پاس ہوا جس کی رُو سے سرکاری ملازمین ایک سے زیادہ مکان نہیں رکھ سکتے تھے۔ ڈاکٹروں کو پرائیویٹ پریکٹس سے منع کر دیا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس ملک کا دارالسلطنت ''موگادیشو'' ہے۔ اس وقت صومالیہ اسلامی سیکرٹریٹ، اقوام متحدہ اور افریقی اتحاد کے ادارہ کا ممبر ہے۔

۱۲۔ تنزانیہ:

مشرقی افریقہ کا یہ اسلامی ملک متحدہ جمہوریہ تنزانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ رقبہ ۳۶۲۸۲۰ مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ ملک کی سرکاری زبانیں انگریزی اور سواہلی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانیں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ریاست کا مذہب اسلام اور پایہ تخت ''ڈودوما'' ہے۔

اس ریاست کے تجارتی تعلقات زمانہ قدیم سے ہندوستان اور عرب ممالک سے چلے آرہے ہیں۔ اہل عرب نے یہاں اسلام کی خوب اشاعت کی اور اسلامی حکومت قائم کرلی۔ سولہویں صدی عیسوی میں پرتگیزیوں نے اس ملک سے عربوں کا تسلط ختم کر دیا۔ پھر تھوڑے عرصے کے بعد اہل عرب نے پھر اپنی حکومت بحال کردی۔ انیسویں صدی میں یہاں جرمنوں کا زور بڑھ گیا اور ۱۸۸۵ء میں اسے جرمنوں کا زیر تحفظ علاقہ قرار دیا گیا۔

پھر ۱۹۱۴ء میں یعنی پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ نے یہ علاقہ جرمنوں سے چھین لیا۔ پھر ۱۹۴۶ء میں اس ملک نے اقوام متحدہ کے تولیتی علاقے کی صورت اختیار کرلی۔

اس وقت تنزانیہ دولت مشترکہ اور اقوام متحدہ کا ممبر ہے اور دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ اس کی مشہور پیداوار لونگ، کپاس اور نیشکر ہیں۔ معدنیات میں ہیرے، سونا اور ٹین مشہور ہیں۔ یہاں چمڑا سازی، پارچہ بافی، اور المونیم کے برتن وغیرہ کی صنعت ہے۔

۱۳۔ چاڈ:

یہ اسلامی ملک ''ری پبلک ڈی چاڈ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا رقبہ ۴۹۵۸۰۰ مربع میل ہے اور آبادی تقریباً چالیس لاکھ ہے۔ اس میں پچاسی فیصد مسلمان ہیں یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ زرعی پیداوار چاول، کپاس باجرہ وغیرہ پر مشتمل ہے اور سب سے بڑی معدنی دولت قلعی ہے۔

اس ملک پر ۱۹۱۳ء میں فرانس نے قبضہ کرلیا۔ ۱۹۶۰ء میں یہ ریاست خودمختار ہوگئی اور نیا آئین نافذ ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں صدر گوبیلے نے فرانسیسی فوجوں کی مدد سے ملک میں انتشار ختم کیا۔ اس وقت چاڈ افریقی اتحاد، اقوام متحدہ اور اسلامی سیکرٹریٹ کا ممبر ہے۔

۱۴۔ ماریطانیہ کی اسلامی جمہوری ریاست:

یہ اسلامی ریاست افریقہ کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ سوا چار لاکھ مربع میل اور آبادی بارہ لاکھ ہے۔ اس کا صدر مقام ''نواکاٹ'' ہے۔ سرکاری مذہب اسلام ہے لیکن دوسرے مذاہب کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ ریاست میں مسلمانوں کی آبادی ننانوے فی صد ہے۔ پیداوار گندم، چاول، جو اور کھجور ہے۔ یہاں چینی تیار کرنے، کپڑا بننے اور سمندری پانی کو صاف کرنے کی صنعتیں ہیں۔ یہاں قدیم زمانے میں حبشی اور بربر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ اس ملک نے پوری آزادی حاصل کرلی۔ ۱۹۷۲ء میں ماریطانیہ سات قوموں کی اقتصادی انجمن میں شامل ہوگیا۔ ملک کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے اور قومی زبان عربی ہے۔

۱۵۔ دولت سعودیہ عربیہ:

دولت سعودیہ عربیہ نجد اور حجاز کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے عرب ممالک میں سب سے بڑی ریاست ہے۔ سعودی عرب تیل کی پیداوار میں دنیا بھر میں پانچویں نمبر پر ہے، اس کا رقبہ دس لاکھ مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ ہے۔ صدر مقام ریاض ہے۔ اس ملک میں سارے مسلمان آباد ہیں۔ ۱۹۱۴ء

کی جنگ سے پہلے اس سرزمین پر ترکوں کی حکومت تھی۔ اس جنگ کے دوران ہاشمی خاندان کے ایک فرد شریف حسین نے ترکوں سے بغاوت کر کے اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ جنگ کے اختتام پر شریف حسین کو حجاز کا حکمران تسلیم کیا گیا۔ شریف مکہ کی حکومت کا انتظام اچھا نہ تھا۔ حاجیوں کو لٹیروں کے ہاتھوں بہت تکلیف اٹھانا پڑتی تھی۔ چنانچہ سلطان عبدالعزیز والی نجد نے حجاز پر حملہ کر دیا اور برطانیہ نے عبدالعزیز بن سعود کو عرب کا حکمران تسلیم کیا گیا۔

پھر گیارہ سال بعد ۱۹۶۴ء میں شرعی طور پر شاہ فیصل کو عرب کا حکمران تسلیم کیا گیا۔ سعودی عرب سے پاکستان کے سفارتی تعلقات قائم ہیں۔ عرب ریاستیں باہمی باہمی اور تعاون سے اپنے دفاعی انتظامات کرنے کے قابل ہوگئی ہیں۔ سعودیہ نے ۱۹۷۸ء میں اسرائیل سے ایک معاہدہ کیا جس میں یروشلم کو اسرائیلی ریاست کی نگرانی میں حق خودارادیت دیا گیا۔ اس پر فلسطینی عربوں نے ۱۹۸۱ء میں انور سادات کو قتل کر دیا کیونکہ اومان اور سوڈان کے سوا باقی تمام عرب ممالک نے انور سادات کو غدار قرار دیا تھا۔

عالم اسلام کے سیاسی حالات کے ایک سرسری جائزہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ دولت سعودیہ عربیہ کو بین الاقوامی حلقہ میں فیصلہ کن اثر و رسوخ حاصل ہے کیونکہ مقامات مقدسہ اس کی تحویل میں ہیں۔ اس لیے اسے تمام عالم اسلام کا روحانی پیشوا ہونے کا فخر حاصل ہے۔

۱۶۔ عرب کی اہم اسلامی ریاستیں:۔

(ا) اومان:

اس کا پرانا نام عمان ہے۔ سولہویں صدی میں اس ریاست کو پرتگیزیوں نے فتح کیا۔ مگر سترہویں صدی میں یہ ریاست ایران کے قبضے میں آئی۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں پاکستان نے بندرگاہ گوادر کو آٹھ سو ملین ڈالر میں خرید لیا۔ اس ریاست کا مذہب اسلام ہے۔ زبان زیادہ تر عربی ہے مگر وہاں اردو، بلوچی اور ہندی بھی بولی جاتی ہے۔

(ب) کویت:

یہ چھوٹی سی ریاست خلیج فارس کے بالمقابل واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۶۲۰۰ مربع میل ہے اور ۹۴ فیصد مسلمانوں کی آبادی ہے۔ آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ خاص پیداوار کھجور، پیاز، مولی اور تربوز وغیرہ ہیں۔ یہاں کی صنعتیں سیمنٹ سازی اور فرنیچر سازی وغیرہ ہیں۔ یہ ملک موتیوں کی تجارت کے لیے خاص طور پر مشہور ہے۔ کویت، عرب لیگ اور اسلامی سیکرٹریٹ کی انجمن کا ممبر ہے۔

(ج) یمن:

حضور رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں یمن کے گورنر باذاں نے ۶۲۸ء میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں یہاں بغاوتیں ہوئیں جنہیں عکرمہ بن ابوجہل اور شرجیل بن حسنہ نے فرو کیا۔ ۱۸۳۹ء میں برطانیہ نے عدن پر قبضہ کرلیا۔ یمن کے حکمران امام احمد کو ۱۹۶۲ء میں قتل کر دیا گیا۔ جدید یمن کا مجموعی رقبہ ۱۸۶ مربع میل اور کل آبادی چونسٹھ لاکھ ہے۔ دنیا کا بہترین قہوہ یہاں پیدا ہوتا ہے۔

(د) قطر:

۱۹۱۵ء قطر عثمانی ترکوں کے زیر اثر رہا۔ ۱۹۷۲ء میں قطر نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور احمد بن علی اس ریاست کے حاکم اعلیٰ بن گئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد ان کے چچازاد بھائی خلیفہ بن حماد ثانی نے ان کی جگہ لے لی۔

ریاست کا رقبہ ساڑھے آٹھ ہزار مربع میل ہے اور آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔ سرکاری زبان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عربی اور مذہب اسلام ہے۔ قطر کی معدنی دولت پیٹرول ہے۔ سمندر سے موتی بھی نکالے جاتے ہیں۔ زرعی پیداوار بہت کم ہے۔

(۵) بحرین:۔

یہ کویت سے دو سو میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہ چند جزیروں کا مجموعہ ہے۔ سب سے بڑا جزیرہ بحرین ہی ہے۔

اہل عرب نے ساتویں صدی عیسوی میں ان جزائر پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ سولہویں صدی میں ان پر پرتگیزیوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۷۵۲ء میں انگریزوں نے اس ریاست کو اپنے اثر میں لے لیا۔ پھر ۱۹۷۱ء میں بحرین کو آزادی ملی۔ اس وقت بحرین میں برطانیہ کا ایک بحری اڈہ ہے۔ بحرین کا رقبہ ۲۳۱ مربع میل اور آبادی تقریباً تیس لاکھ ہے۔ اس کا صدر مقام منامہ ہے۔ زبان عربی ہے۔ تقریباً ۹۵ فیصد مسلمان ہیں۔ ان میں اکثر لوگ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

بحرین کی اہم ترین صنعت تیل صاف کرنا ہے اور زرعی پیداوار مویشیوں اور مچھلیوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے۔

متحدہ عرب امارات

دوسری چھوٹی ریاستیں لج، حضرموت، دبئی، شارجہ، فجیرہ، ام القوین، راس الخیمہ اور عجمان ہیں۔ ان ریاستوں کے حکمران شیخ کہلاتے ہیں۔

سیاسی لحاظ سے یہ تمام امارتیں انگریزوں کے زیر اثر تھیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں ان علاقائی اکائیوں نے برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ یہ معاہدہ ختم کر دے گا۔ پھر چھ ریاستوں یعنی ابوظہبی، دبئی، شارجہ، فجیرہ، ام القوین اور عجمان نے مل کر متحدہ عرب امارات کی تشکیل کی۔ بہت جلد ہی راس الخیمہ نے بھی اس میں شرکت کر لی۔ جدید مملکت کا صدر شیخ زید بن سلطان النہیان کو منتخب کر لیا گیا۔ اس کا رقبہ ۳۲۲۷۸ مربع میل اور آبادی بیس لاکھ ہے۔ ان اکائیوں کی سرکاری زبان عربی اور سرکاری مذہب اسلام ہے۔ یہاں کے لوگوں کا عام پیشہ ماہی گیری ہے۔ تیل یہاں کی سب سے بڑی معدنی دولت ہے۔ ان ممالک میں کوئی قابل ذکر صنعت نہیں، یہ متحدہ امارتیں عرب لیگ، ساتھی قوموں کی انجمن اور اسلامی سیکرٹریٹ کی ممبر ہیں۔ عرب امارتوں کی آبادی عرب باشندوں، ایرانی، بھارتی اور پاکستانی لوگوں پر مشتمل ہے۔

۱۶۔ سلطنت اردن

سلطنت عثمانیہ کے زمانہ میں اردن کا علاقہ شام کے صوبے کا ایک غیر معروف سب ڈویژن تھا مگر ۱۹۲۰ء میں اسے شام سے الگ کر کے ایک علیحدہ ملکی اکائی کا تصور دیا گیا۔ برطانیہ کی سرپرستی میں شریف مکہ کا بیٹا امیر عبداللہ ۱۹۲۱ء میں اس کا فرماں روا تسلیم کیا گیا۔ پھر ۱۹۴۶ء میں اسے بھی سیاسی آزادی نصیب ہوئی لیکن برطانیہ کو یہاں ہوائی اڈے بنانے کا حق حاصل رہا۔

پھر ۱۹۶۸ء کی فلسطینی لڑائی میں امیر عبداللہ کی فوجوں نے بہت بہادری دکھائی۔ جب جنگ ختم ہوئی تو امیر عبداللہ کی سلطنت کا رقبہ تقریباً دوگنا ہو گیا جس میں چار لاکھ مہاجرین کو بسانے کا انتظام کیا گیا اور انہیں اردن کی شہریت کے حقوق دیے گئے مگر مالی لحاظ سے اردن کا حکمران برطانیہ کا دست نگر رہا۔

پھر ۲۰ جولائی ۱۹۵۱ء کو امیر عبداللہ کو قتل کر دیا گیا اور ولی عہد طلال تخت نشین ہوا مگر اپنی مسلسل بیماری کی وجہ سے اسے ۱۹۵۲ء میں معزول کر دیا گیا اور ان کا بڑا لڑکا حسین، ملک کا فرماں روا بنا دیا گیا۔ پھر شاہ حسین نے شام و مصر کے ساتھ ایک دفاعی معاہدہ کیا جس کی

رو سے اسرائیلی ریاست کے خلاف جنگ کی صورت میں تینوں ممالک نے متحد ہو کر لڑنے کا فیصلہ کیا۔

نہر سوئیز کے سلسلے میں جب جنگ ہوئی تو اردن کے برطانیہ اور فرانس سے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور برطانیہ نے اردن کی مالی امداد بند کر دی۔ گو مصر اور شام کے ساتھ سیاسی تعلقات میں گڑبڑ ہوئی مگر امریکی حکومت نے اردن کو امداد دینا شروع کر دی جو ۱۹۶۰ء میں پانچ کروڑ ڈالر سالانہ تک پہنچ گئی۔ اردن کا رقبہ ۳۷۷۳۸ مربع میل اور آبادی پچیس لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس کا پایہ تخت عمان ہے۔ سرکاری زبان عربی، آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اردن عرب لیگ، اقوام متحدہ اور اسلامی سیکرٹریٹ کا ممبر ہے۔

ان کے علاوہ بیسویں صدی کی اسلامی سلطنتوں میں مندرجہ ذیل ریاستیں اور حکومتیں بھی شامل ہیں جن کے ہم صرف ایک سطری حوالے درج کر رہے ہیں۔ ان کی تفصیل ہم کسی اور موقع پر لکھیں گے۔

بیسویں صدی کی باقی ریاستیں مندرجہ ذیل ہیں۔

ملک	دارالسلطنت	زبان
۱۷۔ لبنان	بیروت	انگریزی
۱۸۔ شام	دمشق	عربی
۱۹۔ عراق	بغداد	عربی
۲۰۔ ایران	تہران	فارسی
۲۱۔ افغانستان	کابل	پشتو
۲۲۔ ملائیشیا	کوالالمپور	ملائی
۲۳۔ پاکستان	اسلام آباد	اردو
۲۴۔ فلسطین	تل ابیب	عربی

ان صفحات میں دنیائے اسلام کے جن چوبیس ملکوں کے نام اور ان کا مختصراً تذکرہ کیا گیا ہے وہ محض تفنن طبع یا دیا داشت کے لیے نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بیت المقدس (فلسطین) پر ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء میں یہودیوں نے جو قیامت صغریٰ برپا کی اور جس کے کرب سے آج بھی بیت المقدس ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے۔ وہ قیامت دن دہاڑے ان چوبیس مسلم ریاستوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اور سر پر چڑھ کر برپا کی۔ وہ سب کچھ ان مسلم ریاستوں نے سنا اور دیکھا ہے اور آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

ان مسلمان ریاستوں اور ملکوں میں چھوٹے بڑے اور امیر اور اوسط درجے کی ریاستیں اور ملک شامل ہیں اور اگر خدانے وہ دن دکھایا کہ یہ تمام ریاستیں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ظالم یہودیوں کے خلاف کھڑی ہو گئیں تو پھر نہ امریکا اور نہ برطانیہ یہودیوں کو بچا سکتا ہے اور نہ ان کی حفاظت کر سکتا ہے۔ آج ہم جب ٹی وی پر بیت المقدس میں مسلمانوں کے مکانوں، دکانوں اور بازاروں کو جلتے دیکھتے ہیں اور سڑکوں پر یہودی ٹینکوں کو دوڑتے اور نہتے مسلمانوں پر گولیاں برساتے دیکھتے ہیں تو ہمارے سینے جل اٹھتے ہیں۔

یہ بات نہیں کہ مسلمان بزدل ہیں اور یہودیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکا اور برطانیہ، یہودیوں کی مدد دامے، درمے اور سخنے کر رہے ہیں۔ بلکہ انہوں نے یہودیوں کے لیے اسرائیل میں جدید ترین اسلحہ کے ڈھیر لگا دیے ہیں۔ جبکہ مسلمان یہودیوں کے مقابلے میں بالکل نہتے نظر آتے ہیں۔ مسلمان اگرچہ یہودیوں کے مقابلے میں دل والے اور بہادر ہیں مگر وہ یہودیوں سے اسلحہ کی مار کھاتے ہیں۔ پھر جب مسلمانوں کو زیادہ غصہ آتا ہے اور وہ رسائل میں یہودیوں کے مظالم پڑھتے اور ٹی وی پر دیکھتے ہیں تو ان کا خون کھول اٹھتا ہے اور کوئی جوان اپنے جسم پر بم باندھ کر کلاشنکوف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنبھال کر یہودیوں کے ہجوم میں گھس پڑتا ہے پھر اس کے جسم سے بندھے بم پھٹتے ہیں تو دس بیس یہودی ڈھیر ہو جاتے ہیں اور خود اس کے جسم کے ٹکڑے بھی بکھر جاتے ہیں۔

جان دو اور جانیں لو کا یہ سلسلہ آج نہیں بلکہ ۱۹۴۸ء سے شروع ہوا اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ آیئے اب ہم یہودی اور مسلم چپقلش کو اس کے آغاز یعنی کم از کم ۱۹۴۸ء سے ایک بار پھر دیکھتے ہیں تاکہ ہم یہودیوں کی پشت پر بیٹھے ہوئے ان عیسائیوں کے چہرے بھی دیکھ سکیں جن کے زور اور شہ پر یہودی بیت المقدس میں مسلم آبادی کے محلوں میں اسلحہ بردار ٹینک دوڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔

مسلم سرشت

ہم جانتے ہیں کہ تاریخ، قوموں کے عروج وزوال کی سچی کہانی ہے۔ ایمان اور عمل صالح اپنانے والوں سے خالق عالم کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا۔ چنانچہ بلندی اور پستی کا یہ چکر امت مسلمہ کے ساتھ بھی چلتا رہا ہے۔ اور جب ہم مسلمانوں کے عروج وزوال پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس قوم کی تخلیق قدرت نے ایک خاص غرض سے کی تھی۔ چنانچہ جب تک قوم اپنے نصب العین کے مطابق میدانِ جہاد میں رہتی ہے اسے عروج ملتا ہے اور جب وہ اپنے مقصد یا حکمِ خداوندی سے سرتابی کرتا ہے تو وہ ناکام اور رسوا ہو جاتا ہے۔

خلافت عباسیہ میں جب بغداد کو ایشیا کا "پیرس" کہا جاتا تھا اور کتاب وسنت کے وارث معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑنے جھگڑنے اور ایک دوسرے پر کفر وشرک کے فتوے لگانے لگے تو تاتاریوں نے اس قوم یعنی مسلمانوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی لیکن اس دور میں امام ابن تیمیہ کی للکار نے جس میں کتاب وسنت کی پوری روح جلوہ گر تھی، بڑھتے ہوئے تاتاری طوفان کا رخ پھیر دیا تھا۔ ہماری تاریخ کی کتابیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ امت رسول ہاشمی ایک خاص امتیاز رکھتی ہے جو اسے دوسری قوموں سے ممتاز اور بالاتر رکھتا ہے۔ یہ امتیازی وصف ہی دراصل اللہ کی کتاب وسنت سے وابستگی ہے۔ جب تک مسلمان کتاب وسنت کی چھاؤں میں رہتا ہے اس پر کفر کی دھوپ کام نہیں کرتی مگر جب مسلمان کی بنیاد یعنی ایمان میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی طاقت کا سوتا سوکھ جاتا ہے۔ عظمت کا سورج گہنا جاتا ہے اور وہ کمزور سے بھی مار کھا جاتا ہے۔

ماضی میں جب تاتاری یلغار مشرقِ وسطیٰ کو اپنے سیلاب میں بہالے جانا چاہتی تھی کہ کتاب وسنت کی روح سے سرشار ایک گروہ نے اسے للکارا اور وہ طوفان جو شمع توحید کو بجھانے کے لیے اٹھا تھا، بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ آج پھر مشرقِ وسطیٰ ایک نئے طوفان کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ یہ سیلاب صیہونیت کا ہے، یہودیت اور اسرائیلیت کا ہے۔ اور یہ سیلاب ماضی کے تاتاری فتنے سے بھی شدید تر ہے۔ ماضی اور حال کے ان دو فتنوں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ تاتاری فتنہ اپنے وجود میں مستقل تھا اور عہد حاضر کا صیہونی فتنہ، استعماری طاقتوں کا ایک بہروپ ہے۔ چہرہ پر نظر ڈالیے تو اسرائیل لیکن دل ودماغ عزائم اور ارادے سب کے سب استعماری طاقتوں کے ہیں۔ ان میں ساری طاقت وتوانائی استعماری ہے اور اسے جنم بھی استعمار ہی نے دیا ہے۔ لطف یہ کہ نمو وپرداخت بھی اس نے کی اور حفاظت بھی وہی کر رہا ہے۔

"بیت المقدس"

بیت المقدس ہمارا "قبلہ اول" ہے۔ یہ ہماری نسل کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اسے "قبلہ اول" کے چھن جانے کے حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سے زیادہ دل شکن حادثہ "مسجد اقصیٰ" کی توہین کا ہے۔ یہودی اس عظیم، مبارک اور مقدس مسجد کو گرا کر اپنا ایک معبد تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اس پر بس نہیں بلکہ اب تو یہودی حرمین الشریفین پر بھی حریصانہ نظریں ڈالنے لگے ہیں۔ مزید برآں یہ نادان نیل سے فرات تک توحید پرستوں کو نابود کرنے کی آرزو بھی رکھتے ہیں لیکن ہم ابھی تک اس کے عزائم کو نہیں سمجھ سکے اس لیے کہ ہمیں اس مسئلہ کی نزاکت کا احساس نہیں۔ ہم اس شہر کی عظمت اور فضیلت کو نہیں جان سکے جس کے لیے حضرت عمرؓ نے سفر کیا اور غازی اسلام صلاح الدین ایوبی اور ان کے جاں نثار ساتھی برسوں لڑتے رہے اور داد شجاعت دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اس شہر کے ذرے ذرے میں ان کا خون رچ بس گیا جو آج بھی مضطرب وبے چین ہے اور ایک نئی کروٹ کا منتظر ہے۔

یہ ناول اس شہر کی عظمت اور فضیلت کی داستان ہے جس کے حصول کے لیے ہمارے اسلاف، ہمارے آباؤ اجداد ایک سو سال تک اپنا خون بہاتے رہے اور آج بھی اس کی خوں چکاں داستان، مسلمان بچے، جوان اور بوڑھوں کی زبان پر ہے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ نے بیت المقدس اور اس کے گردا گرد کے علاقوں کو عالمی اہمیت کا علاقہ قرار دیتے ہوئے فلسطین کی تقسیم کے ساتھ بیت المقدس کو بین الاقوامی تولیت میں دینے کا فیصلہ کر دیا۔

یہودیوں نے اس فیصلہ کو خوش دلی سے منظور کیا لیکن عربوں نے اس ناانصافی کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ مفتی اعظم کی مختصر سی فوج آزادی لاکھوں یہودیوں کے مقابلہ میں ڈٹ گئی۔ یہودیوں کو عالمی صیہونی ایجنسی اور بعض ممالک مثلاً چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ اور رومانیہ کھلے عام اسلحہ فراہم کر رہے تھے۔ برطانوی حکومت نے بھی انہیں ٹینکوں سمیت جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کیا۔ انہیں (یعنی یہودیوں کو) عرب علاقوں پر قبضہ کرنے میں مدد دی اور عرب آبادی کو محفوظ مقام پر پہنچانے کے بہانے شہر خالی کرا لیے۔ چنانچہ ۱۴ مئی ۱۹۴۷ء کو جب برطانیہ رخصت ہوا تو دیر سین، طبریہ، حیفہ، سمخ، سلامہ، بیان، سفد، یافا اور بیت المقدس (نیا شہر) ایسے شہر عرب آبادی سے بالکل خالی ہو چکے تھے۔

برطانیہ کی معاشی جنگ (۱۹۴۸ء)

برطانیہ اور یہودیوں کی ملی بھگت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ برطانیہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ فلسطین کو ۱۴ مئی کو خالی کر دے گا اور حیفہ کی بندرگاہ سے فوجیں اگست میں ہٹائے گا مگر اس نے اس اعلان کے برعکس حیفہ کو بھی ۱۴ مئی کو خالی کر دیا اور ۱۵ مئی کو اسلحہ اور بارود سے لدے ہوئے جہاز حیفہ کی بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں کی ایک زبردست فوج نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ اخوان مجاہدین گزشتہ چار ماہ سے پرانے شہر میں یہودیوں سے جنگ کر رہے تھے۔ ان کے پاس ہتھیار تھوڑے تھے اور وہ بھی پرانے قسم کے تھے مگر وہ اپنے جوشِ ایمان، خلوص نیت، شوقِ شہادت اور توکل اللہ کی بدولت لڑتے رہے۔ اس وقت مقامی آبادی کے علاوہ گردوپیش کے بیس ہزار مسلمان بیت المقدس میں پناہ گزین تھے۔ چند ہفتے پہلے ہی یہودی دیر یاسین میں قتل عام کر چکے تھے۔ القدس کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ یہاں بھی دیر یاسین کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وحشت ناک کہانی دہرائی جائے گی۔ اخوان کے پاس گولہ بارود کا آخری ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے عرب لی جن سے مدد مانگی لیکن جنرل گلب پاشا نے بعض سیاسی اور مذہبی وجوہ کی بناء پر ایک فوجی بنیاد کی آڑ میں شہر کو خالی کرنے کا مشورہ دیا جسے اخوان نے مسترد کر دیا۔ اخوان دستوں کے قائد نے کہا۔

"یہودی ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی بیت المقدس میں داخل ہوں گے۔"

عرب لی جن سے مایوس ہو کر پوری عرب آبادی گھروں سے نکل آئی۔ رات بھر شدید جنگ ہوتی رہی اور صبح کے وقت یہودی پسپا ہونے لگے۔ اردنی فوج کے ایک افسر کو اس صورت حال کی خبر ملی تو جنرل گلب پاشا کی مخالفت کے باوجود یہودیوں کی تازہ دم فوج کے پہنچنے سے پہلے پچھلے پہر اردنی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اخوان کے ثبات، استقلال اور جانفروشی نے بیت المقدس کو مسلمانوں کے لیے محفوظ کر لیا۔

۸ جولائی کو یہودیوں نے دوبارہ حملہ کیا لیکن شدید جنگ اور زبردست نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہو گئے۔ اس وقت اقوام متحدہ یہودیوں کی مدد کو آگے بڑھی لیکن اقوام متحدہ کی قرارداد کے احترام میں عربوں نے ابھی ہتھیار رکھے ہی تھے کہ ۲۵ جولائی کو یہودیوں نے ایک زبردست حملہ کر کے بیت المقدس کے چوراسی فیصد رقبہ پر قبضہ کر لیا اور مسلمان صرف قدیم شہر تک محدود ہو کر رہ گئے۔

پھر ۱۹ اگست ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ نے بیت المقدس کو غیر مسلح قرار دینے کی قرارداد منظور کی جسے اسرائیل نے مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ بیت المقدس کی حالیہ پوزیشن کو برقرار رکھا جائے۔ پھر چند یوم بعد اقوام متحدہ پر الزام لگا کہ وہ اپنی قراردادوں پر عمل کرانے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اسرائیل نے بیت المقدس سے متعلق اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کو ماننے سے بالکل انکار کر دیا اور بیت المقدس کو اسرائیلی دارالسلطنت بنانے کی باتیں شروع کر دیں۔

اقوام متحدہ نے ایک اور قرارداد کے ذریعے یہودیوں پر واضح کر دیا کہ بیت المقدس کو دارالسلطنت نہیں بنا سکتے لیکن اسرائیل نے اسے بھی نظرانداز کر دیا اور پارلیمنٹ کی منظوری سے بیت المقدس کو اسرائیل کا مستقل دارالسلطنت قرار دے کر وزارت خارجہ کے سوا اکثر دفاتر نئے بیت المقدس میں منتقل کر دیئے اور جون ۱۹۵۲ء میں وزارت خارجہ بھی بیت المقدس منتقل ہو گئی۔

۹ جولائی ۱۹۵۲ء کو امریکا نے برطانیہ، مشرقی جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، جاپان، ترکی، کینیڈا، آسٹریلیا، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ کی طرح اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے بیت المقدس منتقل کرنے سے انکار کر دیا لیکن اکثر ممالک کے سفارتی مشن بیت المقدس آ گئے۔

اسرائیل میں انضمام

اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر ۷ جون ۱۹۶۷ء کو قبضہ کر لیا اور ۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو اقوام متحدہ نے قرارداد نمبر ۲۲۵۳ ای۔ ایس۔ وی کے ذریعے بیت المقدس کو اسرائیل میں مدغم کرنے کے اقدام کو غیر قانونی قرار دیا۔ اس قرارداد کے حق میں ۹۹ ووٹ آئے۔ کسی نے مخالفت نہیں کی مگر امریکا اور اسرائیل غیر جانب دار رہے۔ پھر ۱۴ جولائی کو جنرل اسمبلی نے اس قرارداد کی توثیق کر دی۔

اس سے اگلے سال یعنی ۲۱ مئی ۱۹۶۸ء کو سلامتی کونسل نے اسرائیل کے رویئے کی مذمت کی اور ۴ جولائی اور ۱۴ جولائی کی قرار دادوں پر اصرار کرتے

ہوئے اسرائیلی اقدام کو بین الاقوامی قانون اور رائے عامہ کے خلاف قرار دیا۔ مگر اسرائیل نے اقوام متحدہ کی ہر قرارداد کو اقوام متحدہ کے منہ پر دے مارا جس کے نتیجے میں آج تک بیت المقدس اسرائیلی ظلم و استبداد کا شکار ہے اور اسے کسی ایسے صلاح الدین ایوبی کا انتظار ہے جو اسرائیل اور اقوام متحدہ دونوں کے کلے چیر کے رکھ دے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس کئی بار اجڑا اور پھر آباد ہوا ہے۔ اس عرصہ میں اس کی شہر پناہ بھی کئی بار تعمیر ہوئی۔ بیت المقدس کی پہلی شہر پناہ (فصیل) عہد داؤد میں تعمیر ہوئی تھی اور اس کے خستہ ہونے پر حضرت سلیمانؑ نے اس کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کرائی۔ پھر حضرت سلیمانؑ کے چار سو سال بعد یہ شہر پناہ شاہ بابل بخت نصر کے ہاتھوں تباہ ہوئی جس نے فصیل کو گرا کر وہاں ہل چلوا دیے۔

دوسری فصیل کا کام ۴۴۵ ق۔م میں شروع ہوا یہ شہر پناہ یہودی قبائل نے آپس میں تقسیم کاری کے اصول پر بنائی اور اس کی تعمیر میں مقامی لوگوں کے علاوہ اہل فارس، رومیوں، شامیوں اور مصریوں نے مداخلت کی مگر تعمیر کا کام کسی نہ کسی طرح جاری رہا اور آخر اسے مکمل کیا گیا۔ یہ شہر پناہ پہلی فصیل کے کھنڈرات ہی پر اٹھائی گئی تھی اس لیے شہر کے محل وقوع میں کوئی زیادہ فرق نہ آیا۔ اس شہر پناہ کی تعمیر شہر کے شمالی حصے سے شروع ہوئی۔ اس کی مغربی حد موجودہ باب دمشق کی جگہ تھی۔ یہاں سے جنوب کو مڑ گئی تھی۔ لیکن یہ شہر پناہ بھی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور حملہ آوروں کی ستم رانیوں کا شکار ہو گئی۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ شہر پناہ کی تیسری تعمیر ہیرود کے جانشین ہیرود اغریپا نے شروع کی۔ اس کا تعمیراتی کام اس قدر شاندار تھا کہ شام کے رومی حکمران کے ذہن میں شک پیدا ہوا کہ یہ سب کچھ ایک نئی بغاوت کی تیاری ہے۔ چنانچہ اس نے کلاڈیس سیندر کو ایک خط لکھا جس میں اس شک کا اظہار کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلاڈیس نے اغریپا کو مزید تعمیر سے روک دیا۔ پھر یہودیوں نے اپنے روایتی حربوں (مکاری) سے کام لیتے ہوئے اس کی جزوی تعمیر کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔

جوسیفس اس شہر کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس کی تعمیر میں ۲۰ ہاتھ لمبے اور دس ہاتھ چوڑے پتھر لگائے گئے تھے جن کا اٹھانا اور بلند کرنا انسانی طاقت سے ممکن نظر نہ آتا تھا۔ یہ فصیل ۷۱ء میں طیطس اور رومی حملوں کا شکار ہو گئی اور ملبے کا ڈھیر بن گئی۔

اس کی موجودہ فصیل ترکان عثمان کے دوسرے بادشاہ سلیمان اعظم نے تعمیر کرائی۔ سلیمان اعظم کے والد سلطان سلیم نے ۱۵۱۷ء میں اس شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ سلیمان اعظم نے اس کی تعمیر دو بھائیوں کو سونپی تھی جنہوں نے ۱۵۳۶ء میں کام کا آغاز کیا اور وہ اس کی تکمیل تک ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ سات سال بعد یعنی ۱۵۴۲ء میں موجودہ سینٹ اسٹیفن گیٹ پر ان کی ملاقات ہوئی۔ اس خوشی میں انہوں نے دروازہ پر چار شیر بنائے مگر کیوں؟ اس کی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ شہر پناہ کی ہر تعمیر کے ساتھ اس کے دروازوں کے ناموں میں تھوڑا رد و بدل ہوتا رہا۔ بیشتر عرب جغرافیہ نویسوں نے ان دروازوں کا ذکر ضمناً کیا اور صرف دو عرب مصنفین نے اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

ان میں مقدسی نے ۹۸۵ء میں اور مجیر الدین نے ۱۴۹۶ء میں اس کی تفصیل بتائی ہے۔ ان تاریخوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے درمیان یہ مقدس شہر تقریباً ایک صدی تک صلیبیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ ان دونوں تذکرہ نگاروں نے جو نام لکھے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مقدسی نے جن دروازوں کا ذکر کیا ہے وہ آج تک کھلے ہوئے ہیں اور استعمال میں ہیں۔

مقدسی نے بالا حصار کے آٹھ دروازے بتائے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ باب صیہون ۲۔ باب الیتھ (دشت) ۳۔ باب البلاط، ۴۔ باب ارمیہ (حضرت ارمیہ کا گڑھا)، ۵۔ باب سلوان (صلوان)، ۶۔ باب العمود (ستون) ۸۔ باب محراب داؤد۔

ان میں سے باب محراب داؤد آج کل بافہ گیٹ کہلاتا ہے۔ مقامی لوگ اسے باب الخلیل یا باب حبرون کہتے ہیں۔ مقدسی نے اس سلسلے میں بالا حصار کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس دروازے سے ذرا اوپر کے رخ اب تک موجود ہے اور اس میں وہ محراب بھی سلامت ہے جس سے یہ دروازہ منسوب کیا جاتا ہے۔

مقدسی کا باب صیہون جنوبی دیوار میں باب حبرون کے بعد دوسرا دروازہ ہے جسے آج کل باب النبی داؤدؑ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جبکہ مجیر الدین نے اسے "باب حارۃ الیہود" کہا ہے۔ اس کے قریب ہی حضرت داؤد علیہ السلام کا مزار مبارک ہے۔

اسی طرح باب "اریحا" وہ ہے جسے چودھویں صدی سے سینٹ اسٹیفن گیٹ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ دروازہ دسویں صدی عیسوی میں "جریکو گیٹ" کہلاتا ہے۔ اسے باب الاسباط یا "مریم متی" کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔ برکتہ اسرائیل اس دروازے کے باہر ہے جو نہایت قدیم تالاب ہے۔

"باب جب ارمیہ" شمال کا چھوٹا سا دروازہ باب السباہرہ ہے قدیم زمانہ میں "ہیرود" گیٹ کہلاتا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ میدان ہے۔ یہاں بعض روایات کے مطابق روزِ محشر (قیامت) ساری مخلوق جمع ہوگی۔ اور ایک خندق بھی ہے جس کے بارے میں عام روایت ہے کہ اسے سلطان صلاح الدین ایوبی نے کھدوایا تھا لیکن مقدسی نے اسے "گڑھے کا دروازہ" کہا ہے جس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خندق قدیم زمانہ سے ہے۔ البتہ اتنا ضرور ممکن ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے مزید مستحکم اور استوار کیا ہو۔

باب عمود آج بھی اسی نام سے شمالی دیوار کے وسط میں واقع ہے۔ اسے باب دمشق کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں سے ایک سڑک نابلس اور دمشق کو جاتی ہے۔

عیسائی روایات کے مطابق قبول مسیحت کے بعد "سینٹ پال" اس دروازے سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ محاربات صلیب کے وقت یہ دروازہ سینٹ اسٹیفن سے منسوب تھا کیونکہ وہ جگہ جہاں یہود نے سینٹ اسٹیفن کو سنگسار کیا وہ اس دروازے کے باہر چند قدم دور ہے۔ اس جگہ تھیوڈوسیس ثانی کی ملکہ اُدوسیا نے ۴۵۵ء ایک گرجا بنا دیا تھا۔ ملکہ اس گرجا میں دفن ہے۔ اس گرجا سے کچھ فاصلے پر بادشاہوں کے مقبرے ہیں جو مشرقی میسوپوٹانیا کی ملکہ ہیلینا کے لیے تعمیر ہوئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دین موسیٰ قبول کرنے کے بعد ملکہ اپنے بیٹے ازیتس کے ساتھ شہر قدس آئی اور ازیتس کے بیس بیٹے اس شہر میں آباد ہو گئے۔ ملکہ اور ازیتس ان مقبروں میں مدفون ہیں ان سے کچھ فاصلہ پر مسلمانوں کا قبرستان اور حضرت سلیمانؑ کی بھٹیاں ہیں۔

مقدسی کا "باب التیہ" اور "باب صلوان" آج کل

معدوم ہے لیکن قیاس کیا گیا ہے کہ باب التیہ مجیر الدین کا باب السرب (چور دروازہ) ہے جو کبھی باب صیہون اور باب حبرون کے درمیان ارضی خانقاہ کے قریب کھلتا تھا لیکن آج کل بند ہے۔

باب صلوان، مشرقی دیوار میں آج کا "باب المغاربہ" ہے جسے فرنگیوں نے کوٹھری دروازے کا نام دیا تھا۔ باب البلاط غالباً مجیر الدین کے باب الرمیہ (میدان) کا قدیم نام ہے جو کبھی باب حبرون کے شمال میں شہر پناہ کے مغربی پہلو پر تھا لیکن پچھلی صدی میں اسے بند کر دیا گیا۔ اویسی ۱۱۴۵ء میں باب الرحمہ کا ذکر بھی کرتا ہے جسے مسیحی "گولڈن گیٹ" کہتے ہیں۔ اویسی لکھتا ہے۔

"یہ دروازہ شہر کے مشرقی پہلو پر ہے مگر عام طور پر بند رہتا ہے اور صرف شاخِ زیتون کے میلے کے دن کھولا جاتا ہے۔"

"کتاب زیارات یروشلم" میں او ایچ پیری لکھتا ہے۔

"یہ معبد سلیمانی کے مشرقی دروازے کی جگہ قائم ہے۔ حضرت عیسیٰؑ پام سنڈے کو اس دروازے سے ہیکل میں داخل ہوئے۔ یہ دروازہ ۶۲۹ء میں مقدس صلیب ملنے کی یادگار کے طور پر ہرکولیس نے تعمیر کرایا تھا۔ عہد صلیبی میں یہ دروازہ دو مرتبہ کھلتا تھا۔ ایک مرتبہ پام سنڈے کے جشن کے لیے اور دوسری مرتبہ ۱۴ ستمبر کو مقدس صلیب ملنے کے روز۔ ترکوں نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا لیکن کبھی استعمال نہیں ہوا۔"

اس باب کے باہر ایک محراب بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت مہدی الزماں بعثت کے بعد اس جگہ تشریف لائیں گے۔

پیری مزید لکھتا ہے۔

"اس دیوار کا جو حصہ مسجد اقصیٰ سے ملحق ہے۔ اس جگہ ایک مینار سے سینٹ جیمز کو گرا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ مجیر الدین کے باب الداعیہ کی آج کل نشاندہی ممکن نہیں ہے۔ البتہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ باب ہیرود سے کسی قدر مغرب میں ہوگا۔"

آگے چل کر پیری، قصر جلود سے متصل باب الحمید کا ذکر کرتا ہے۔ جو ۱۸۸۹ء میں تعمیر ہوا۔ اس کے مطابق "نیا یروشلم" اسی دروازے سے باہر ہے۔ عہد ہیرود میں تھیٹر، سرکس اور جمناسٹک کے مقابلے مغربی دیوار سے باہر میدان میں ہوتے تھے۔ اس دیوار میں آج کل باب السلسلہ ہے۔ مجیر الدین نے خانقاہ ابن عبداللہ کے قریب باب الزادیہ اور شہر کے شمال مشرقی گوشے میں "باب خارہ طور" کا ہونا بھی بیان کیا ہے لیکن آج کل ان کا کوئی نشان نہیں۔

پہاڑیوں اور وادیوں کا شہر

بیت المقدس کو پہاڑیوں اور وادیوں کا شہر کہنا بالکل درست ہے۔ اس شہر کے تین اطراف میں وادیاں پھیلی ہوئی ہیں جنہوں نے اسے ایک عظیم اور منفرد شہر بنا دیا ہے۔ یہاں کیدرون اور ہنوم کی وادیاں خاص طور سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر ان وادیوں کا رخ کسی اور سمت ہوتا تو بیت المقدس یہاں آباد نہیں ہو سکتا تھا۔

یہاں کی وادی ہنوم کتاب مقدس کے مطابق اپنے مالک کائی بن ہنوم سے منسوب ہے۔ ہنوم نے پہلے اس جگہ ڈیرے ڈالے پھر آگے بڑھ کر شہر پر قابض ہو گیا۔ یہاں مسلمانوں کا ایک قبرستان ہے جس کے وسط میں صیہون کا بالائی تالاب جسے اب "برکتہ المیلہ" کہا جاتا ہے۔ واقع ہے۔ پھر اترائی میں چوتھائی میل کے فاصلہ پر صیہون کا زیریں تالاب یعنی "برکتہ السلطان" واقع ہے۔

وادی میں ایک سمت اونچی ڈھلوان چٹانیں ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جن میں پتھر تراش کر مزارات بنائے گئے ہیں جنہیں بادشاہوں کے مقبرے کہا جاتا تھا۔ آج کل ان عمارتوں کو ملازمین کی رہائش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں سے باب دمشق ایک میل سے بھی کم فاصلے پر ہے۔

''یروشلم''

اسلامی دور حکومت سے پہلے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں یروشلم اپنی سلطنت کا صدر مقام رہا ہے لیکن عہد اسلامی میں اس کی یہ حیثیت ختم کر دی گئی تھی۔ خلیفہ حضرت عمرؓ نے جب شام کی انتظامی تقسیم کی تو بیت المقدس، جند فلسطین کا حصہ بنا۔ فلسطین، شام کا ایک صوبہ تھا لیکن اہل شام ''جند'' کو فوجی اضلاع کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ عہد فاروقی میں جند فلسطین میں میدان عکہ کے جنوب میں خلیج اردن اور بحر لوط تک کا سارا علاقہ شامل تھا۔ اس جند کی مغربی سرحد پر سمندر، جنوب میں دشت تیہ اور مصر کا راستہ حد بندی کرتا تھا۔ اموی دور حکومت میں جند فلسطین کی حدود میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی البتہ عہد سلیمان بن عبدالمالک میں اس کا دارالحکومت الرہا سے رملہ تبدیل کر دیا گیا۔ رملہ، سلمان نے ہی بسایا تھا۔ عہد عباسیہ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی مگر جب صلیبی قابض ہو گئے تو ایک بار پھر سیاسی حیثیت اور اہمیت اختیار کر گیا اور اسے یروشلم کی ریاست کا دارالحکومت بنایا گیا۔

چودھویں صدی عیسوی میں ابوالفدا نے الجفار اور تیہ کو بھی اس کے ماتحت اضلاع میں شامل کر دیا۔ رفع سے اسکلون تک اس کی لمبائی ایک سوار کم از کم دو روز میں طے کرتا ہے اور اس کی چوڑائی یافہ سے اریحا تک طے کرنے کے لیے بھی اتنا ہی وقت لگتا ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ جند فلسطین میں زغر اور دیار قوم لوط الجبال اور الشراہ تک کا علاقہ شامل ہے۔

اسی طرح اصطخری کے مطابق ولایت شام میں فلسطین میں سب سے زرخیز ہے۔

تیرھویں صدی میں یاقوت نے یروشلم کو ولایت فلسطین کا دارالحکومت لکھا ہے۔

سیوطی کا بیان ہے کہ فلسطین کا صدر مقام ایلیا (بیت المقدس) رملہ سے اٹھارہ میل پر واقع ہے۔

ترکمان عثمانی کے دور میں ولایت فلسطین کے پاشا (لیفٹیننٹ گورنر) کے اکثر دفاتر یہیں تھے اور جب اسے برطانیہ کا ذیلی علاقہ قرار دیا گیا تو برطانیہ نے اس کے انتظام کے لیے جنرل مقرر کیا۔

۱۹۴۸ء کی جنگ کے بعد یہ شہر اور فلسطین کے دوسرے علاقے مملکت ہاشمیہ اردن کا حصہ بنے۔

شرعی حیثیت

کلام پاک میں بیت المقدس یا یروشلم وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ تو کہیں ذکر نہیں بلکہ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

''پاک ہے وہ رب جو لے گیا اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف جس کے گرد ہم نے برکت نازل کی ہے تاکہ ہم اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ تحقیق وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔''

یہاں مسجد الحرام سے خانہ کعبہ اور اس کے آس پاس کی جگہ یعنی صحن اور مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے۔ اور قرآنی آیات میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ وہی واقعہ معراج مبارک ہے جس سے ہر مسلمان واقف ہے۔

محققین کے نزدیک ہجرت سے ایک سال پیشتر رجب کی ۲۷ تاریخ کو (واقعہ معراج) پیش آیا۔ مسجد اقصیٰ حضرت سرور کائنات ﷺ اور مسلمانوں کا پہلا قبلہ بھی رہ چکی ہے۔ اس کے گرد و پیش اللہ تعالیٰ نے

برکتیں نازل فرمائیں، وہ دینی بھی ہیں اور دنیاوی بھی جیسے کہ صاحب روح البیان نے اس کی تصریح کرتے ہوئے لکھا:۔

''بیت المقدس کے گرد دین و دنیا کی برکتیں نازل کی ہیں کہ وحی اور فرشتوں کے اترنے کا مقام اور انبیاءؑ کی عبادت گاہ اور انبیاءؑ کا قبلہ ہے..... اور قیامت کو مخلوق اس سرزمین میں محشور ہوگی (حساب کتاب دے گی)۔ اور ہر طرف نہریں اور باغات اسے گھیرے ہوئے ہیں۔''

اس نواح میں خدا کا مظہر تجلی جبل طور اور ایسی ہی مقدس وادیٔ طویٰ ہے جن کا مندرجہ ذیل آیات میں عزت و احترام کے ساتھ ذکر ہے۔

جب موسیٰؑ نے مدت پوری کر لی اور اپنی اہلیہ کو لے کر چلے گئے، طور کی جانب ایک آگ دیکھی۔ اپنی اہلیہ سے فرمایا۔

''ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید میں اس کے پاس سے کوئی چیز یا چنگاری لے آؤں تاکہ تم تاپ لو۔''

پھر جب آگ کے پاس گئے تو برکت والی زمین میں وادی ایمن کے کنارے درخت کی طرف سے آواز آئی۔

''اے موسیٰ! بے شک میں ہوں اللہ۔ ربّ سارے جہانوں کا۔''

یہ وادیٔ طویٰ وہی مقدس وادی ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتے اتارنے کا حکم دیا گیا تھا۔

''جب موسیٰ نے آگ دیکھی تو اپنی اہلیہ سے کہا تھا کہ بلاشبہ میں نے آگ دیکھی ہے شاید کہ میں تمہارے پاس اس سے انگارہ لے آؤں یا کوئی راہ بتانے والا مل جائے۔''

پھر جب آگ کے قریب آئے تو پکارے گئے۔

''اے موسیٰ! میں تمہارا پروردگار ہوں۔ پس اتار دو دونوں جوتیاں اپنی۔ بے شک تم مقدس وادیٔ طویٰ میں ہو۔''

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جس وادیٔ طویٰ کا ذکر ہے۔ یہ فلسطین کی وادی ہے جو یکے بعد دیگرے دو مرتبہ پاک و مقدس کی گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتیاں اتارنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ ان کے تلوے اس پاک و مقدس زمین سے مس ہو کر برکت حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:۔

''اور جب کہا ہم نے داخل ہو تو اس گاؤں میں۔ پس کھاؤ اس سے جہاں سے چاہو تم بافراغت اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہو بخشش مانگتے ہیں ہم۔

بیضادی کہتے ہیں:

''یہ گاؤں جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے ساتھ داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ بیت المقدس (یروشلم) تھا۔

قرآن کہتا ہے:۔

''یا مانند اس شخص کے کہ گزرا اوپر ایک گاؤں کے اور وہ گرا ہوا تھا اوپر چھتوں اپنی کے۔ کیونکہ زندہ کرے گا اللہ پیچھے موت اُس کی کے۔''

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت الیاسؑ یا حضرت خضرؑ نے بیت اللہ کو تباہی کے بعد دیکھا جسے بخت نصر نے تباہ کیا تھا۔ چنانچہ یہ آیت اسی سلسلے میں ہے:۔

''اے قوم! ارضِ مقدس میں جو اللہ پاک نے تمہارے لیے لکھ دی ہے، داخل ہو جاؤ اور پیٹھ دکھاتے الٹے نہ پھرو ورنہ نقصان میں پڑ جاؤ گے۔''

یہ ارضِ مقدس فلسطین کا ہی علاقہ ہے۔ اس پاک سرزمین کے ساتھ مسلمانوں کی دائمی وابستگی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حدیثوں سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

سوائے تین مسجدوں کے اور کسی (مسجد کے لیے) طویل سفر نہ کیا جائے۔ مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی۔"

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجد حرام (کعبۃ اللہ) مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ ایک ہی لڑی کے تین انمول موتی ہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں آیا ہے کہ نبی کریم نے فرمایا۔

"آدمی کے اپنے گھر کی نماز تو ایک نماز ہے۔ مسجد کی نماز پچیس نمازوں کے برابر ہے اور جامعہ مسجد کی نماز پانچ سو نمازوں کے برابر ہے اور مسجد اقصیٰ میں ایک نماز پچیس ہزار (بعض روایت کے مطابق پچاس ہزار) نمازوں کے برابر ہے اور میری مسجد (مسجد نبوی) میں ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔" (ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

صحیح مسلم میں آیا ہے کہ:۔

"پہلے مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے مگر سولہ ماہ نماز پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کریں۔ یعنی جب سے نماز فرض ہوئی اس وقت سے سولہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی جاتی تھی۔ پھر حکم خداوندی کے تحت مسلمان بیت المقدس کے بجائے کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے۔"

اس سے صاف ظاہر ہوا کہ پہلے ہمارا کعبہ، بیت المقدس تھا۔ اس لیے اسے "قبلہ اول" کہا جاتا ہے۔

اسرار اور معراج کا تذکرہ

نبی کریم ﷺ نے معراج سے واپس آنے کے بعد اس کا ذکر اس طرح فرمایا۔

"معراج کی شب میرے پاس براق لایا گیا۔ براق ایک چوپایہ جانور ہے۔ اس کا رنگ سفید، قد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا۔ اس کا قدم حد نظر تک تیرتا تھا۔ میں براق پر سوار ہوا اور بیت المقدس میں آیا۔ براق کو میں نے اس زنجیر سے باندھا جس سے انبیاءؑ اس کو باندھا کرتے تھے۔ پھر میں مسجد میں گیا اور دو رکعت نماز مسجد میں پڑھی۔ پھر میں مسجد سے باہر آیا اور جبرائیلؑ میرے پاس ایک برتن شراب کا اور ایک دودھ کا لے کر آئے۔ میں نے دودھ لے لیا۔ جبرائیلؑ نے کہا۔ "آپ نے فطرت کو اختیار کیا ہے۔" (مسلم شریف)

اسی طرح احادیث اور روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ مسجد اقصیٰ میں انبیائے سابق نے آپ کی متابعت میں نماز ادا کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فتح بیت المقدس کے بعد کہا تھا۔

"اس شہر کے ہم مالک ہیں۔ اور ہم عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کے عیسائیوں اور یہودیوں سے بہتر وارث ہیں۔"

علاوہ اس کے قیامت تک کے تعلق کا یوں پتہ چلتا ہے کہ قرب قیامت کی ایک علامت یہ ہوگی کہ مؤذن قریب سے اذان دے گا (یعنی اس جگہ سے جہاں سے سب سن سکیں۔ حسینؓ کا ارشاد ہے کہ اس قریب مقام سے مراد بیت المقدس ہے۔

بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے بارے میں تفسیر جلالین میں علامہ جمال الدین سیوطی نے اس طرح لکھا ہے کہ۔

"بیت المقدس اعلیٰ عبادت گاہ اور زیارت گاہ ہے۔ یہی وہ اعلیٰ اور برتر مقام ہے جہاں خداوند تعالیٰ نے اپنے فرشتے جبرائیلؑ کو حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجا تھا۔ یوحنا اور زکریا کو بشارت دی تھی۔ حضرت

داؤدؑ کو مسجد اقصیٰ کا نقشہ دکھایا تھا۔ روئے زمین کے کل چرند و پرند کو آپ کے طابع بنایا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پیغمبروں نے قربانیاں دیں۔ حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اور پالنے میں گفتگو فرمائی اور یہاں سے آسمانوں پر اٹھائے گئے۔"

"یاجوج ماجوج"

آپ نے یاجوج ماجوج کا نام تو ضرور سنا ہوگا یہ وہ بلائیں ہیں جو روئے زمین پر قابض ہو جائیں گی مگر یہ بیت المقدس میں داخل نہ ہو سکیں گی۔ کیونکہ بیت المقدس وہ پاک جگہ ہے جہاں یہ بلائیں داخل ہوتے ہی خدا کے حکم سے نیست و نابود کر دی جائیں گی کیونکہ بیت المقدس وہ متبرک مقام ہے جہاں حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاقؑ اور حضرت مریمؑ دفن ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یوم حشر میں تمام بنی آدم دوبارہ زندہ ہو کر فیصلے کے لیے اکٹھا ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے ساتھ مسجد اقصیٰ میں اپنا دربار لگائے گا اور انصاف فرمائے گا۔

مختصر یہ کہ بیت المقدس سیکڑوں انبیاء اور مرسلین کی جائے پیدائش اور ان کا مسکن اور مدفن ہے، اس لیے مسلمان اور مسلمان ہی اس کے مالک ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہیں جو بلا تفریق اور تخصیص تمام انبیاء کرام اور مرسلین پر ایمان لاتے اور انہیں برحق سمجھتے ہیں۔

اب جہاں تک یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ بیت المقدس ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انہیں عطا کی ہے تو اس کی تاریخی حقیقت اور حیثیت یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے تقریباً تین ہزار سال پہلے فلسطین کے علاقوں میں کنعانی قبائل آباد تھے۔ یہ قبائل عرب سے ہجرت کر کے فلسطین پہنچے تھے اور خود فلسطین کا پرانا نام بھی کنعان تھا۔ مزید یہ کہ بارہ سو سال قبل مسیح جب بنی اسرائیل (جنہیں اہل فلسطین عبرانی کہتے تھے) فلسطین میں داخل ہوئے تو عرب قبائل نے ان کی شدید مزاحمت کی اور دو اڑھائی سو سال کی جدوجہد کے بعد ہی وہ فلسطین اور بیت المقدس پر قابض ہو سکے (۱۰۴۹ ق۔م) یہودی بیرونی قوم تھے اور انہیں اس وجہ سے عبرانی کہا جاتا تھا کہ وہ نسل کشی کے مرتکب ہو کر فلسطین پر قابض ہوئے تھے۔ شمالی فلسطین میں وہ صرف پانچ سو سال تک آباد رہے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ اس لیے یہ سرزمین عربوں کی ہے نہ کہ یہودیوں کی۔

"مسجد اقصیٰ، مسجد حرام، مسجد نبوی"

نبی پاک ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے (حصول ثواب کی خاطر) رخت سفر باندھنا چاہیے۔ یعنی مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔ وہ مقدس مقامات (مساجد) ہیں جن کی بدولت یہ مقدس شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کی عقیدت کا مرکز ہے وہ شہر کی مشرقی پہاڑی (موریہ) پر ایک احاطہ میں ہیں جسے اہل اسلام (حرم شریف) کے نام سے پکارتے ہیں اور جو بیت المقدس کا مقدس ترین حصہ ہے۔

ڈاکٹر برکلے کے بیان کے مطابق حرم شریف ۱۳۶ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ مسجد اقصیٰ اور قبلۃ الصخرہ بھی جو صدیوں سے شہر کی عظمت اور تقدس کا نشان ہیں اسی حرم میں ہیں۔ حرم میں جگہ جگہ بلند مقامات ہیں جنہیں مسلمان "محراب" کہتے ہیں۔ مقدس سمجھتے ہیں اور ان کے سامنے نوافل ادا کرتے ہیں۔

قدیم مورخوں نے حرم شریف کی محرابوں اور گنبدوں کا جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ موجودہ حالات سے قطعاً مختلف ہے۔ آج ان میں سے کئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناپید یا مشکوک ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ صلیبیوں نے اپنے ۹۰ سالہ دور میں حرم شریف میں بعض غیر معمولی تبدیلیاں کیں اور تین نسلیں گزرنے کے بعد جب صلاح الدین ایوبی نے اسے بحال کرایا تو اکثر مقامات غائب اور روایات محو ہو چکی تھیں۔

"حرم شریف"

ابن الفقیہ نے ۹۰۳ء میں لکھا ہے کہ حرم شریف کی لمبائی ایک ہزار اور چوڑائی سات سو درع ہے۔اس کی عمارتوں میں چار ہزار چوبی شہتیر، سات سو سنگی ستون اور پانچ سو پیتل کی زنجیریں ہیں۔ہر رات ایک ہزار چھ سو فانوس روشن ہوتے ہیں اور ان کے لیے ایک سو چالیس (۱۴۰) غلام مامور ہیں۔ہر ماہ ایک سو قسط (سوا تین سیر کی ایک قسط) روغن زیتون خرچ ہوتا ہے۔حرم شریف کے اندر سولہ بڑے صندوق ہیں جو کلام پاک کے نسخوں سے بھرے ہوئے ہیں۔وضو کرنے کے لیے چار حوض اور وعظ دینے والوں کے لیے پانچ منبر ہیں۔مسجد اور گنبدوں کی چھتوں پر مٹی کی بجائے جست کی ۴۵ ہزار چادریں چڑھائی گئی ہیں۔ مسجد کے اندر مستورات کے لیے ستر گز لمبے تین عدد مقصورے ہیں۔حرم شریف کے اندر باہر کے تمام دروازوں کی تعداد پچاس ہے۔

ایک اور مورخ ابن ابدریہ دس سال کے بعد یہ لکھتا ہے کہ:۔

"حرم شریف کی عمارتوں میں ڈیڑھ ہزار فانوس روشن کیے جاتے ہیں۔دروازے پچاس اور ستون ۶۸۴ ہیں۔صحرہ کے اندر تیس اور باہر اٹھارہ ستون ہیں۔گنبد پر جست کی ۳۳۹۲ چادریں ہیں جن پر پیتل کی ۱۰۲۱۰ صیقل کی ہوئی تختیاں جڑی ہیں۔اس رقبہ میں روشنی کے لیے ۴۶۴ فانوس روشن کیے جاتے ہیں جو تانبے کی زنجیروں اور کنڈوں سے لٹکے رہتے ہیں۔ہر زنجیر ۱۸ گز لمبی ہے۔بڑی تختی کے چھ قرآن مجید جن کا ہر صفحہ کھال کے پورے قطعہ کا ہے، رحلوں پر دھرے رہتے ہیں۔حرم محترم میں دس محرابیں ہیں اور پندرہ گنبد، چوبیس حوض اور چار مینار اذان کے لیے ہیں۔مسجد، گنبد اور میناروں، سب کی چھتوں پر ملمع شدہ چادریں ہیں۔خدمت کے لیے ۲۳۰ مملوک ہیں جنہیں سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے۔روغن زیتون کا ماہانہ سات سو قسط ابراہیمی (ایک قسط برابر تو پونڈ) مقرر ہیں۔ایک جدید ترین سفرنامے کے مطابق حرم مقدس کی لمبائی ۱۲۰۰ گز اور چوڑائی ۶۶۰ گز ہے۔حرم میں جا بجا زیتون، سرو اور نارنج کے درخت ہیں۔اس کے دروازے ۱۴ ہیں جن میں اکثر بند رہتے ہیں۔

"پیمائش"

مقدسی اور ابن الفقیہ، دسویں صدی عیسوی میں اس کا طول و عرض ۱۵۰۰×۱۰۵۰ فٹ ہے۔ناصر خسرو اور ادریسی ۱۲۰۰×۱۰۸۰ فٹ بتاتے ہیں۔سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتح کے ایک عرصہ بعد ۱۳۵۵ء میں ابن بطوطہ نے ۷۵۲ اور ۴۳۵ گز مالکیہ، صاحب مشیر الغرام نے ۱۳۵۱ء میں ۶۲۸×۴۳۸ گز لکھا ہے۔ جبکہ ۱۴۹۶ء میں مجیر الدین ۴۵۴×۹۱۳ فٹ بتاتا ہے۔جو اس بات کا ثبوت ہے کہ زمانہ قدیم سے دور جدید تک احاطہ حرم کی حدود میں کچھ زیادہ ردو بدل نہیں ہوا۔البتہ ۱۹۷۶ء میں مولانا شیر علی نے اس کا طول وارض ۱۲۰۰×۶۶۰ گز بتایا ہے۔یہ اضافہ شاہ حسین کے عہد میں حرم کی تزئین کے دوران ہوا۔

حرم شریف کے دروازے

(۱) ابن الفقیہ ۔۹۰۳ء باب داؤد، باب خطہ، باب النبی، باب رحمت، باب توبہ، باب اسباب، باب ام خالد (۲) ابن عبدربیہ ۔۹۱۳ء باب رحمہ، باب توبہ، باب داؤد، باب حطہ، باب محمد، ابواب الاسباط (چھ عدد) باب ہاشمی، باب ام خالد (۳) مقدسی۔ ۹۸۵ء باب داؤد، باب حطہ، باب النبی، ابواب مریم، ابواب رحمہ، باب برکہ نبی، باب اسرائیل، ابواب ہاشمیہ، باب الولید، باب ام خالد، باب السکینہ (۴) ناصر خسرو ۔۱۰۴۷ء باب داؤد، باب حطہ، باب النبی، باب عین الصوان، باب رحمہ، باب توبہ، باب الاسباط (۵ عدد) باب زوایائے صوفیہ (۵) مجیر الدین ۔ ۱۴۹۶ء باب السلسلہ، باب النبی، باب الاقصیٰ قدیم، باب الرحمہ، باب الحطہ، باب التوبہ، باب الدواریہ (۶) لی سٹرینج ۔۱۸۹۰ء باب السلسلہ، باب النبی، باب البراق، باب حمہ، باب التوبہ، باب الحطہ، باب العتم، باب شرف الانبیاء

نوٹ:۔

۱۔ ابواب مریم، باب عین الصلوان، صلاح الدین ایوبی نے تیغہ کرادیا۔

۲۔ باب الوادی، وادی جہنم کی طرف کھلتا تھا اور باب التوبہ کے قریب تیغا کیا ہوا آج بھی موجود ہے۔

ان اختلافات کی اصل وجہ یہ ہے کہ حرم شریف کے اطراف و جوانب میں مختلف ادوار میں بہت کچھ ردو بدل ہوا مثلاً۔

ا۔ محاربین صلیبی حکومت کے زمانے میں

ب۔ مسلمانوں کی دوبارہ تسخیر کے وقت

ج۔ سلطان سلمان کے سولہویں صدی میں دوبارہ تسخیر کے وقت چہار دیواری کو ازسرنو تعمیر کیا گیا تو ان کے نام بدل دیئے گئے۔

ابن فقیہ، ابن عبدربہ، ناصر خسرو اور مقدسی کے "باب حطہ" کا نام اس وقت "باب البراق" یا "باب النبی محمد" ہے۔جس کا آدھا حصہ زمین کے اندر ہے۔ ناصر خسرو نے اس سلسلے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اس دروازے سے حرم شریف میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا جبکہ مقدسی، ابن الفقیہ اور ناصر خسرو کے باب النبی اور ابن عبدربیہ کے باب محمد کو تیغا کر کے بند کر دیا گیا ہے۔

ناصر خسرو نے اس دروازے کے بارے میں لوگوں کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ کی تعمیر ہے اور نبی کریم ﷺ شب معراج کو اسی دروازے سے گزر کر مسجد اقصیٰ میں تشریف لائے تھے۔یہ دروازہ مکہ معظمہ کی جانب کھلتا ہے۔حرم شریف کے اس زمین دوز راستے کی ڈیوڑھی دوہرے پٹ کے دروازے ہیں۔اس کو زمین دوز بنانے کی وجہ یہ ہے کہ مضافات میں جو لوگ رہتے تھے وہ لوگ شہر کے دوسرے محلوں کا چکر لگائے بغیر حرم شریف میں آسکیں۔لیکن اس مقام پر زمین دوز حجرے آج بھی نظر آتے ہیں جو مجیر الدین کے عہد میں "الاقصیٰ القدیمہ" کہلاتے تھے اور ان حجروں کے سروں پر ایک دوہرا پرانا دروازہ موجود تھا۔

ناصر خسرو کا "باب العین صلوان" محراب مریم کے قریب واقع تھا۔سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو مغرب اور شمال کی سمت سوائے حرم میں آنے جانے والے تمام راستے بند کر دیے اور ان دروازوں پر بھی تیغا کرا دیا گیا۔ابن الفقیہ کا باب الوادی، حرم شریف کے مشرقی جانب وادی جہنم کی طرف کھلتا تھا اور قبتہ الصخرہ کے چبوترے کے براق کا زینہ اس کے مقابل تھا۔

بعض لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ شب معراج اسی دروازے سے داخل ہوئے۔یہ "باب البراق" اور "باب الخبائز" بھی کہلاتا اور باب الذہب سے ذرا مغرب کی طرف ہٹ کر حرم کی دیوار کے اس حصے میں اب بھی تیغا کیا ہوا موجود ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابن الفقیہ اور ابن عبدربہ کا باب الرحمت اور مقدسی کے باب الرحمہ، ناصر خسرو کے باب توبہ، باب رحمہ، مشرقی دیوار کے وہ بند چھتے ہیں جنہیں فرنگی گولڈن گیٹ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مگر مسلمان آج بھی انہیں باب الرحمہ اور باب التوبہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ باب توبہ کے بارے میں ناصر خسرو نے لکھا ہے کہ یہی وہ دروازے ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کی توبہ قبول فرمائی تھی۔ ناصر کے عہد میں اس کے قریب ایک مسجد بنی ہوئی تھی اور آج کل اس کی جگہ "کرسیٔ سلیمان" ہے۔

سیوطی نے باب الرحمہ کے بارے میں لکھا ہے کہ مسجد اقصیٰ کے مشرق کی طرف اس دیوار میں واقع ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے یوں ذکر کیا ہے۔

"اس کے سامنے کی وادی کو "وادی جہنم" کہتے ہیں۔ خود یہ دروازہ یعنی باب الرحمہ حرم شریف کی چہار دیواری میں اندر کے رخ پر ہے۔"

اس آیت میں جس دروازے کی طرف اشارہ ہے اسے بند کرادیا گیا ہے۔

اب رہا باب التوبہ یہ باب الرحمت سے مل کر ایک ہی دروازہ بن جاتا ہے لیکن ان دونوں دروازوں میں سے آج کل کسی میں بھی آمد و رفت نہیں۔ باب التوبہ کے قریب اور باب الرحمہ الاسباط کے درمیان حضرت خضرؑ اور الیاسؑ کا مسکن ہے۔ یہ دروازہ چھٹی صدی عیسوی میں تعمیر ہوا اور صلیبیوں نے اسے گولڈن گیٹ (باب الذہب) کا نام دیا۔

اب رہا مقدسی کا باب سرکہ بنی اسرائیل اور ناصر خسرو کا "باب الابواب" محاربات صلیبیہ کے بعد سے باب الاسباط کے نام سے مشہور ہے اور حرم شریف کی شمالی دیوار کے مشرقی سرے اور مسکن خضرؑ اور الیاسؑ کے قریب ہی واقع ہے۔

مقدسی، ابن الفقیہ، ابن عبدربہ کا باب الاسباط اور ناصر خسرو کا باب الابواب حرم کے مغرب میں شمالی دیوار کو لے جانے والا دروازہ ہے جو محاربات صلیبیہ سے اب تک باب الحطہ کے نام سے موسوم ہے۔

سیوطی لکھتا ہے:۔

"اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اس دروازے سے حرم شریف میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا۔ مقدسی کا ابواب ہاشمیہ، ابن عبدربہ کا باب الہاشمی، ناصر خسرو کا باب زوائے صوفیہ اور مجیر الدین کا باب الدیواریہ، آج کل باب صوفیہ یا باب شرف الانبیاء کہلاتا ہے۔

سیوطی کہتا ہے:۔ "یہ حرم کے شمالی رخ سے کھلتا ہے۔"

مقدسی اور ابن عبدربہ کا باب الولید، اس زمانہ کا باب الغواغہ ہے جو مغربی دیوار کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ سیوطی اسے باب الخلیل بھی کہتا ہے۔ لیکن مقدسی کے بیان کے مطابق باب الخلیل یا باب ابراہیم باب الولید سے آگے جنوب کا دروازہ تھا جسے ناصر خسرو نے باب السقر لکھا ہے اور آج کل باب الناظرہ کہلاتا ہے۔

سیوطی لکھتا ہے:۔

باب الناظر کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کبھی نہیں کھلا۔ پہلے زمانہ میں اسے باب میکائیل کہتے تھے اور ایک خبر کے مطابق حضرت جبرائیل نے شب معراج کو اسی دروازے پر براق کو باندھا تھا۔ باب الحدید، سلطان صلاح الدین نے حرم شریف کی موجودہ مغربی دیوار میں باب الناظر کے جنوب میں بنایا تھا۔ کسی زمانہ میں اسے باب ارغون الکاملی بھی کہا جاتا تھا۔ مقدسی اور ابن الفقیہ کا باب اُم خالد، موجودہ باب القطانین (پنبہ خروشاں) ہے۔ باب القطانین ان دروازوں میں ہے جنہیں از سرنو بنایا گیا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب سے پہلے اسے الممالک النصر بن قلادون نے تعمیر کیا تھا لیکن بعد میں گر کر بے کار ہو گیا اور تنکیر الہاشمی الناصری والی شام نے سلطان محمد ابن قلادون کے حکم سے دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ اس کے جنوب میں مڑتے ہی باب التوضیٰ (طہارت) یا باب المطارہ (بارش) ہے۔ موجودہ ڈیوڑھی مرحوم علام الدین بصیر نے بنائی تھی۔

مقدسی اور ناصر خسرو کا باب داؤد موجودہ باب السلسلہ ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت داؤد اسی راستے حرم میں تشریف لاتے۔ باب السلام یا باب سکینہ اسی دروازے کے قریب بنا ہوا ہے۔ موجودہ دور میں ۱۹۶۷ء حرم کے چودہ دروازے ہیں۔ ان میں سے بہت سے مقفل ہیں۔ صرف شمالی جانب دو دروازے کھلے رہتے ہیں۔ اردن کی فوجی چھاؤنی اسی طرف دیوارِ حرم کے ساتھ تھی۔

دالان:

حرم مبارک کے اندر چہار دیواری کے ساتھ ساتھ جو حرم بنے ہوئے ہیں وہ مسلمانوں کے ابتدائی عہد میں بھی اسی حالت میں اسی جگہ موجود تھے۔ یہ دالان مغربی اور شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ ہیں۔ جبکہ وادی جہنم کے رخ پر مشرقی دیوار میں جس میں باب الرحمہ بنا ہوا ہے کوئی دالان نہیں نہ اس کے جنوبی حصہ میں کوئی دالان ہے۔

مغربی چہار دیواری کے اندر تمام کے تمام دالان الممالک الناصر ابن قلادون کے عہد ۱۳۱۰ء تا ۱۳۴۱ء کی تعمیر ہیں۔

باب مغاربہ موجودہ باب النبی کے قریب سے باب السلسلہ تک کا دالان ۱۳۱۳ھ میں باب السلسلہ کے قریبی مینار سے باب الناظرہ کا دالان ۷۳۷ھ میں اب الغوانمہ تک بنایا گیا۔

شمالی دیوار سے ملحقہ دالان ان عمارتوں کے ساتھ تعمیر ہوئے جو ان میں سے ہر ایک ساتھ بنی ہوئی ہے۔

اس کے بعد ان کی وقفہ وقفہ سے مرمت ضرور ہوتی رہی لیکن مجموعی طور پر بالکل اسی حالت میں ہیں جیسے کہ ۱۴۹۶ء میں تھے۔

"مسجد اقصیٰ"

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لیے رختِ سفر باندھنا چاہیے۔ ایک مسجد حرام، دوسری مسجد اقصیٰ اور تیسری مسجد نبوی، یہ ایک ایسی حدیث ہے جسے تمام مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ بیت المقدس کا مقدس ترین حصہ "حرم شریف" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ حرم شریف ۱۳۶ ایکڑ کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ مسجد الاقصیٰ اور قبۃ الصخرہ اسی حرم میں ہیں۔ حرم شریف میں جگہ جگہ بلند مقامات ہیں جنہیں ہم مسلمان "محراب" کہتے ہیں۔ مقدس سمجھتے ہیں اور ان کے سامنے نوافل پڑھتے ہیں۔

آج ان محرابوں اور گنبدوں میں سے کئی ناپید یا مشکوک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلیبیوں نے اپنے نوے سالہ دور میں حرم مقدس میں بہت سی تبدیلیاں کر دی ہیں اور جب تین نسلیں گزرنے کے بعد صلاح الدین ایوبی نے اسے بحال کرایا تو اکثر مقامات غائب ہو چکے تھے۔

مسلمانانِ عالم کو دنیا کے تین شہر اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ ان میں ایک مکہ شریف، دوسرا مدینہ شریف اور تیسرا بیت المقدس ہے اور بیت المقدس کو اپنے سینے پر مسجد اقصیٰ رکھنے کا فخر حاصل ہے۔

اقصیٰ کے معنی دور کے ہیں۔ پس مسجد اقصیٰ کے معنی دور کی مسجد ہوا۔ یہاں مسجد سے مراد بیت المقدس کے حرم مقدس کا پورا رقبہ ہے۔ شب معراج

کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ ایک پردار گھوڑے (براق) پر سوار ہو کر حضرت جبرائیل کے ساتھ مکہ معظمہ سے طور سینا گئے۔ وہاں سے بیت لحم پہنچے اور پھر بیت المقدس تشریف لائے۔

رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

"ہم جس وقت بیت المقدس کے دروازے پر پہنچے تو جبرائیل نے مجھے براق سے اتارا اور براق کو ایک کنڈی سے باندھ دیا جس سے انبیائے سابق نے بھی اپنے گھوڑے باندھے تھے۔"

پھر نبی کریمؐ بابِ محمد میں داخل ہو کر اس چٹان پر چڑھے جسے قبۃ الصخرہ کہا جاتا ہے اور جو یہودی روایات کے مطابق ہیکلِ سلیمانی کے وسط میں تھی۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں مذبح تھا۔ اس کے قریب ہی آپ کی ملاقات انبیائے کرامؑ کی جماعت سے ہوئی۔ حضور پاکؐ نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے انبیائے کرام کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔

اسی مقدس چٹان سے نبی کریمؐ ایک نور کے زینے سے آسمان پر چڑھے اور جنت الفردوس اور اس کی نعمتوں کو دیکھا۔ پھر ہفت افلاک طے کر کے حضور حق تعالیٰ میں پہنچے اور وہاں احکام صلوٰۃ ملے۔ اس کے بعد دوبارہ زمین پر تشریف لائے اور اُسی نور کے زینے سے اتر کر صخرۂ مقدسہ پر قیام فرمایا۔ پھر جس طرح تشریف لائے تھے۔ اسی طرح براق پر واپس ہوئے اور رات ختم ہونے سے قبل مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

یہ معراج کی رات کا خلاصہ ہے۔ اس روایت نے اہل اسلام کے لیے اس چٹان اور حرم مبارک کے رقبہ کو مبارک اور متبرک بنا دیا ہے۔

یہودی روایت

جس جگہ آج مسجد اقصیٰ واقع ہے۔ یہودی روایت کے مطابق اس جگہ کبھی "ہیکل سلیمانی" قائم تھا۔ اس ہیکل سلیمانی کو شاہ بابل بخت نصر نے چھٹی صدی ق۔م میں مسمار کر دیا تھا۔ بابل سے واپسی پر یشوع اور زورد نے ہیکل کو دوبارہ تعمیر کیا لیکن یہ عمارت بھی رومی حملہ آوروں کی یلغار سے تباہ و برباد ہو گئی اور یہودیوں کو شہر سے نکال دیا گیا۔

اس کے ایک زمانہ بعد یہودی پھر شہر میں آباد ہوئے اور ہیرود اعظم کے زمانہ میں اس شہر نے بہت ترقی کی۔ یہاں کئی نئی عمارتیں بنائی گئیں اور یہودیوں کی خوشنودی کے لیے ہیکل سلیمانی از سر نو تعمیر ہوا لیکن یہ ہیکل بھی ۷۰ء میں رومی حکمراں طیطس نے یروشلم کے ساتھ ہی تباہ و برباد کر دیا۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کے خیال کے مطابق موجودہ "دیوار گریہ" حضرت سلیمانؑ کے ہیکل کی دیوار نہیں بلکہ یہ عمارت ماندہ کے آثار کا حصہ ہے جسے ہیرود نے تعمیر کرایا اور بعد میں جسے رومیوں نے برباد کر دیا۔

سلجوق خاندان:

عرب مؤرخین صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ صلیبیوں نے سلجوقی خاندان کے مظالم کی جتنی بھی داستانیں بیان کی ہیں وہ سراسر جھوٹ اور محض افسانے ہیں اور مغربی مؤرخین نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آل سلجوق نے عیسائی سلطنت کے سرحدی حملوں سے تنگ آ کر بعض جوابی کارروائیاں کی تھیں جنہیں عیسائیوں نے بہت محسوس کیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ آل سلجوق جنگجو تھے۔ وہ وسط ایشیا سے اٹھے اور طوفان کی طرح دوسرے ممالک پر چھا گئے تھے۔ سلطان الپ ارسلان اور اس کے عظیم بیٹے ملک شاہ نے ایشیائے کوچک سے رومیوں کے اقتدار کو ختم کر دیا تھا۔ رومی شہنشاہ الیکس اپنے زخم چاٹ رہا تھا اور بدلہ لینے کے موڈ میں تھا کہ مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ ملک شاہ کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے سلجوقی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔

ملک شاہ کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے موقع پر رومی شہنشاہ نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس نے یورپ کے جنگ بازوں کے نام پیغام بھیجا اور پوپ کے سامنے فریاد کی اور انہیں مذہب کے نام پر ارضِ مقدس اور آثار مسیح کی حفاظت کے لیے برانگیختہ کیا۔ خاص طور سے یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مسلمانوں کا مقصد عیسائی مذہب کو مٹانا ہے۔ پوپ نے فوراً ہلاسینا اور کلیر مونٹ میں یکے بعد دیگرے دو اجلاس کیے۔ ان اجلاسوں میں مکار پیٹر نے خصوصیت سے شرکت کی۔ اس کی پیشین گوئیوں سے متاثر ہو کر تمام حاضرین جلسہ نے اپنے شانوں پر کپڑے کی بنی ہوئی صلیب لگائی اور..... ''خدا کی مرضی یہی ہے..... خدا کی مرضی یہی ہے۔'' کی پکار لگاتے ہوئے بیت المقدس کو چھڑانے کی قسم کھائی۔ فوج کی روانگی ۱۰۹۶ء میں اس دن قرار پائی جس دن عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت مریمؑ آسمان پر تشریف لے گئی تھیں۔ عیسائی مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ''صلیبی جنون'' لوگوں میں اس طرح پھیلا کہ پوری عیسائی دنیا اس جنون میں گرفتار ہو گئی۔ لوگوں کو جنت کی خوش خبری، مال کا لالچ، زرخیز زمینوں پر قبضہ کا تصور..... ان باتوں نے عیسائیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غیظ و غضب بھر دیا۔ راہبوں نے اسے غنیمت جانا کیونکہ انہیں خانقاہوں کی سخت زندگی سے نجات ملنے کی امید بندھ گئی۔ وہ گلی گلی پکارتے پھرتے تھے کہ۔

''صلیب پہننے والوں کو قرضوں اور ٹیکسوں سے چھٹکارا مل جائے گا اور وہ عیسائیت کا محافظ کہلائے گا۔''

یہ جنون صرف یورپ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ دور دراز کے جزیروں تک پہنچ گیا۔ اس لیے کہ عیسائیوں نے اعلان کر دیا تھا۔

''اے نوجوان سپاہیو! تم تو اپنے نیزوں سے شکست دو گے۔ اور ہمیں اپنے دکھ درد کی وجہ سے فتح میں شریک ہونے کا موقع دو۔''

اس کے نتیجے میں تیرہ لاکھ عیسائی فلسطین پر قبضے کے لیے چڑھ دوڑے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پورا یورپ ایشیا پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ ان مقدس محاربین نے ہنگری اور بلغاریہ میں شدید لوٹ مار کی۔ قسطنطین کی بیٹی کا بیان ہے کہ ان خونی محاربین کے سامنے جو بچہ آتا یہ اس کی تکا بوٹی کر ڈالتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ مقامی لوگوں سے لڑتے جھگڑتے قسطنطنیہ پہنچے۔ اس وقت قیصر الیکس نے انہیں ایشیائے کوچک کی طرف دھکیل دیا۔ یہاں ان کی درندگی اور بڑھ گئی لیکن والیِ قونیہ، فاتح ارسلان سلجوقی نے انہیں جانوروں کی طرح قتل کرا دیا۔

پھر ۱۵ اگست ۱۰۹۶ء کو یورپی حکومتوں کی باقاعدہ افواج ایشیا کے ساحل پر اتریں۔ ان میں فرانس، برطانیہ، اٹلی، سسلی اور جرمنی کی فوجیں شامل تھیں۔ ان کی قیادت گاڈفرے رئیس بولون، ہیوغ اعظم ریمنڈ کاؤنٹ ٹولوز، رابرٹ نارمنڈی اور بیگو آف وریمنڈا جیسے سالار کر رہے تھے۔ فوجوں کی تعداد تقریباً دس لاکھ تھی۔ صلیبیوں نے قونیہ کا محاصرہ کیا۔ سلطان امیر ارسلان نے مقابلہ کیا مگر شکست اٹھانا پڑی۔ قونیہ سے یہ صلیبی محاربین انطاکیہ کی طرف بڑھے۔ امیر فیروز نے غداری کی اور انہیں راستہ دے دیا۔ صلیبی لشکر رات کے وقت شہر میں داخل ہوئے اور رات بھر مسلمانوں کا قتل عام کرتے رہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مکانات تک مسمار کر دیے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس قتل عام میں دس ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

اس کے بعد یہ فوجیں معرۃ النعمان پہنچیں اور اسے فتح کر کے تین دن تک قتل عام کرتی رہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہاں ایک لاکھ آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ پھر سپہ سالار افضل بدر جمالی نے القدس پر چڑھائی کر دی۔ چالیس دن کے محاصرے کے بعد شہر فاطمیوں کے قبضہ میں آ گیا اور افتخار الدولہ حاکم شہر بنایا گیا۔ پھر ۱۰۹۹ء میں صلیبی کوہِ صیہون کی طرف سے شہر میں داخل ہو گئے۔ مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لی۔ عیسائیوں نے پہلے شہر میں قتل عام کیا پھر مسجد کا رخ کیا اور بوڑھے، جوانوں اور بچوں تک کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شہید کر دیا۔ ایک گروہ محراب داؤد میں جا پہنچا۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیے گئے۔ معصوم بچوں کو فصیلوں پر پٹخ پٹخ کر مارا گیا۔ علماء کرام پر تیل اور نفط چھڑک کر جلا دیا گیا۔

ایک بیان کے مطابق صرف مسجد اقصیٰ اور محراب داؤد میں لوگوں کی تعداد سات ہزار سے زیادہ تھی مگر مورخین یہ تعداد ستر ہزار بتاتے ہیں۔ جگہ جگہ لاشوں کے انبار لگ گئے تھے اور صحن میں خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ اس قتل عام کے بعد تیسرے دن مسلمان قیدیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مشہور مورخ اسٹینلے پول لکھتا ہے کہ صلیبی بیت المقدس میں گھس پڑے اور وہاں موجود تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ بچوں کو ٹانگیں پکڑ کر دیوار پر مار مار کر ختم کر دیا گیا۔

ٹینکریڈ نے تین سو قیدیوں کو جان کی امان دی تھی۔ وہ چیختا ہی رہ گیا اور ان قیدیوں کو قتل کر دیا گیا۔ پھر ایک قتل عام ہوا جس میں بچوں، بوڑھوں اور بڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔

شیخ سعدیؒ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ۔

''جو عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے انہیں انسان کہنا، انسانیت کی توہین ہے۔''

اسی طرح ایک عینی شاہد لیانی نے لکھا ہے۔

''ہمارے صلیبی راستوں اور مکانوں کی چھتوں پر دوڑ رہے تھے اور اس شیرنی کی طرح جس کے بچے چھن گئے ہوں۔ قتل عام کر کے خوش ہو رہے تھے۔ بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔

ایک دوسرا شاہد بیان کرتا ہے۔

''بیت المقدس کے راستوں میں ہاتھوں، رانوں کے انبار لگ گئے تھے۔ چلنے کا راستہ نہ تھا۔ چلنے والوں کو لاشوں پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ کسی کا ہاتھ، کسی کا پیر اور کسی کا دھڑ، ایک طوفانِ شیطانی برپا تھا۔ یہ قتل عام آٹھ دن جاری رہا۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے تمام کے تمام قتل کر دیے گئے۔

مسجد اقصیٰ کی چاندی کی چالیس بڑی قندیلیں جن کا وزن ایک سو رطل شامی اور چھوٹی دو سو قندیلیں لوٹی گئیں۔ مسجد اقصیٰ کا مالِ غنیمت اس قدر تھا کہ چھ گاڑیاں بھی بھر جاتیں تو ختم نہ ہوتا۔

اس قتل عام کی اطلاع جب بغداد پہنچی تو اہل بغداد سیاہ ماتمی لباس پہن کر گلیوں میں نکل آئے اور دہائی دی۔

''آہ! بیت المقدس میں تقدیرِ الٰہی نازل ہوئی۔''

خلیفہ المستعصر نے فوج بھیجی جو لڑے بغیر حلوان سے پلٹ گئی۔ مصر نے امیر الجیوش کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا لیکن وہ بھی شکست کھا گیا۔ یہ مصری لشکر بازاری اور ناتجربہ کار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ جب دشمن نے حملہ کیا تو بے جان کھڑا رہا اور دشمن نے آسانی سے اسے قید کر لیا۔ صرف چند سپاہی جان بچا سکے۔

اس المناک واقعہ کے نتیجے میں عیسائیوں نے چار عیسائی سلطنتیں قائم کیں اور ان کا سردار اعلیٰ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گاڈفرے یعنی بیت المقدس کا والی بنایا گیا۔ ان سلطنتوں کے نام یہ تھے۔

۱۔انطاکیہ،۲۔طرابلس،۳۔الرہا،۴۔بیت المقدس

ان کے سردار اعلیٰ یعنی گاڈفرے نے اپنا لقب ''محافظ قبر مسیح'' رکھا مگر وہ کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۸ جولائی ۱۱۰۰ء میں مر گیا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی بالڈوین الرہا سے آ کر اس کا جانشین بنا۔ وہ اپنی جگہ الرہا میں اپنے بیٹے بالڈوین برگ کو تخت نشیں کر آیا تھا۔ عربی تاریخ میں اسے بردویل لکھا جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس پر قبضہ کے بعد جو بھی عیسائی لشکر برابر آتے رہے لیکن مسلمان ان کے مقابلہ میں کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر سکے۔ ادھر فاطمی خلافت بھی دم توڑ رہی تھی۔ پورے عرب میں بے شمار خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں جو آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ عیسائی ان ریاستوں پر قبضہ کر کے انہیں مسلمانوں سے خالی کرا لیتے تھے اور یہ مسلمان جنگل اور پہاڑوں میں پناہ لیتے تھے۔

لیکن ان مشکلات کے زمانہ میں بھی مسلمانوں کا ایمان چٹان کی طرح مضبوط رہا۔ انہیں یقین تھا کہ مصائب کے یہ دن عارضی ہیں اور جلد ہی پھر وہ وقت آ جائے گا جب مسلمان کھلے عام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیم کو عام کر سکیں گے اور اس یقین کو عملی صورت میں پیش کرنے کے لیے بہت سے دل اور ایمان والے کمر کس کے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کفر کی بجلیوں کا منہ پھیر کے رکھ دیا۔ ایسے ہی شجاع اور ایمان والے لوگوں میں ریاست موصل کے والی اتابک عماد الدین زنگی کا نام سب سے اوپر ہے۔ چنانچہ عماد الدین زنگی نے عیسائیوں کی ایک زبردست ریاست ''الرہا'' کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ الرہا کی شکست سے پورے یورپ اور عیسائی دنیا میں کہرام مچ گیا۔ چنانچہ پاپائے روم نے عیسائیوں کو نہ صرف شرم و غیرت دلائی بلکہ ان کے اندر اس قدر اشتعال پیدا کر دیا کہ وہ ایک بار پھر مسلمانوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔

پس ایک طرف سے فرانس کا فرماں روا لوئی سابع اور دوسری طرف سے المانیہ کا کنراڈ ثالث اپنے لشکروں کو لے کر بیت المقدس کی طرف بڑھے۔ پہلے کنراڈ اپنے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کے مقابل ہوا لیکن مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہو گیا۔ اس کے شکست خوردہ لشکری بھاگے تو انہیں فرانسیسی لشکر آتے ہوئے مل گیا اور یہ بھگوڑے ان کے ساتھ ہو گئے۔ مگر جب مسلمانوں کا سامنا ہوا تو دونوں کو ہی خوب مار پڑی اور یہ شکست کھا کر بیت المقدس پہنچے۔ یہ ۱۱۴۷ء کا زمانہ تھا۔ دمشق پر مجیر الدین ایق حکمرانی کر رہا تھا۔ اس پر حملہ کیا لیکن عماد الدین زنگی کے دونوں بیٹے سیف الدین اور نور الدین محمود نے انہیں شکست سے دوچار کیا اور یہ پسپا ہو کر بھاگ نکلے۔ یہ دوسری صلیبی جنگ تھی۔

دوسری صلیبی جنگ میں عیسائیوں کا کس قدر نقصان ہوا اس کا حال ایک عینی شاہد کی زبانی سنیے۔

''یورپ کے شہر اور قلعے خالی ہو گئے تھے۔ اس مقدس آگ (صلیبی جنگ) کا ایندھن بننے کے لیے اتنی کثیر تعداد یورپ سے روانہ ہوئی تھی کہ ان کے پیچھے سات عورتوں کے مقابلے میں صرف ایک مرد نظر آتا تھا۔ پھر جب انہیں خبر پہنچی کہ ان کے شوہر، بھائی اور بیٹے اب کبھی واپس نہ آئیں گے تو پورا یورپ نالہ و شیون سے گونج اٹھا۔''

یورپی مورخین کہتے ہیں اور سچ ہی کہتے ہیں کہ دوسری صلیبی جنگ سے یورپ کا سر صرف نیچا ہی نہیں بلکہ بیت المقدس کی لاطینی ریاست بھی کمزور

ہو گئی اور اگر نور الدین کی موت کچھ دن اور مہلت دیتی تو بیت المقدس میں عیسائی سلطنت کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا۔

عماد الدین کا بیٹا نور الدین زنگی ایمان کی دولت سے مالا مال تھا۔ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ ملک شام سے عیسائیوں کو نکال کے رہے گا مگر موت نے اسے مہلت نہ دی اور اس کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

نور الدین زنگی نے اپنی فوج کو منظم کیا اور قرب و جوار کی ریاستوں کو اپنا تابع بنا لیا۔ پھر اس نے شام اور جزیرہ ایک متحدہ ریاست بنائی اور اس نے مصر میں اثر و رسوخ حاصل کیا اور اس کا یہ قدم ہی مستقبل میں مسلمانوں کی خوش بختی کا باعث بنا، اس مجاہد کو ہمہ وقت جہاد کا خیال رہتا تھا مگر اس نے عیاری اور مکاری سے کبھی کام نہیں لیا بلکہ عیسائیوں کو ہمیشہ للکار کر مارا۔

نور الدین زنگی نے عیسائیوں کو جب اور جہاں بھی شکست سے دوچار کیا وہاں وہ ہمیشہ کامیاب اور کامران رہا۔ پھر اس کا ایک نوجوان شمشیر زن یوسف جسے نور الدین زنگی نے زبردستی مصر بھیجا تھا وہ اس قدر خوش بختیوں اور عظمتوں کا مالک ہوا کہ جس کا جواب مسلمانوں کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے سکے گا۔ یہ جواں سال اور جواں عمر اپنی شجاعت، دلیری اور بے مثال بہادری کی بدولت سلطنت مصر کا حاکم ہوا بلکہ وہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام سے اس قدر مشہور ہوا کہ جس کی مثال دنیا مشکل سے ہی پیش کر سکے گی۔ صلاح الدین کے جوہر، نور الدین زنگی کی زندگی میں ہی نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مگر اس کے اصل جوہر در اصل اپنے آقا اور مربی کی موت کے بعد پوری طرح کھل کر سامنے آئے۔ تاریخ اسلام اب تک ''صلاح الدین ایوبی'' کا جواب پیدا نہیں کر سکی۔

قاضی ابن شداد، سلطان صلاح الدین ایوبی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق ان کے رگ و ریشے میں سمایا اور ان کے قلب و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ جہاد ان کا حکم اور ان کی گفتگو کا اول و آخر ہوتا تھا۔ صلاح الدین ہمہ وقت جہاد کی تیاریوں میں خود کو مصروف رکھتے تھے اور اسباب و رسائل کی پرکھ کرتے رہتے تھے۔ اس مطلب کے آدمیوں کی انہیں ہر وقت تلاش رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ جہاد کی ترغیب دینے والے کی تلاش میں رہتے۔ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر اپنی اولاد، اہل خاندان، وطن، مسکن اور تمام ملک کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ انہوں نے سب کی مفارقت گوارا کی اور ایک خیمہ کی زندگی پر قانع رہے۔ کسی شخص کو اگر ان کا قرب حاصل ہوتا تھا تو وہ ان کو جہاد کی ترغیب دیتا اور اس طرح ان کی نظروں میں وقعت حاصل کرتا۔ اس بات کی قسم کھائی جا سکتی ہے کہ جہاد کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد اس مجاہد نے ایک پیسہ بھی جہاد یا مجاہدین کی امداد و اعانت کے علاوہ کسی اور مصرف میں خرچ نہیں کیا۔''

سلطان صلاح الدین کی درد مندی اور ایمان داری کی تصویر قاضی ابن شداد نے ان الفاظ میں بھی کھینچی ہے:۔

''جب سلطان صلاح الدین ایوبی میدانِ جنگ میں ہوتے تو ان کا دل ایک غمزدہ ماں کی طرح دھڑکتا تھا جس نے اپنے اکلوتے بیٹے یا بیٹی کا غم اٹھایا ہو۔ وہ ایک صف سے دوسری صف تک دوڑتے پھرتے اور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے۔ وہ خود ساری فوج میں گشت کرتے اور پکارتے پھرتے۔

''اسلام کی مدد کرو..... اسلام کی مدد کرو۔''

اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے..... شاہی طبیب نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ جمعہ سے اتوار تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سلطان نے صرف چند لقمے کھائے۔ اُن کی طبیعت میدانِ جنگ کے علاوہ کسی اور طرف راغب ہی نہ ہوتی تھی۔

اسی طرح لین پول لکھتا ہے۔

''صلاح الدین نے اپنی تبلیغ کی تمام کوشش اس بات پر صرف کی کہ ایسی اسلامی سلطنت قائم کی جائے جس میں کفار کو ملک سے خارج کرنے کی پوری طاقت ہو۔''

سلطان صلاح الدین ۱۱۷۱ء میں مصر کے وزیراعظم بنے اور اسی سال ستمبر میں فاطمی خلیفہ العاضد کا انتقال ہوا۔ اس کی موت پر صلاح الدین ایوبی نے سلطنت مصر کو عباسی خلافت کے تحت کر دیا۔ بعض شرپسندوں نے ملک میں فساد برپا کرنا چاہا لیکن لیکن صلاح الدین کی عقل و دانش نے ایسی تمام سازشوں کو ناکام بنا دیا۔ شام و مصر متحد ہو گئے اور عیسائی اسکندریہ میں شکست کھانے کے بعد صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس کے نتیجہ میں بارہ سالہ معاہدہ وجود میں آیا لیکن عیسائیوں نے معاہدہ سے انحراف کیا۔ اس کے باوجود سلطان نے کوئی تادیبی یا انتقامی کارروائی نہ کی۔ البتہ مدافعتی جنگیں جاری رہیں۔ لیکن جب سلطان نے نواحی امارتوں پر تسلط پایا تو عیسائیوں پر کاری ضرب لگانے کے انتظامات شروع کر دیے۔

اس بات سے دشمن بھی انکار نہیں کرتے کہ سلطان نے کبھی کسی معاہدہ کے خلاف کوئی قدم اٹھایا۔ اس کے برعکس عیسائی متواتر خلاف ورزیاں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس معاہدہ صلح کی خلاف ورزی کرتے ہوئے الی کرک ارناط نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملے کا ارادہ کیا اور روضہ اطہر کے بارے میں اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے فوجیں حجاز کے ساحل پر اتار دیں۔

ہیرالڈلیم لکھتا ہے کہ اس حملے کا منصوبہ کافی دیر سے اس (ارناط) کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔ وہ اپنے سنگین قلعہ میں بیٹھا جہاز تیار کرواتا رہا۔ جہازوں کے مختلف حصے قلعہ میں بنا کر بحیرہ روم میں پہنچائے جاتے۔ دوست پرور اور سادہ لوح عرب اس پراسرار سامان کو اونٹوں پر لاد کر بحیرۂ روم کے شمال میں پہنچا جاتے۔ وہاں اس نے ان مختلف پرزوں کو جوڑ کر جہاز بنائے اور بحیرۂ قلزم پر مسلمانوں کی بندرگاہ ایکہ کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ یہ بندرگاہ اور علاقہ پچھلے پانچ سو سال سے اسلامی تسلط میں تھا۔

یہ عیسائیوں کی پہلی مدافعت تھی۔ ارناط (ریجی نالڈ) کے صلیبی ایک سال تک قتل و غارت گری میں مصروف رہے۔ یہ بکتر بند اور عباپوش رہزن، پرامن حاجیوں کو لوٹنے کی تاک میں لگے رہتے۔ ایک عرب مورخ لکھتا ہے:۔

''ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔''

پھر ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کے یہ لٹیرے مدینہ منورہ سے صرف ایک دن کے فاصلے تک پہنچ گئے۔ اس مقدس شہر کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی تھی کہ سلطان کو خبر لگ گئی۔ وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے فوراً مسلم بحری بیڑے کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اس بیڑے نے بڑی تیزی سے بڑھ کر ارناط کے لشکر کو جا پکڑا اور شکست دے کر قتل کر دیا یا قید کر لیا۔ یہ ارناط کی خوش قسمتی تھی کہ وہ یہاں سے بچ کر نکل بھاگا۔

عیسائیوں کے اس اقدام نے سلطان کو بہت تکلیف پہنچائی مگر عیسائی اپنی دیدہ دلیریوں اور بدمعاشیوں سے باز نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر سلطان صلاح الدین ایوبی نے کرک کی طرف کوچ کیا۔

پس تیرہ جولائی ۱۱۸۷ء تک حطین کے قریب ایک خونریز جنگ ہوئی جو ۴ جولائی کو شام کے وقت

انجام کو پہنچ گئی۔

اس سلسلے میں ہیرالڈلیم، صلیبیوں کی تباہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے:۔

''حطین کے میدان میں گندم کے ڈھیر کی طرح عیسائیوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ صلیب المصلوب ان سے چھن گئی۔ قیدیوں میں ارناط (ریجی نالڈ) اور شہنشاہ بھی شامل تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے اسے اپنے ہاتھوں جہنم رسید کیا اور اس گستاخِ رسول سے شانِ رسول ﷺ میں گستاخی کا انتقام لیا۔''

فتح کے بعد

پچھلے صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ تین اور چار جولائی ۱۱۸۷ء کو حطین کے میدان میں عیسائیوں نے شکست کھائی تھی اور انہوں نے صلح کی درخواست کی تھی۔ مگر سلطان نے انکار کر دیا تھا اور شرط یہ رکھی تھی کہ اگر عیسائی یہ شہر خالی کر دیں تو انہیں زراعت کے لیے زمین دی جائے گی مگر بڑا پادری اس شرط پر رضامند نہ ہوا اور مسلمانوں نے مجبور ہو کر شہر پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کو پندرہ جولائی ۱۱۹۹ء کو عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا تھا وہ آج بھی یاد تھا لیکن سلطان بار بار کی درخواستوں سے نرم پڑ گیا اور اس نے صلح اس شرط پر کی کہ چالیس دن کے اندر ہر مرد دس دینار، ہر عورت پانچ دینار اور ہر بچہ ایک دینار بطور زرِفدیہ ادا کرے اور شہر سے نکل جائے ورنہ اسے قیدی بنا لیا جائے گا۔

اس شرط کے تحت سلطان کو زرِفدیہ کے تحت تیس لاکھ دینار وصول ہوئے۔ جن لوگوں کے پاس کچھ نہ تھا انہیں بغیر زرِفدیہ ادا کیے چھوڑ دیا گیا۔ ایک عیسائی امیر کی دولت بیت المقدس میں رہ گئی۔ اس کے عوض سلطان نے اٹھارہ ہزار آدمی رہا کر دیے۔

روایت ہے کہ یروشلم کی ملکہ سبیلا شہر سے جاتے وقت سلطان سے ملنے آئی تو اس کی بڑی عزت و تکریم کی گئی۔ ملکہ کے ساتھ اور بہت سی خواتین تھیں جنہوں نے روتے بلکتے بچوں کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ ان خواتین نے درخواست کی کہ ان بچوں کے باپ رہا کر دیے جائیں۔ بس سلطان نے دس ہزار عیسائیوں کو جو زرِفدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ سلطان نے خود ان کا زرِفدیہ ادا کر کے انہیں رہائی دلائی۔

سلطان پادریوں کے ساتھ بہت عزت سے پیش آیا۔ لارڈ رپادری، مسجد اقصیٰ، قبۃ الصخرہ اور کلیسائے مقدس کا مال و متاع لے کر نکلا۔ سلطان نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ غرض یہ کہ سلطان نے عیسائیوں کے ساتھ ایسا شریفانہ سلوک کیا کہ عیسائی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ بقول لین پول، رحم دل سلطان نے صلیبیوں سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ کر کے ان سے ''شریف نائٹ'' کا لقب پایا۔

یروشلم صلیبی دور میں عیاشی، فحاشی اور بدکاری کا مرکز بن گیا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے فتح کے بعد عیسائیوں کو امن و امان دیا اور ان ستر ہزار مسلمانوں کا انتقام نہیں لیا جو ایک صدی قبل اسی بیت المقدس میں ذبح کر دیے گئے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان ہلالی پرچم لہراتا بروز جمعہ بتاریخ ستائیس رجب ۵۸۳ ہجری مطابق اکتوبر ۱۱۸۷ء بیت المقدس میں داخل ہوا اور مقدس مقامات پر صلیبیوں کی جگہ ہلالی پرچم لہرایا۔

مصر میں سلطان کا اقتدار قائم ہوتے ہی فرنگیوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ انہوں نے اس سے مقابلہ کے لیے اندلس اور سسلی کی حکومتوں سے مدد طلب کی تھی لیکن ان کی یہ مدد اس وقت پہنچی جب سلطان بیت المقدس پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس کے باوجود عیسائیوں نے اس مدد کے زور پر دمیاط پر حملہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیا لیکن شکست کھائی۔

مسجد اقصیٰ میں نجاست

بیت المقدس کی فتح کے بعد غازی اسلام سلطان صلاح الدین نے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نجاستوں سے پاک کر کے ان کے فرش اور دیواریں گلاب دمشقی سے دھلوائیں۔ ان مقدس مقامات پر صلیبیوں نے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی خیالی تصویریں بنوا رکھی تھیں۔ انہیں تلف کرنے اور جمعہ پڑھنے کا حکم دیا۔

۴ شعبان ۵۸۳ ہجری کو قاضی محی الدین محمد بن علی الشافعی نے خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔ سلطان چوبیس شعبان ۵۸۳ ہجری تک شہر میں رہا اور بعد نماز جمعہ صلاح الدین صور کی طرف روانہ ہو گیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ صلیبی دور میں فلسطین کی جو اخلاقی حالت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ولیم آف ٹائر کے مطابق سارے فلسطین میں ایک عورت بھی نہیں تھی جسے باعصمت کہا جائے۔ صلیبیوں اور گرجا کے راہبوں کی زندگی میں جو تضاد تھا اس سلسلے میں اس کا بیان ہے کہ عام شہری محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر گرجوں کی دولت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسقف اعظم ہرقلیس کے صندوق سیم وزر سے لبریز تھے۔ وہ دولت کا پجاری تھا اور اس کی زندگی حرص و ہوس کا افسانہ تھی۔

ہیرالڈ کے مطابق جوزمین کلیسا کی ملکیت نہ تھی وہ رفتہ رفتہ ہیکل کے محافظوں جیسی نیم مذہبی اور نیم فوجی جماعتوں کے تصرف میں چلی گئی تھی۔ سرزمین قدس کے یہ خادم اس کے حقیقی مالک بن بیٹھے تھے۔ یہ جماعتیں براہ راست پاپائے روم کے ماتحت تھیں۔ قانون کے مجرم ان کے پاس پناہ لے کر محفوظ ہو جاتے تھے۔ گائی ڈی لوسگنام بیت المقدس کا آخری حکمران تھا۔ اس سے پہلے آٹھ شاہ حکومت کر چکے تھے۔

پھر جب شکست خوردہ صلیبی بیت المقدس سے نکلے تو ان کا ایک گروہ مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ وہ ہر جگہ یہ پیغام دیتا تھا۔

"اے عالم مسیحیت! دشمن یروشلم پر قابض ہو گئے ہیں..... مقدس صلیب کھو گئی ہے..... ہماری فوج برباد ہو گئی ہے۔"

پوری عیسائی دنیا میں آگ لگ گئی۔ پادری اور راہب تمام مسیحی دنیا کا دورہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مقدس باپ کی دہائی دے دے کر لوگوں کو جنگ پر ابھارا۔ بیت المقدس کا اسقف اعظم جس کے ساتھ سلطان نے نہایت فیاضی کا سلوک کیا تھا، فرانس میں ایک تصویر لیے گھوما۔ اس تصویر میں جنگ مسیح کو زخمی حالت میں اور ایک مسلمان کو حملہ کرتے دکھایا گیا تھا۔

آخر یہ آگ بھڑک اٹھی۔ شاہ جرمنی راڈرک نے سلطان کو خط لکھا۔

"اگر بیت المقدس عیسائیوں کے حوالے نہ کیا گیا تو میں اپنی ساری فوجیں لے کر تمہیں سزا دینے پہنچ جاؤں گا۔"

سلطان نے اس خط کا کوئی اثر نہ لیا۔ لیکن یورپ میں ایک خوفناک جنگ کی تیاریاں زور شور سے جاری رہیں۔ اور اس میں ہر عیسائی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حد یہ کہ عورتیں بھی سپاہی بن گئیں اور قیصر جرمنی فریڈرک، شاہ انگلستان رچرڈ اول اور ڈیوک آف آسٹریا اپنی فوجوں اور رضا کاروں کے ساتھ سلطان صلاح الدین کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔ اور یہ تھی تیسری صلیبی جنگ.....!

اس جنگ کی تیاری جس جوش و خروش سے کی گئی اس کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ جنگ کے مصارف کے لیے انگلستان اور فرانس وغیرہ میں "عشر صلاح

الدین" کے نام سے ایک ٹیکس جاری کیا گیا۔ پادریوں نے فتویٰ دیا تھا کہ جو شخص اس کار خیر میں شریک نہیں ہوگا وہ مسیحیت سے خارج ہو جائے گا۔ مشہور مورخ گبن (Gibbon) لکھتا ہے۔

"صلاح الدین نے یورپ سے اپنی عظمت کا جو خراج اس ٹیکس کی شکل میں لیا وہ آج تک کسی تاج دار کو نصیب نہ ہو سکا۔ رچرڈ نے مصارف جنگ کے لیے اپنی جاگیر فروخت کر دی۔ بڑے بڑے عہدوں کو نیلام کیا گیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کوئی خریدار ہو تو لندن تک کو بیچنے کے لیے تیار ہوں۔"

جو لوگ کسی مجبوری کی بناء پر شریک نہ ہو سکے انہوں نے اپنے خرچ پر اپنی جگہ آدمی بھیجے۔ عورتوں نے اپنی اکلوتی اولادوں تک کو نذر کر دیا۔"

بہر حال دو سال کی مکمل تیاری کے بعد یہ لشکر فلسطین کی طرف بڑھا۔ مورخین نے لکھا ہے۔

"یہ فوج نہیں بڑھ رہی تھی بلکہ ہتھیاروں اور سپاہیوں کا ایک سیلاب تھا جو عربوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا دینے کے لیے امڈ آیا تھا۔"

اس لشکر کی تعداد بعض مؤرخین کے قول کے مطابق چھ لاکھ اور بعض کے خیال میں دس لاکھ تھی۔ جتنے یورپی اور مسیحی سربراہ اس جنگ میں شامل تھے کسی صلیبی محاربے میں اس سے پہلے شریک نہ ہوئے تھے اور اس متحدہ قوت کا سامنا صرف اور صرف صلاح الدین ایوبی کو کرنا تھا۔

اس کے مقابلہ پر قیصر جرمنی تھا مگر اس بدذات کو قدرت نے دریائے سالس عبور کرتے ہوئے ڈبو کر ختم کر دیا۔ اس طرح اس فوج کا ایک حصہ واپس چلا گیا۔ اب برطانیہ اور فرانس کی افواج فلسطین کے ساحل پر اتریں اور انہوں نے عکہ کا محاصرہ کر لیا۔ پھر جرمنی والے بھی ان سے آ ملے۔ اس طرح محاصرہ کرنے والوں میں آسٹریا، اٹلی، برطانیہ، البانیہ، فرانس وغیرہ کے فوجی دستے صلیبی رضا کاروں میں شامل ہو گئے۔ مگر محصورین نے تمام ناموافق حالات کے باوجود تین سال تک حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور آخر مسلمانانِ عکہ نے ہتھیار ڈال دیے اور دو لاکھ دینار ادا کرتے ہوئے صلح کر لی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ محاصرہ کے ان تین سالوں کے دوران سلطان نے محاصرین کو مدد پہنچانے کی تمام تدبیریں کیں اور ایک مرتبہ محاصرہ توڑ کر ان تک مدد پہنچائی بھی مگر محصورین نے حوصلے چھوڑ دیے تھے۔ دوسری طرف فرنگی بحری بیڑے کی سخت مضبوطی، افواج میں بیماری اور بعض دیگر اسباب کی بناء پر محصورین کی موثر مدد نہ کی جا سکی اور عکہ کے باسیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

سلطان کو اس خبر سے شدید صدمہ ہوا۔ رچرڈ جسے شیر دل کہا جاتا ہے۔ اس نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہ صرف اسیران جنگ کو بلکہ سفیروں اور یرغمال میں آئے ہوئے امیروں تک کو شہید کر دیا۔ صلیبیوں کی اس بدعہدی پر مورخ لین پول لکھتا ہے۔

"پیشتر اس کے کہ خدا عیسائیوں کو چھوڑتا، عیسائیوں نے خدا کا دامن چھوڑ دیا۔"

اس سلسلے میں ہیرالڈ لیم نے سلطان کے بارے میں تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"سلطان صلاح الدین پر صد آفریں کہ اس عالی حوصلہ انسان نے صرف اعلانیہ جنگ میں دشمن سے بدلہ لیا۔"

اس سے زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ جب رچرڈ نے سلطان سے سامانِ خوراک کی درخواست کی تو سلطان نے اسے ٹھکرایا نہیں بلکہ شریف دشمن ہونے کا ثبوت دیا۔ مگر اس پر بھی تہذیب کے علم بردار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرنگیوں کو حیا نہیں آئی۔

عکہ کو تباہ و برباد کرنے کے بعد صلیبی لشکر نے عقلان کا رخ کیا۔ سلطان نے مقابلہ کے بجائے ایک انوکھا راستہ یہ اختیار کیا کہ پورے شہر عقلان کو گروا کر زمین کے برابر کر دیا۔ پس جب مسیحی لشکر وہاں پہنچا تو اس کا استقبال شکستہ عمارتوں اور کھنڈرات نے کیا۔

عیسائی لشکر اس سے بہت بددل ہوا۔ رچرڈ اگرچہ دل چھوڑ بیٹھا تھا مگر اس نے پھر بھی بیت المقدس پر حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ نے جنگ سے نجات پانے کے لیے سلطان کو ایک تجویز لکھ کے بھیجی۔ اس تحریر میں درج تھا کہ:۔

"رچرڈ کی بہن کی شادی، سلطان صلاح الدین کے بھائی ملک العادل سے کر دی جائے۔ اور سلطان بیت المقدس ملک العادل کو دے دے۔"

سلطان نے رچرڈ کی تجویز کو منظور کر لیا لیکن پورے یورپ میں کہرام مچ گیا۔ عیسائیوں نے رچرڈ کو مسیحیت سے فارغ کرنے کی دھمکی دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر سے جنگ چھڑ گئی۔ نصرانی لشکر بیت المقدس کی طرف بڑھا مگر اس کی دیواروں سے ٹکرا کر ناکام و نامراد لوٹ گیا۔ اس سے عیسائیوں میں بددلی پیدا ہوئی اور وہ باہم دست و گریباں ہو گئے۔"

رچرڈ نے ایک بار پھر صلح کی کوشش کی اور دو ستمبر ۱۱۹۲ء کو سلطان صلاح الدین کے بھائی ملک العادل اور رچرڈ نے معاہدہ صلح پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدہ کے تحت بافا، لد، مجدل، یابا، فیاریہ، ارسوف، حیفہ اور عکہ رچرڈ کا مقبوضہ اور عقلان کو آزاد علاقہ قرار دیا گیا۔ طے پایا کہ تین سال تک تمام عیسائی زائرین محصول ادا کیے بغیر بیت المقدس کی زیارت کر سکیں گے۔

اس طرح مسلسل پانچ سال تک خون ریز لڑائیوں کے بعد تیسری صلیبی جنگ کا اختتام ہوا۔ اس جنگ میں یورپ کے لاکھوں آدمی، سیکڑوں نامور امراء اور عمائدین، متعدد بادشاہ کام آئے۔ بے اندازہ دولت برباد ہوئی۔

مچاڈ نے اس طرح لکھا ہے۔

"یورپ کی تمام مسلح طاقتوں نے عکہ کی فتح اور عقلان کی بربادی سے زیادہ کچھ حاصل نہ کیا۔"

عرب مورخین کا بیان ہے کہ:۔

"عکہ کے سامنے چھ لاکھ کروسیڈ کام آئے اور مشکل سے ایک لاکھ سپاہی گھروں کو واپس جا سکے۔"

لین پول کا بیان ہے۔

"جولائی ۱۱۸۷ء حطین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین نہ تھی۔ ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب صلح ہوئی تو صور سے لے کر یافا تک بجز ایک پتلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا اور فرنگیوں کو اپنی جانی اور مالی قربانیوں کے مقابلے میں جو کچھ حاصل ہوا وہ نہایت ہی حقیر تھا۔"

مورخین کے بقول یورپ کے ہر قریہ اور گھر میں نالہ و ماتم برپا ہو گیا۔ اس سلسلے میں ہیر الڈلیم نے لکھا ہے کہ:۔

"برسوں کی خونریزی کے بعد بھی انہیں اپنے مقامات مقدسہ میں سے کسی پر بھی قبضہ نصیب نہ ہوا۔"

اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت ہے کہ سلطان نے یہ جنگ بے انتہا نامساعد حالات میں لڑی تھی۔ اس کی فوج خود سر ہو گئی تھی۔ جنگ کے دوران عرب خیموں میں گھس آتے اور لوٹ مار کر کے بھاگ جاتے تھے۔ پھر جب سلطان نے اپنی فوج کے مفسدہ پردازوں کو نکال باہر کیا تو رچرڈ نے صلح کی پیش کش کر دی۔ سلطان مکمل اور فیصلہ کن فتح کا خواہاں تھا۔ اس نے

بہاؤالدین سے صاف الفاظ میں کہا تھا۔

"میں صلح کرنے سے ڈرتا ہوں۔ نہ جانے میری موت کے بعد حالات کیا ہوں۔"

لیکن سلطان کی فوج جنگ سے بے زار ہو چکی تھی اور آخر کار حالات نے اسے مجبور کر دیا۔

مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے میدان جنگ میں بھی اپنے دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے یا اس پر اوچھا وار کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ پھر جب رچرڈ نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ کیا تو سلطان نے اس کے نحیف و نزار گھوڑے کو دیکھا اور فوراً اسے خوب صورت عربی گھوڑے بھجوائے تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ اس کا گھوڑا کمزور تھا۔

ہیر الڈلیم لکھتا ہے۔

"سلطان صلاح الدین جنگ کے دوران بھی ایسا ہی فراخ دل اور بردبار رہا جیسا کہ وہ جنگ سے پہلے تھا۔ جب رچرڈ نے سلطان کو لکھا کہ فرانسیسی معاہدے کے فریق نہیں، اس لیے انہیں یروشلم کی زیارت کی اجازت نہ دی جائے تو سلطان نے جواب میں لکھا کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے تمام عیسائیوں کو زیارت کی اجازت بخش دی ہے۔ پھر انہیں کیسے محروم کر دوں؟"

بشپ آف سالسبری نے منہ مانگی مراد پائی۔ اس نے پادریوں کے مزار مقدس میں قیام کی اجازت مانگی اور سلطان نے فوراً اجازت دے دی۔

سلطان کی واپسی

جب رچرڈ ساحل شام سے چلا گیا تو سلطان حرم مقدس میں آیا۔ اس نے تمام امیروں کو جمع کیا اور انہیں ایک ایک کر کے رخصت کر دیا۔ سلطان نے پچھلے کئی سال سے روزے نہیں رکھے تھے۔ پس اس نے القدس میں قیام کے دوران مسلسل روزے رکھے۔ اس سے اس کی صحت بگڑ گئی۔ طبیب خاص نے اسے مجاہدہ نفس سے روکنے کی سخت کوشش کی لیکن سلطان نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور کہا۔

"معلوم نہیں کہ آئندہ کیا ہو؟"

پس سلطان نے مسلسل روزے رکھے اور پورا کفارہ ادا کر دیا۔ اس نے اس قیام میں شہر پناہ کی مرمت کرائی۔ خندق کھدوائی۔ نئے اوقاف قائم کیے اور بیت المقدس کا انتظام امیر عزیز الدین جردیک کے سپرد کر کے دمشق روانہ ہو گیا۔

مجاہد اعظم کی وفات

تاریخ بتاتی ہے کہ اس سال سلطان نے اپنی نقاہت کے باوجود دمشق سے باہر نکل کر حج سے لوٹنے والوں کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ اگلے سال خود بھی حج کے لیے جانے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن تین مارچ ۱۱۹۳ء میں ملک الناصر سلطان صلاح الدین نے وفات پائی۔

بازاروں میں سناٹا چھا گیا۔

آج وہ عظیم الشان انسان موت کی آغوش میں سو گیا تھا جس نے بیس سال تک دنیائے اسلام کی نہایت ثابت قدمی سے قیادت کی تھی۔

شیخ ضیاء الدین ابوالقاسم نے غسل دیا اور دمشق کے باغ کی بارہ دری میں عصر کے وقت اس جگہ دفن کیا جہاں انہوں نے انتقال کیا۔ جو تلواریں جہادوں میں ان کے زیب کمر تھیں۔ وہ ان کے برابر رکھ دی گئیں اور وہ انہیں اپنے ساتھ جنت میں لے گئے۔

سلطان نے ہر چیز ختم کر دی تھی۔ وہ خالی ہاتھ اس دنیا سے گئے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان خالی ہاتھ آتا ہے اس لیے اسے خالی ہاتھ ہی جانا چاہیے۔ سلطان کے کفن دفن کے لیے بھی قرض لیا گیا یہاں تک کہ ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی قبر میں جو لکڑیاں لگیں وہ بھی قرض سے منگوائی گئی تھیں۔ ان کی موت سے ہر طرف سناٹا سا چھا گیا تھا۔ لوگ دبے دبے الفاظ میں گفتگو کرتے تھے۔ دفن کے بعد ہر شخص خاموشی سے اپنے گھر چلا گیا۔ سڑکوں اور کوچہ و بازار میں سناٹا سا طاری معلوم ہوتا تھا۔

طبیب عبداللطیف کا بیان ہے کہ اس کے علم میں صرف سلطان کی نظیر ہے جس کے لیے واقعی رعایا نے ماتم کیا۔

❁❁❁

پاپائے روم انوسنٹ ثالث نے صلیبیوں کے جذبہ جہاد کو زندہ رکھا اور جنگ کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ پوپ ایک آتش بیاں اور اثر آفریں مقرر تھا۔ وہ کہتا تھا۔

"یروشلم کی رہائی مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔"

پوپ نے مسیحی برادری کو خبردار کیا کہ مسلمان یروشلم کے قبضہ کے بعد مسیحیت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی تدبیریں کریں گے۔ اس کی ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ عیسائی دوشیزائیں سرزمین قدس کو آزاد کرانے کا حلف اٹھانے والوں کو صلیبیں پیش کرتی پھرتی تھیں۔ اس دوران ہنری ششم نے ۱۱۹۸ء سے ۱۲۰۳ء کے دوران ساحل فلسطین پر حملے کیے مگر اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ پھر ۱۲۰۴ء میں کاؤنٹ بالڈون کی سالاری میں جرمنی، فرانس، یوروگوئے، انگلستان، روم بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سارے یورپ کی متحدہ فوجیں قسطنطنیہ پہنچیں اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ ان کے جنون کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک فرانسیسی لڑکے کی قیادت میں یروشلم کو کافروں سے چھڑانے کے لیے روانہ ہوئے مگر ان کا برا حشر ہوا۔ اس لشکر میں بارہ بارہ سال اور چودہ چودہ سال کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں اور ان کی مجموعی تعداد تقریباً نوے ہزار تھی۔ یہ لشکر جس شہر سے گزرتا لوگ اس سے نیک فال لیتے اور کہتے۔

"اب یروشلم آزاد ہو جائے گا۔"

مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ بچیوں کی عصمتیں لوٹی گئیں اور لڑکوں کو غلام بنا کر بیچ دیا گیا۔ باقی لٹے پٹے لڑکوں نے اطالوی شہروں اور قصبوں میں نوکریاں کر لیں۔

اس انجام تک پہنچنے کے باوجود یورپ کا صلیبی جنون سرد نہیں ہوا تھا۔ پورے یورپ میں صلیبی جنگوں کی زور و شور سے تبلیغ ہو رہی تھی۔ پھر ۱۲۱۵ء میں پاپائے روم نے ایک کانفرنس بلائی اور ایک نئی جنگ کے لیے جون ۱۲۱۷ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اس کے نتیجے میں ایک صلیبی لشکر شاہ ہنگری کی قیادت میں ساحل عکہ پر لنگر انداز ہوا۔ اس کے بعد اور لشکر آئے اور ان کا مقابلہ صلاح الدین ایوبی کے بھائی الملک العادل سے ہوا۔ اس کی عمر ۷۰ سال کی ہو چکی تھی مگر اس کے باوجود صلیبی لشکر ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اس دوران الملک العادل کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا الملک الکامل جانشین ہوا۔ سلطان دمشق نے حرم مقدس اور محرب داؤد کی دیواروں کے علاوہ بیت المقدس کی تمام فصلیں گرا دی تھیں تاکہ دشمن شہر کو کھلا پا کر زیادہ نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن صلیبی القدس تک نہ پہنچ سکے۔ پھر بھی انہوں نے دیباط پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا خون بہایا اور مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کر دیا۔

اس خونریزی کے بعد پچاس ہزار سے زیادہ صلیبی قاہرہ کی طرف بڑھے۔ الملک الکامل گھبرا گیا اور اس نے فوراً صلاح کی پیش کش کر دی اور وعدہ کیا کہ اگر دمیاط واپس کر دیا جائے تو وہ یروشلم کو عیسائیوں کے

حوالے کر دے گا مگر عیسائی رضامند نہ ہوئے اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ کرک اور ماؤنٹ ریال بھی ان کے حوالے کیا جائے۔

اس اختلاف نے جنگ کی صورت اختیار کر لی اور منصورہ کے قریب میدان کارزار گرم ہوا۔ اس لڑائی میں عیسائیوں کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا اور دمیاط خالی کر کے صلح پر آمادہ ہو گئے۔ الملک الکامل نے یافا سے تلمیس تک کے علاقے پر فریڈرک ثانی کا قبضہ تسلیم کر لیا اور دس سال کے لیے معاہدہ ہو گیا۔ مگر فریڈرک ثانی نے پادریوں کی ناراضگی کی وجہ سے معاہدہ سے آنا کانی شروع کر دی اور واپس جانے پر آمادہ ہوا۔ پھر ۱۲۲۳ء میں سسلی میں ایک نئی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں فریڈرک نے ۱۲۲۵ء میں کروسیڈ پر جانے کا حلف اٹھایا مگر ایک عرصہ تک اسے ٹالتا رہا۔ پھر وہ ۱۲۲۸ء میں وہ فلسطین کی طرف روانہ ہوا مگر راستہ میں بیمار پڑ گیا اور اس نے سفر ملتوی کر دیا۔ اس پر پاپائے روم نے اس کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کر دیا اور اٹلی میں ہونے والی مذہبی رسومات معطل کر دیں۔ اس خبر کو پا کر فریڈرک واپس فلسطین کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ قبرص سے ہوتا ہوا عکہ پہنچا۔ اس وقت اس کے ساتھ ۴۵ ہزار کا لشکر تھا۔

ادھر الملک العادل نے بیٹوں کو خانہ جنگی سے بچانے کے لیے سلطنت ان میں تقسیم کر دی تھی۔ اس نے کرک، اردن دمشق اور طبریہ اپنے بیٹے معظم کو دیے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد الملک الکامل کے چاروں بھائیوں نے اسے اپنا سرپرست تسلیم کیا لیکن بعد میں ان میں اختلاف پیدا ہوا اور معظم باغی ہو گیا۔

جس وقت فریڈرک اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ساحل فلسطین پر اترا تو القدس پر معظم کا قبضہ تھا۔ اس نے فرنگیوں کو القدس میں داخل نہ ہونے دیا۔ پھر ملک کامل نے مندرجہ ذیل شرائط پر بیت المقدس کو شاہ فریڈرک ثانی کے حوالے کر دیا۔ شرائط یہ تھیں:۔

۱۔ فرنگی بیت المقدس کی شہر پناہ دوبارہ تعمیر نہیں کریں گے۔

۲۔ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ مثلاً قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ میں کوئی تعرض نہیں کریں گے۔

۳۔ بیت المقدس سے ساحل تک عیسائیوں کو راستہ دے دیا جائے گا۔

کامل نے دس سال کے لیے عارضی قبضہ دیا تھا مگر مسلمانوں نے اس کے خلاف نفرت کا اظہار کیا اور یہی چھٹی صلیبی جنگ کہلاتی ہے۔

مصر اور دمشق میں ٹھن گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب چنگیز خان دنیا پر چھاتا جا رہا تھا۔ وہ خوارزمیوں کا تعاقب کرتا ہوا سرزمین فلسطین تک آ پہنچا تھا۔ فریڈرک اور الکامل میں دس سال کا معاہدہ ہوا تھا لیکن اس معاہدے سے دونوں فریق خوش نہ تھے۔ چنانچہ ناروے کا بادشاہ ساحل فلسطین پر پہنچا اور لوٹ مار کر کے واپس ہو گیا۔ اس کے جواب میں الکامل کے جانشین الناصر نے آگے بڑھ کر بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں عیسائیوں نے ایک قلعہ بنا لیا تھا جسے تباہ کر دیا گیا۔

(باقی آئندہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سازشی ذہن

اسرار احمد

انہوں نے ایک شخص سے اسی کے قتل کے سہاری لی اور پھر اپنا کام بھی خوش اسلوبی سے انجام دے دیا۔ جب کام کے معاوضہ کو خرچ کرنے کا وقت آیا تو پتا چلا کہ ان کے ساتھ ہاتھ ہو چکا ہے۔

دو چالاک کوؤں کا احوال' ماضی کی ایک غلطی ان کے لیے پھندا بن گئی تھی

روڈ سنسان پڑا ہوا تھا۔ ہماری کار تیز رفتاری سے سنسان سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ آگے چوراہا تھا جس کا سگنل اپنی سرخ آنکھوں سے ہمیں گھور رہا تھا لیکن میں نے سگنل بند ہونے کی پروا نہ کی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی کو ڈرائیو میں کر رہا تھا جب کہ ریفرٹی میرے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں ذرا دیر قبل ہی کیلاہن کے شراب خانے سے نکلے تھے اور شراب کے کئی پیگ ہمارے معدوں میں اترے ہوئے تھے۔

نشے کی زیادتی کے باعث اسٹیئرنگ وہیل پر میری گرفت خاصی کمزور تھی۔ گاڑی مست شرابی کی طرح لہراتی جھومتی آگے بڑھ رہی تھی۔ سگنل ابھی تک بند تھا۔ اصولاً مجھے رک جانا چاہیے تھا لیکن نشے کی زیادتی نے میرا دماغ ماؤف کر دیا تھا اور قانون کی پابندی کا خوف میرے دل سے نکل چکا تھا۔

جونہی گاڑی چوراہے کے وسط میں پہنچی' بائیں جانب سے جدھر کا سگنل بند تھا ایک تیز رفتار موٹر سائیکل آئی اور سیدھی ہماری کار سے ٹکرا گئی۔ موٹر سائیکل سوار نوجوان ہی تھا اور اپنی دانست میں بالکل صحیح آ رہا تھا۔ اس کی موٹر سائیکل ہماری کار کے اگلے حصے سے ٹکرائی۔ دوسرے ہی لمحے موٹر سائیکل ایک طرف الٹی پڑی تھی اور دوسری جانب نوجوان موٹر سائیکل سوار زخمی حالت میں سڑک پر پڑا کراہ رہا تھا۔

اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔

میں نے ایک نظر نوجوان کے چہرے پر ڈالی اور گھبرا کر ریفرٹی کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ دہشت سے سفید پڑ گیا تھا۔

''بھاگ نکلو فوراً.....'' وہ بڑبڑایا۔ ''ابھی کسی نے ہمیں نہیں دیکھا ہے۔''

میری انسانی حس بیدار ہو گئی۔ میرا جی چاہا کہ میں زخمی نوجوان کو اٹھاؤں اور گاڑی میں ڈال کر سیدھا اسپتال لے جاؤں لیکن دوسرے ہی لمحے مصلحت' انسانیت پر غالب آ گئی' ایسا کرنا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا۔

میں نے ریفرٹی کے مشورے پر عمل کیا اور گاڑی کو تیز رفتاری سے بھگا دیا۔ زخمی نوجوان حسرت بھری نگاہ سے ہماری طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کی کراہوں میں بے بسی شامل ہو گئی تھی لیکن میں نے ان کراہوں کی کوئی پروا نہ کی۔

گاڑی تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی چند ہی لمحوں میں جائے حادثہ سے بہت دور نکل آئی۔ میرا اور ریفرٹی' دونوں کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ یہ ایک زبردست ایکسیڈنٹ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ زخمی نوجوان بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے زندہ نہ بچ سکا ہوگا۔ ہمارے حق میں سب سے بہتر بات یہ تھی کہ اب تک اس سڑک پر ہماری گاڑی کے علاوہ کوئی

اور گاڑی نہیں گزری تھی۔

میں نے گاڑی کو فوراً ہی ایک ویران جگہ پر کھڑا کر دیا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ ریفرٹی نے بھی میری تقلید کی۔ یہ گاڑی ہماری نہیں تھی' نہ جانے کس کی تھی' جسے ہم نے عارضی طور پر اڑا لیا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ اگر زخمی نوجوان مرنے سے بچ گیا ہوگا اور اس نے کار کا نمبر نوٹ کر لیا ہوگا تو اس سے ہماری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پولیس زیادہ سے زیادہ رجسٹریشن نمبر سے کار کے اصل مالک تک پہنچ سکتی تھی۔ ہم تک نہیں آ سکتی تھی۔

بہرحال گاڑی سے اترتے ہی ہماری پوری کوشش یہی تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ہم دونوں گاڑی سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جائیں۔ دوسری صورت میں یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی شخص ہمیں اس گاڑی سے اترتے دیکھ لیتا اور بعد میں پولیس کو ہمارے بارے میں بتا دیتا۔ پولیس کے نزدیک ویسے بھی ہم کچھ نیک نام نہ تھے کیونکہ کئی مرتبہ چھوٹی موٹی چیزیں اڑا لینے اور پھر پکڑے جانے کی صورت میں ہم جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔

میں اور ریفرٹی دونوں ہی اس حادثے کے باعث بدحواس ہو گئے تھے۔

مگر جب کئی دنوں بلکہ ہفتوں تک کچھ نہیں ہوا اور پولیس ہم تک نہ پہنچی تو یہ حادثہ ہی ہمارے ذہن سے نکل گیا' ہم اسے بھول چکے تھے اور پھر سے اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

شام کا وقت تھا۔ ہم دونوں کیلاہن بار میں بیٹھے برہن سے شغل کر رہے تھے کہ یکا یک ہی میں چونک پڑا۔

میرے چونکنے کی وجہ وہ نوجوان شخص تھا جو بیساکھیوں کے سہارے شراب خانے میں داخل ہوا تھا۔ جہاں تک میری یادداشت کا تعلق تھا' میں نے اس سے پہلے کبھی اس شخص کو کیلاہن بار میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ یقیناً پہلی بار یہاں آیا تھا۔

اس کی وضع قطع اور چہرے کے تاثر دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ ایک انتہائی مایوس اور دل گرفتہ انسان ہے۔

وہ سیدھا ہماری میز کے قریب آیا اور خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی عمر تیس' بتیس سال کے لگ بھگ تھی اگر وہ دونوں ٹانگوں سے معذور نہ ہوتا تو میں اسے بلا تامل ایک وجیہہ نوجوان کہہ سکتا تھا۔ اس عمر میں دونوں ٹانگوں سے معذور ہو جانا ایک المیہ ہی تھا اور اس المیے کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے۔

میرے قیاس کے مطابق وہ ان لوگوں میں سے ہرگز نہ تھا جو اپنی مجبوری اور معذوری سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ اس نے ایک صاف اور بے داغ لباس پہن رکھا تھا۔ جو اس کی امارت کا مظہر تھا۔ اس کی پیشانی کشادہ تھی اور بال گہرے سیاہ تھے۔

اس نے آتے ہی بارٹینڈر کو ایک بوتل اسکاچ لانے کا حکم دیا اور ہماری طرف دیکھ کر مسکرا دیا لیکن میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی مسکراہٹ میں یاسیت موجود تھی۔

''مجھے لوگن کہتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ دونوں کو میرا بیٹھنا ناگوار تو نہیں گزرا؟''

''کچھ زیادہ خوشی بھی نہیں ہوئی۔'' ریفرٹی نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''بہرحال اب جب یہاں بیٹھ ہی چکے ہو تو بیٹھے ہی رہو۔''

''صاف گوئی کا شکریہ!'' لوگن دھیمے انداز میں مسکرایا۔ ''کیا تم اپنا تعارف نہیں کراؤ گے؟''

''مجھے ریفرٹی کہتے ہیں اور یہ میرا دوست فرینک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔'' اس نے کہا۔

بارٹینڈر نے اسکاچ کی بوتل اور ایک گلاس لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ لوٹنے ہی لگا تھا کہ لوگن نے اس سے کہا۔ ''دو گلاس اور لے آؤ۔'' پھر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ ''آج ایک جام میری طرف سے ہوجائے۔''

میں للچائی نظر سے اسکاچ کی بھری بوتل کو دیکھنے لگا۔ مجھ میں انکار کی جرأت نہیں تھی۔ ریفرٹی کا حال بھی مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا تھا۔ اس وقت بار میں ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا' بار خالی پڑا تھا۔

''کیا تم نے اپنی ٹانگوں کا علاج کرانے کی کوشش نہیں کی؟'' میں نے کہا۔ ''موجودہ میڈیکل سائنس کے نزدیک تو اب کوئی کام مشکل نہیں رہا۔ تمہاری ٹانگیں بآسانی درست ہوسکتی تھیں۔''

اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''کوشش؟'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''میں اب تک پورے چودہ آپریشن کراچکا ہوں۔''

''اپنی اپنی ہمت کی بات ہے۔'' ریفرٹی نے بھویں سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو دوسرے ہی آپریشن کے بعد خودکشی کرلیتا۔'' اس نے کہا۔ ''نوجوانی میں معذوری کا عذاب سہنا آسان نہیں ہے۔''

''پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا۔'' لوگن تلخی سے مسکرایا۔ ''لیکن پھر ہمت ہار گیا۔ خودکشی کرنے کے لیے بھی ہمت چاہیے کیونکہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی ختم کرلینا بہت مشکل کام ہے۔''

''چودہ آپریشن کرانے پر اچھی خاصی دولت خرچ ہوگئی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''جب کہ اس دور میں ایک آپریشن کرانا بھی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ میں اپنے کان کا آپریشن کرانا چاہتا ہوں لیکن ڈاکٹروں نے اس آپریشن کی فیس دس ہزار ڈالر بتائی ہے' جس کی ادائیگی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔''

''میں آپریشن کے خرچ اور ڈاکٹروں کی فیس کے لیے کبھی پریشان نہیں ہوا۔'' لوگن نے کہا۔ ''میرے ڈیڈی میرے لیے خاصی دولت چھوڑ کر فوت ہوئے ہیں اتنی کہ میں مزید چودہ آپریشن کرا سکتا ہوں اور خوش حال زندگی بسر کرسکتا ہوں۔''

ریفرٹی نے معنی خیز نظر سے میری طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

''ایسی صورت میں تمہیں اپنے حالات سے سمجھوتہ کرلینا چاہیے۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔ ''اگر انسان کے پاس دولت ہو تو اس کے بے شمار مسائل خود بخود حل ہوجاتے ہیں۔''

''تم درست کہہ رہے ہو۔'' اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''دولت سے معاشی مسائل تو حل ہوجاتے ہیں۔'' اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ذہنی مسائل اور پریشانیاں حل نہیں ہوتیں۔'' پھر یکا یک وہ جوشیلے انداز میں بولا۔ ''میں ان لوگوں میں سے ہوں جو زندگی میں سب سے آگے نکل جانے کی خواہش رکھتے ہیں۔'' اس نے ہلکا سا توقف کیا پھر بولا۔ ''شاید موجودہ صورت حال میں یہ بات تمہیں متضاد اور ناقابل یقین لگے لیکن تین سال پہلے میں دنیا کا سب سے تیز رفتار انسان تھا۔ میں اولمپک کھیل میں ایک ہزار میٹر کی دوڑ میں اوّل آیا تھا اور مجھے طلائی تمغہ ملا تھا۔''

مجھے اس پر ترس آ گیا۔ اس اعتبار سے اس کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ دنیا کا سب سے تیز رفتار انسان سب سے پیچھے رہ گیا تھا مگر ریفرٹی خود پسند آدمی تھا۔ اسے یہ جان کر کچھ زیادہ افسوس نہیں ہوا تھا۔

''یہ حادثہ کیسے پیش آیا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''جنگ کے دوران مجھے ویت نام بھیج دیا گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''وہاں پر میرا پیر ایک ایسی بارودی سرنگ پر پڑ گیا تھا جو ویت نامیوں نے بچھا رکھی تھی۔ سرنگ پھٹ گئی۔ میں بے ہوش ہوگیا' مجھے اسپتال میں ہوش آیا تو پتا چلا کہ میری دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئی تھیں۔''

لوگن کے لہجے میں اداسی در آئی تھی۔ اس نے بار مین کو اشارے سے قریب بلایا اور جیب سے پرس نکال کر اس کو بیس ڈالر کا ایک نوٹ دے دیا۔

''پلیز.....! ایک پیکٹ سگریٹ بھی لا دینا۔''

پرس پر نظر پڑتے ہی ریفرٹی نے مجھے کہنی ماری۔ لوگن کا بٹوا نوٹوں سے بھرا ہوا تھا اور پھولا ہوا تھا۔

ان دنوں ہم دونوں ہی بے کار تھے اور ادھار پر گزارا چلا رہے تھے' جو کبھی مل جاتا اور کبھی نہ ملتا۔ ایسی صورت میں ہم پر فاقہ کشی کی نوبت آجاتی۔ لوگن نے ہم دونوں کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھ لی تھی۔ جو بٹوے میں بھرے نوٹوں کو دیکھ کر ہماری آنکھوں میں ابھر آئی تھی۔ وہ ہلکے سے مسکرا دیا پھر ریفرٹی کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔

''ایک بات تو بتاؤ..... اگر میں تمہیں کسی ویرانے میں مل جاتا تو تم کیا کرتے؟''

''وہی کرتا جو تمہارے ذہن میں ہے۔'' ریفرٹی نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔ ''مایوسی اور فاقہ کشی انسان کو بہت کچھ کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' وہ میری طرف پلٹتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم بھی اپنے ساتھی سے متفق ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ ریفرٹی ٹھیک ہی کہتا ہے۔'' میں نے شانے اچکا دیے۔

☆.....☆.....☆

یہ ایک سنسان اور ویران جگہ تھی۔ لوگن اپنی کار میں بٹھا کر ہمیں یہاں تک لے آیا۔ وہ اپنی زندگی سے تنگ آچکا تھا۔ خودکشی کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ کوئی اسے قتل کردے۔ وہ اپنے قاتل کو اپنے بٹوے میں موجود ساری رقم دینے کے لیے تیار تھا۔ ریفرٹی اور مجھے پہلے تو اس بات پر یقین ہی نہ آیا مگر وہ سنجیدہ تھا۔ نتیجے میں ہمیں بھی سنجیدہ ہوجانا پڑا۔ اس کے بٹوے میں دو ہزار ڈالر سے زیادہ کی رقم موجود تھی۔ جو ہم جیسے فاقہ مستوں کے لیے خاصی بڑی رقم تھی۔

دولت کمانے کا اس سے بہتر موقع ہمیں اپنی پوری زندگی میں نہیں مل سکتا تھا لیکن ہم دونوں ہی اس کی پیش کش کو قبول کرنے میں ہچکچا رہے تھے۔ ہم آوارہ گرد اور لفنگے ضرور تھے لیکن آج تک ہم نے کوئی قتل نہیں کیا تھا۔ ہم پر زیادہ تنگی کا وقت آپڑتا تو ہم چھوٹی موٹی چوری بھی کرلیتے لیکن قتل کے بارے میں ہم نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ قتل بہت بڑا جرم ہے' ساری زندگی جیل کی نذر ہوجاتی ہے۔

''اگر تم مرنا ہی چاہتے ہو تو سمندر میں چھلانگ لگا دو۔'' ریفرٹی نے کہا۔ ''کسی بلند عمارت سے کود جاؤ۔ اپنی کھوپڑی میں سوراخ کرلو۔ کسی گاڑی کے نیچے آجاؤ..... یا زہر کھالو۔'' اس نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔ ''یہ اپنے دو ہزار ڈالر بھی کیوں ضائع کرتے ہو؟''

لوگن کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''میں نے بتایا نا کہ میرے اندر خودکشی کرنے کی ہمت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اسی لیے میں تم دونوں کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''مگر یہ تو سراسر اقدام قتل ہوگا۔'' میں نے کہا اور اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''تم اسے قتل نہیں کہہ سکتے۔'' لوگن نے فوراً ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

احتجاج کیا۔ ”میں اپنی مرضی سے اپنی زندگی ختم کروانا چاہتا ہوں۔“

”تم جو چاہو کہو.....؟ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن از روئے قانون اسے قتل ہی کہا جائے گا۔“

”لیکن ہم اپنا کام محتاط طریقے سے کریں گے۔“ ریفرٹی نے مجھے کہنی سے ٹہوکا دیا۔ ”تاکہ پولیس کو پتا ہی نہ چل سکے۔“

میں نے ریفرٹی کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نظر سے لوگن کو گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ دو ہزار ڈالر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

”تم کس طرح قتل ہونا پسند کرو گے؟“ ریفرٹی نے پوچھا۔

”میں اپنا پستول ساتھ لایا ہوں۔“ لوگن نے کہا۔ ”تم میرے سر میں سوراخ کر دینا اور دو ہزار ڈالر لے کر سیٹی بجاتے ہوئے چلے جانا۔“

میرے بدن میں ہلکی سی جھرجھری آ گئی لیکن ریفرٹی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔“ لوگن نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم میری کنپٹی پر فائر کر کے پستول میرے ہاتھ میں تھما دینا اور بٹوے سے رقم نکال کر چل دینا۔ ہوشیار سے ہوشیار پولیس آفیسر بھی یہی کہے گا کہ میں نے خودکشی کی ہے۔ تمہارا نام بیچ میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

دو ہزار خاصی معقول رقم تھی۔ اسے چھوڑنا کسی طور مناسب نہیں تھا پھر یہ کوئی غلط کام بھی نہیں تھا۔ وہ شخص اپنی زندگی سے عاجز آ چکا تھا اور موت کا متمنی تھا۔ ہم اس کی خواہش پر اسے اذیت سے نجات دلا سکتے تھے۔ البتہ مجھے اس شخص پر حیرت ہو رہی تھی جو اتنے آرام سے اپنی موت کو آواز دینے کا آرزومند تھا۔

ریفرٹی نے سوالیہ نگاہ سے میری طرف دیکھا۔

”میرے خیال میں ٹھیک ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم اپنے سر میں سوراخ کروانا ہی چاہتے ہو تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ زندگی میں سیکڑوں غلط کام کیے ہیں ایک یہ بھی سہی۔“ ریفرٹی کی آنکھیں اندھیرے میں بھی مسرت سے چمک اٹھیں' اسے میرا فیصلہ پسند آیا تھا۔ مجھے دو ہزار ڈالر حاصل کرنے کی خوشی بھی تھی اور پکڑے جانے کا خوف بھی۔ البتہ ریفرٹی خاصا پُرجوش تھا۔ اس کے چہرے پر اضطراب کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی تھی۔

ہم تینوں اس وقت ایک ہائی اسکول کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ اسکول شہر کے کنارے پر واقع تھا اور اس کے پیچھے ایک وسیع میدان تھا جو اس وقت بالکل خالی پڑا تھا۔ لوگن کی کار عام کاروں سے مختلف تھی۔ سبز رنگ کی فورڈ سیڈان جس میں معذوروں کے استعمال کے خصوصی آلات لگے ہوئے تھے۔ جن کی مدد سے بریک' کلچ اور ایکسیلیٹر ہاتھ سے کنٹرول ہو سکتا تھا۔

”پستول کہاں ہے؟“ میں نے مدھم آواز میں کہا' جو سرگوشی سے مشابہ تھی۔

لوگن نے دستانوں والے خانے میں ہاتھ ڈالا۔ اعشاریہ بائیس کا ایک چھوٹا سا پستول نکالا اور کندھے کے اوپر سے میری طرف بڑھا دیا۔

”ذرا احتیاط سے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ لوڈڈ ہے۔“

میں نے پستول کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا لیکن اس سے پہلے میں پستول کے دستے پر رومال رکھنا نہیں بھولا تھا تاکہ میری انگلیوں کے نشان پستول پر نہ آ جائیں۔ میں نے رومال والے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کو حیرت سے گھورا پھر لوگن کو دیکھنے لگا' جو اسٹیئرنگ پر خاموشی سے جھکا ہوا تھا

اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

”معاوضہ ہمیں ایڈوانس میں ملے گا۔“ ریفرٹی نے پوچھا۔ ”یا مہینے کے آخر میں بل بھیجنا پڑے گا۔“ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

لوگن نے بٹوا نکالا اور احتیاط سے دو ہزار ڈالر گن کر میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ میں نے ایک ہزار ڈالر گن کر ریفرٹی کو دے دیئے' جنہیں اس نے گنے بغیر ہی جیب میں ٹھونس لیا۔

تقریباً دو ڈھائی سو ڈالر بچ گئے تھے جنہیں اس نے بٹوے میں ہی رہنے دیا تھا۔ لوگن کا خیال تھا کہ بٹوے میں سے ساری رقم غائب ہونے کی وجہ سے پولیس کو ڈکیتی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی تفتیش شروع کر سکتی تھی۔

مجھے اس شخص کی ہمت پر حیرت ہوئی کہ موت سے چند منٹ پہلے بھی اس کا دماغ صحیح کام کر رہا تھا۔

”اب جلدی سے کام ختم کرو۔“ ریفرٹی نے کہا۔ ”تاکہ یہاں سے نکل چلیں۔“ وہ عین وقت پر قدرے نروس ہو گیا تھا۔

مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ لوگن واقعی مرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”لوگن! کیا تم واقعی مرنے کے لیے تیار ہو؟“ جواب دینے کے بجائے اس نے آہستہ آہستہ رونا شروع کر دیا۔ مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ وہ خوف کی وجہ سے رو رہا تھا یا زندگی سے نجات پا جانے کی خوشی میں۔

”خدا کے لیے جلدی کرو۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔ ”میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔“

پستول میرے ہاتھ میں ایک دم ہی بھاری ہو گیا۔ میرا ہاتھ کانپنے لگا۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ ایک انسان کی جان لینا کتنا مشکل کام ہے۔ مجھے ان لوگوں پر حیرت ہوئی جو انسان کو چیونٹی کی طرح مسل دیتے ہیں۔ میرے اندر کا چھپا ہوا باضمیر انسان یکا یک ہی زندہ ہو گیا تھا مگر پھر میں نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور پستول والا ہاتھ کھڑکی پر رکھ کر اس کی کنپٹی کی طرف کر دیا۔

میں اب اس کھیل کو جلد ہی ختم کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے ٹریگر پر زور ڈالا تو مجھے اچانک ہی یوں لگا جیسے میری انگلی سن ہو گئی ہو۔ ٹریگر ایک ملی میٹر بھی پیچھے نہیں ہوا۔ سردی کے باوجود میں پسینے میں نہا گیا۔

لوگن آنکھیں بند کیے ہوئے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

”لعنت ہو تم پر.....“ ریفرٹی دانت بھینچتے ہوئے غرایا۔ ”جلدی کرو۔“

میں نے غصے سے پہلے ریفرٹی کی طرف دیکھا پھر لوگن پر نظر ڈالی۔

”پلیز..... مجھ پر رحم کرو۔“ لوگن نے سسکتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے ٹریگر دب گیا اور رات کا سکوت دھماکے کی آواز سے درہم برہم ہو گیا۔ لوگن کی سسکیاں بند ہو گئیں اور اس کا سر اسٹیئرنگ وہیل پر ڈھلک گیا۔ اب وہاں رکنا خطرناک تھا۔

میں نے جلدی سے پستول کو لوگن کے بے جان ہاتھ میں تھما دیا اور تیزی سے واپس چل پڑا۔ ریفرٹی نے بھی میری تقلید کی۔

ہم تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس جگہ سے خاصی دور نکل آئے تھے' ریفرٹی خاموش تھا۔

”میرے خیال میں یہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔“ میں نے اچانک ہی اسے مخاطب کیا۔ ”مجھے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔“

ریفرٹی نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور پوچھا۔ ”گولی تو ٹھیک جگہ پر لگی تھی نا؟“

”میں نے پستول کی نالی سر کے ساتھ جوڑ کر فائر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا تھا۔" میں نے اسے بتایا۔ "نشانہ چوکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "فائر کے ساتھ ہی اس کا سر اسٹیئرنگ وہیل پر ڈھلک گیا تھا۔"

اب ہم دونوں سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ ہم چاہتے تو ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے اپنے گھر جا سکتے تھے لیکن ہم نے پیدل ہی چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ریفرٹی سمجھ گیا تھا کہ میں خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ وہ میرا حوصلہ بڑھانے والی باتیں کر رہا تھا اور مجھے بتا رہا تھا کہ وہ ان ایک ہزار ڈالر کو کس انداز میں خرچ کرے گا' جو بیٹھے بٹھائے ہاتھ آ گئے تھے۔

مگر اس کے باوجود ایک نادیدہ سا خوف تھا۔ جو آہستہ آہستہ میرے اعصاب پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ میں لوگن کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں اور اس خیال کے ساتھ کوئی خوش گوار یاد وابستہ نہیں تھی۔

گھر پہنچ کر مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ اسی لیے اگلے روز میں دیر تک سوتا رہا۔

☆.....☆.....☆

دن کے گیارہ بجے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دستک دینے کا انداز بے حد جارحانہ تھا۔

میں ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ بیٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا' دروازہ کھول کر دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میری نظروں کے سامنے ایک پولیس آفیسر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر ایک پولیس وین تھی۔ جس کے بڈ کے ساتھ دو کانسٹیبل ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ تینوں کے تینوں پوری یونیفارم میں تھے۔

میں نے انہیں دیکھ کر بے یقینی اور بے اعتباری سے پلکیں جھپکائیں۔ کیا میں خواب دیکھ رہا تھا یا وہ حقیقت تھی۔ پولیس آفیسر نے اپنا محکمہ جاتی کارڈ میری نظروں کے سامنے لہرایا' پھر کہا۔

"میں لیفٹیننٹ رینڈل ہوں' فرام ہومی سائیڈ!" اس کی آنکھیں بلی کی طرح بھوری تھیں۔ "کیا تم فرینک ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پولیس آفیسر' دو کانسٹیبلوں اور پولیس وین کو دیکھ کر میرے بدن میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین آ رہا تھا نہ اپنی بینائی پر۔

لوگن کو مرے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہ گزرے پھر اتنی جلدی پولیس کا معاملے کی تہہ تک پہنچ جانا حیرت انگیز تھا۔

"مگر نہیں' یقیناً وہ کسی اور سلسلے میں آئے ہوں گے۔" میں نے خود کو تسلی دی۔ لوگن کی کار میں ہم نے کوئی ایسا نشان بھی نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی کوئی ایسی غلطی کی تھی جس سے پولیس ہم تک پہنچ سکتی۔

"مم..... مم..... میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں لیفٹیننٹ؟" میں نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

"میں تم سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔" لیفٹیننٹ رینڈل نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندر داخل ہو گیا۔

وہ تنقیدی نظر سے پورے گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ چند ثانیے تک کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف رہا پھر میری طرف پلٹ پڑا۔

"گزشتہ شب گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان تم کہاں تھے؟" اس نے پوچھا۔ انداز سرسری سا تھا۔

"مم..... مم..... میرا خیال ہے کہ میں کیلاہن بار میں تھا۔" میں نے حلق میں پھنسا تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"تم گیارہ بج کر پانچ منٹ پر بار سے نکل گئے تھے۔" لیفٹیننٹ رینڈل نے بتایا۔ "تمہارے ساتھ

تمہارا دوست ریفرٹی بھی تھا۔ یہ بات ہمیں بار کے مالک مسٹر کیلاہن نے بتائی ہے۔" اس نے کہا۔

"اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان تم کہاں تھے؟"

"اوہ' تو یہ بات تھی۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"کیلاہن نے شاید لوگن سے بات کرتے دیکھ لیا تھا اور اس نے یہی بات پولیس کو بتا دی تھی تو گویا خطرے والی کوئی بات نہیں تھی۔" میں نے خود کو دلاسہ دیا پھر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے اٹھتے وقت اپنی گھڑی تو نہیں دیکھی تھی لیکن شراب خانے سے نکل کر میں سیدھا گھر آ گیا تھا۔ اس کے بعد گھر سے نہیں نکلا۔"

"کوئی ثبوت؟" لیفٹیننٹ رینڈل نے مجھے مشتبہ نظر سے گھورا۔

"میری بیوی چونکہ رات کی ڈیوٹی کرتی ہے۔ اس لیے گھر میں اپنی موجودگی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"کیا تم لوگن اسمتھ کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"لوگن اسمتھ!" میں نے بھویں سکیڑیں اور سوچتے ہوئے پوچھا۔ "کون لوگن اسمتھ؟"

"وہی جو دونوں پیروں سے معذور تھا اور بیساکھیوں کے سہارے چلتا تھا۔" لیفٹیننٹ رینڈل نے مجھے بتایا۔

"اچھا..... اچھا....." میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ "یہ شخص تو کل مجھے شراب خانے میں نظر بھی آیا تھا۔" میں نے جواب دیا پھر پوچھا۔

"کیوں..... کیا ہوا اسے؟"

"میں تمہیں اس شخص کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔" لیفٹیننٹ سرد لہجے میں بولا۔ "تمہارا ساتھی ریفرٹی حوالات میں تمہارا منتظر ہے۔ اسے ہم پہلے ہی گھیر چکے ہیں۔" باہر کھڑے ہوئے دونوں کانسٹیبل بھی اب اندر آ چکے تھے اور میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے تھے۔

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔

"کیسی فضول بات کرتے ہو لیفٹیننٹ!" میں نے اپنی گھبراہٹ اور خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" میں نے احتجاج کیا۔

"پھر لوگن اسمتھ کے قتل سے میرا کیا واسطہ۔ میری اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ میرے لیے بالکل اجنبی شخص تھا اور محض کل ہی کیلاہن بار میں نظر آیا تھا۔"

لیفٹیننٹ نے جواب میں ریوالور نکال لیا اور اس کا رخ میری جانب کرتے ہوئے بولا۔ "اس کی تلاشی لو۔ بٹوا اب تک یقیناً اس کی جیب میں ہی ہو گا۔" اس نے یہ حکم اپنے ایک ماتحت کانسٹیبل کو دیا تھا۔ جس کا نام پیٹر تھا۔ دوسرے کانسٹیبل نے پیچھے سے میرے کوٹ کا کالر پکڑ کر مجھے نہ صرف اپنی طرف گھسیٹ لیا تھا بلکہ اپنی مضبوط گرفت میں بھی لے لیا تھا۔

"تم زیادتی کر رہے ہو لیفٹیننٹ!" میں نے اپنا کالر چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن اتنی دیر میں ہی کانسٹیبل پیٹر نے میری جیب سے وہ بٹوا نکال لیا تھا جس میں ایک ہزار ڈالر کے نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ پیٹر نے وہ بٹوا لیفٹیننٹ رینڈل کی طرف بڑھا دیا۔

"میں نے سنا ہے فرینک!" اس نے کہا۔ "تم آج کل بے روزگار ہو پھر اتنی بڑی رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی؟"

میں کوئی معقول و مناسب جواب دینے کی سوچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی رہا تھا کہ لیفٹیننٹ نے بٹوا پیٹر کو تھما دیا اور کہا۔

"ان نوٹوں کے نمبر اس لسٹ سے ملا کر دیکھو جو تمہارے پاس موجود ہے۔"

پیٹر نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور صوفے پر بیٹھ کر نوٹوں کے نمبر کاغذ پر لکھے ہوئے نمبروں سے ملانے لگا۔ اس دوران میں کانسٹیبل کی گرفت مجھ پر بدستور سخت تھی اور لیفٹیننٹ رینڈل کاریوالور اپنی سرد آنکھ سے مجھے گھور رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی پیٹر اپنے کام سے فارغ ہو گیا۔ وہ لیفٹیننٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تقریباً سارے ہی نمبر اس لسٹ میں موجود ہیں۔"

مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں یک دم ہی پھٹ پڑا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"بات یہ ہے فرینک کہ آج صبح ہمیں اسکول کے احاطے میں سبز رنگ کی فورڈ سیڈان کھڑی ملی تھی۔ اس کے اندر لوگن کی لاش موجود تھی۔ پہلی نظر سے دیکھا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خودکشی کی ہے کیونکہ اس کے داہنے ہاتھ میں پستول تھا اور کنپٹی میں سوراخ۔" لیفٹیننٹ رینڈل نے کہا۔ "لیکن جب میں نے گہری نظر سے لاش کا معائنہ کیا تو ہمیں پتا چلا کہ قاتل سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔" اس نے ذرا سا توقف کیا اور پُر خیال نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "قاتل کو یہ خیال نہ رہا کہ جب انسان داہنے ہاتھ میں پستول پکڑ کے اپنی کنپٹی میں فائر کرتا ہے تو وہ داہنی کنپٹی ہوتی ہے۔"

اس وقت پہلی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ میں نے بائیں کنپٹی پر فائر کیا تھا اور پستول اس کے دائیں ہاتھ پر رکھ دیا تھا لیکن اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا تھا کہ وہ فائر میں نے ہی کیا تھا۔ رہی لسٹ سے نمبر ملانے والی بات تو غالباً لوگن کی جیب سے نوٹوں کی لسٹ بھی برآمد ہوئی تھی۔ یہ صورتِ حال اگرچہ نازک ضرور تھی لیکن مایوس کن نہیں تھی۔

"غالباً تم ان نوٹوں کی وجہ سے ہمیں قاتل سمجھ رہے ہو۔" میں نے جلدی جلدی ذہن میں اپنی مدافعت کے لیے سوچتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ یہ رقم اس نے ہم دونوں کو ادھار دی تھی۔"

"جھوٹ تو بہت خوب صورت بول لیتے ہو؟" لیفٹیننٹ رینڈل دھیرے سے مسکرایا پھر بولا۔

"میرا خیال ہے مجھے شروع سے ساری بات بتانی پڑے گی۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "غالباً تمہیں یاد ہوگا..... آج سے تقریباً تین چار سال پہلے ایک کار اور ایک موٹر سائیکل کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔"

میں بے ساختہ چونک گیا۔ اس ایکسیڈنٹ کو تو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا پھر بھی میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "حادثے تو روز ہی ہوتے رہتے ہیں اور ان کی خبریں بھی اخبارات میں آتی رہتی ہیں۔" میں نے ہلکے سے توقف کے بعد کہا۔ "تم پتا نہیں کس حادثے کی بات کر رہے ہو؟ پھر میرا کسی حادثے سے کیا تعلق؟ میرے پاس تو کار بھی نہیں ہے۔"

"میں اس ایکسیڈنٹ کی بات کر رہا ہوں۔" لیفٹیننٹ رینڈل نے درشتی سے کہا۔ "جس میں کار والا بھاگ گیا تھا اور موٹر سائیکل سوار دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گیا تھا۔"

یہ سنتے ہی میں اچھل پڑا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ لوگن کا چہرہ مجھے کیوں مانوس اور دیکھا بھالا لگ رہا تھا۔ گویا لوگن ہی وہ موٹر سائیکل سوار تھا جس کا ہماری کار سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا، میرے جسم میں خوف کی لہر سرایت کر گئی۔

تاہم میں نے اپنے چہرے کو سپاٹ بنا لیا۔ خوف کا کوئی تاثر میں نے اپنے چہرے پر نہیں چھلکنے دیا تھا۔

"مجھے اس ایکسیڈنٹ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔" میں نے دروغ بیانی سے کام لیا لیکن میرے لہجے میں اعتماد کا فقدان تھا۔

"ممکن ہے تم درست ہی کہہ رہے ہو۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔ "مگر لوگن کو سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "وہ کل ہمارے پاس آیا تھا اور اس نے تم دونوں کے خلاف رپورٹ درج کروائی تھی۔ اس نے بڑے وثوق سے ہمیں بتایا تھا کہ تم ہی وہ شخص تھے جس کی کار سے چند سال قبل اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ تمہارے خلاف ہرجانے کا دعویٰ کرنا چاہتا تھا لیکن اسے ڈر تھا کہ تم اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرو گے۔" قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "وہ سات ماہ قبل اسپتال سے رخصت ہوا تھا اور جب سے ہی تم دونوں کو تلاش کر رہا تھا۔ حادثے سے ایک لمحہ قبل اس نے تم دونوں کی شکلیں دیکھ لی تھیں جنہیں وہ پھر بھول نہ پایا۔"

کانسٹیبل کی گرفت میرے دونوں بازوؤں پر مضبوط ہو گئی تھی۔

"اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اگر اس کی موت غیر طبعی انداز میں ہوئی تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔" اس نے کہا۔ "یہ رقم اس بات کا ثبوت ہے کہ تم دونوں نے اسے اکیلے میں لے جا کر ٹھکانے لگا دیا۔ رقم اس کے بٹوے میں سے نکال لی اور پستول اس کے ہاتھ میں تھما کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ تمہیں یقین تھا کہ اسے خودکشی کی واردات ہی سمجھا جائے گا۔" اس کا لہجہ یکا یک ہی درشت ہو گیا۔ "لیکن قانون کے محافظ اتنے بھی اندھے نہیں ہوتے جتنا کہ مجرم انہیں سمجھ لیتے ہیں۔"

"لیکن یہ رقم تو خود اس نے ہمیں دی تھی۔" میں نے کھوکھلی آواز میں کہا۔

"ہونہہ..... کوئی احمق ہی اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے بھلا وہ شخص کس طرح تمہیں دو ہزار ڈالر دے سکتا ہے، جسے تم نے زندگی بھر کے لیے اپاہج بنا دیا ہو۔" لیفٹیننٹ رینڈل نے حقارت سے کہا۔ "اب تم یونہی چلنا پسند کرو گے یا ہتھکڑی کی ضرورت پڑے گی؟"

میرے شانے شکست خوردہ انداز میں ڈھلک گئے، ساری بات یک دم ہی مجھ پر واضح ہو گئی تھی۔

لوگن ٹانگوں سے معذور ہو کر زندگی سے دل برداشتہ ہو چکا تھا اور مرنا چاہتا تھا لیکن اس نے خودکشی کرنے کی بجائے یہ کام ہم سے کروایا تاکہ ہم بھی اپنے کیے کی سزا پائیں۔ وہ معذور ہو جانے کے باوجود ہمیں شکست دے گیا تھا۔ پھانسی کا پھندا ہماری گردنوں میں ڈال گیا تھا، جس سے بچاؤ اب کسی صورت میں ممکن نہیں تھا۔

بلاشبہ لوگن ایک ذہین انسان تھا اور اسے انتقام لینا آتا تھا۔ انتقام بھی ایسا کہ جس میں ناکامی کا ایک فی صد بھی امکان نہیں رہا تھا۔

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ الوداعی نظر سے کمرے میں موجود ایک ایک چیز کو دیکھا۔ اب انہیں دوبارہ دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میری بیوی خواب گاہ میں سو رہی تھی لیکن میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ میں اسے جگا کر بتاتا بھی تو کیا..... اور اب بھی اس سے نہ مل پاؤں گا۔

میں نے شانے اچکائے اور دھندلائی آنکھوں سے لیفٹیننٹ کے ساتھ چل پڑا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اقرارِ محبت

راحیلہ تاج

محبت ایک ایسا پودا ہے جسے کبھی مدتوں سینچنا پڑتا ہے تو کبھی یہ لمحوں میں پھوٹ کر ماحول کو ایک انوکھی خوش بو سے معطر کردیتا ہے۔
ایک دل گرفتہ خاتون کا فسانہ' وہ اپنے محبوب کی بے وفائی پر اداس تھی۔

محبت کرنے والوں کے لیے دلوں کو گدگدانے والی ایک لطیف کہانی

مجھے ان کہانیوں پر کبھی یقین نہیں آیا تھا جن میں ہیروئنوں کی بے وفائی سے دل برداشتہ ہو کر ہیرو حضرات فارن لی جن میں بھرتی ہو کر وطن سے بہت دور صحرائی سرحد پر چلے جاتے ہیں لیکن جب بروس نے مجھ سے بے وفائی کی اور گیلی سے ملنے لگا تو میں نے وہی کیا جو کہانیوں کے ہیرو کرتے تھے یعنی اپنا تبادلہ کمپنی مڈل کراس برانچ میں کرالیا اور فارن لی جن میں بھرتی ہو کر بہت دور چلی گئی۔

جب میں بروس کی محبت میں مبتلا ہوئی تھی تو سب نے مجھے منع کیا تھا کہ میں اتنے وجیہہ و شکیل کو خانہ دل کا مکیں نہ بناؤں جو ہر آئیڈیل پرست لڑکی کے تصور پر پورا اترتا ہو مگر میں نے کسی کی نہیں مانی تھی کیونکہ مجھے بروس بہت پرخلوص لگتا تھا۔ دوسرے میری انا کو اس وقت بڑی تسکین ملتی تھی جب لوگ مجھے اس کے ساتھ دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے کہ اس لڑکی نے اتنے اسمارٹ اور خوب رُو آدمی کو اپنی زلف کا اسیر کیسے بنالیا ہے۔ جب گیلی اپنے بے پناہ حسن اور منہ زور شباب کے ساتھ سامنے آئی تو بروس نے مجھے الوداع کہنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ کی۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں مڈل کراس برانچ میں ایک اسامی خالی ہوئی تو میں نے فوراً تبادلے کی درخواست دے دی کہ لوگوں کی ہمدردیاں میرے لیے نشتر بنتی جارہی تھیں۔

مڈل کراس ایک الگ تھلگ سا قدیم شہر ہے جس پر تیز رو وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلیوں نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔ وہاں آج بھی مویشیوں کی ہفتہ وار منڈیاں اور میلے لگتے ہیں۔ وہاں کے باشندے آج بھی اپنی پرانی روایتوں کا دامن تھامے ہوئے ہیں اور انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ زمانہ کتنا آگے نکل گیا ہے۔ انہوں نے مجھ اجنبی کا بھی کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور میں چند ہفتوں میں ہی مقامی سرگرمیوں میں اتنی دلچسپی لینے لگی کہ اپنے بیشتر دکھ اور محرومیاں بھول گئی۔

میں فون کی گھنٹی پر اس کی طرف لپکنا بھی بھول گئی کہ ہوسکتا ہے یہ بروس کا فون ہو۔ تاہم بروس نے میرے دل پر بے وفائی کا جو چرکا لگایا تھا۔ اس کے نتیجے میں میں نے اپنے اور مردوں کے درمیان ایک فاصلہ رکھنا شروع کردیا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر مرد بروس کی طرح بے وفا ہو لیکن میں اپنی جگہ بے حد محتاط ہوگئی۔

مڈل کراس میں رہائشی سہولتوں کا فقدان تھا۔ مجھے جو گھر ملا وہ شہر کے آخری حصے میں، ایک گلی کے اندر واقع تھا۔ اس کا نام بریر کاٹج تھا۔ وہ ان قدیم مکانوں جیسا تھا جو پکچر کارڈز میں دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے بڑے شہتیروں اور چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والے۔ اس کے پچھواڑے ایک چھوٹا سا اصطبل اور ناند بنی ہوئی تھی۔ غالباً پہلا کرایہ دار اپنا گھوڑا وہاں رکھتا تھا۔ خواب گاہ کا فرش بھی قدرے ڈھلوان تھا چنانچہ مجھے پلنگ کے پایوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے پتھر رکھنا پڑے تھے..... پھر یہ مکان دفتر سے میلوں دور تھا اور بس سروس بھی نہیں تھی۔ اچھے موسم میں تو میرے لیے سائیکل پر جانا مشکل نہیں تھا لیکن جب کبھی بارش ہوتی تو مجھے دوپہر تک گیلا لباس پہنے رہنا پڑتا تھا۔

میرے پڑوس میں گراہم رہتا تھا جو ایک فارم کا مالک تھا۔ پہلے دن جونہی میں گھر پہنچی، وہ فوراً آ گیا اور بولا۔ ”میں تمہارا پڑوسی ہوں اور شہر میں دودھ، انڈے سپلائی کرتا ہوں لہٰذا ان چیزوں کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ میں ہر صبح خود پہنچا دیا کروں گا۔“ پھر اس نے مجھے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ”اگر میں تمہارے کسی کام آسکوں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔“

میں اس کی اس ”پیش کش“ کا مطلب سمجھ گئی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اب مجھے مردوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں نے اس کی پیش کش کے جواب میں صرف ایک لفظ ”شکریہ“ کہا تاکہ وہ میرا مطلب سمجھ جائے اور وہ سمجھ گیا کیونکہ وہ اس کے بعد ہر سنیچر کی صبح آکر اپنا بل لے جایا کرتا تھا۔ تاہم میں ہر صبح آٹھ بجے اس کے بھاری بوٹ کی چاپ اور پک اپ کی آواز سننے کی منتظر ضرور رہتی کہ اس طرح مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ رات خیر و عافیت سے گزر گئی ہے۔

شروع کے کئی ہفتے میں نے اپنی آزادی برقرار رکھی پھر موسم برسات شروع ہوا تو طوفانِ بادوباراں کا منظر دیدنی تھا۔ مگر جب وہ وادی سے شہر کی طرف آیا تو اس کی تیزی و تندی دہشت خیز بن گئی۔ یوں لگتا تھا کہ سارے بادل اور ساری بجلیاں میرے گھر کی چھت پر گرج کڑک رہی ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کاٹج بجلی گرنے سے ایک دھماکے کے ساتھ بھسم ہو جائے گا۔

طوفان جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے گزر گیا تو میری جان میں جان آئی اور میں کچن میں پہنچی تاکہ ایک کپ چائے بنا کر پیوں۔ میں نے الیکٹرک کیتلی میں پانی ڈال کر سوئچ آن کردیا۔ پانچ منٹ بعد میں نے کیتلی کا ڈھکنا کھولا تو پتا چلا کہ وہ اسی طرح یخ ہے۔ شاید طوفان کے باعث بجلی فیل ہوگئی تھی۔ میں نے مختلف چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا تاکہ کسی ایک کو توڑ کر اس کی لکڑی سے آگ جلاؤں اور کھانے پینے کا بندوبست کرسکوں۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے گراہم کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”یہ بڑا زبردست طوفانِ بادوباراں تھا۔ غالباً اس کی وجہ سے بجلی فیل ہوگئی ہے۔ ہم تو خیر طوفان اور اس کے اثرات کے عادی ہیں لیکن تم یہاں نئی ہو۔ اس لیے میں نے سوچا کہ ممکن ہے تم نے طوفانی موسم سے نمٹنے کے لیے متبادل انتظام نہ کیا ہو۔ میں تمہارے لیے اسٹوو اور لیمپ لایا ہوں۔ اگر تمہیں ضرورت ہو تو دونوں چیزیں رکھ لو۔“

اپنے اس فیصلے کے باوجود کہ میں کسی مرد کو اپنے

معلومات

☆ ملک ترکی کے عوام بانی اسلامی جمہوریہ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کو ملک پاکستان کا اتاترک سمجھتے ہیں۔

☆ مشہور پختون لیڈر خان عبدالغفار خان نے 1988ء میں اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔

☆ 18 مئی 1989ء کو ملک برما کا نام بدل کر ”میا نمار“ رکھا گیا تھا۔

☆ تھامس جیفرسن امریکا کے تیسرے صدر تھے۔

☆ جاپان کی کرنسی ”ین“ کہلاتی ہے۔

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام ملک عراق میں پیدا ہوئے تھے۔

محمد ندیم..... کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھر کی دہلیز عبور نہیں کرنے دوں گی۔ میں نے گراہم کو یوں خوش آمدید کہا جیسے وہ میرے لیے چراغ الہ دین لایا ہو۔

اسٹوو جلانا بظاہر مشکل نہیں تھا لیکن گراہم نے کہا کہ وہ اس وقت تک وہیں رکا رہے گا جب تک میں اسے جلا کر کچھ تیار نہ کرلوں۔ اگر اسٹوو کارآمد ثابت نہ ہوا تو پھر وہ دوسرے کا انتظام کردے گا۔

میں نے اس کی یہ بات رد نہ کی کہ ابھی بادل قریب ہی گرج رہے تھے اور ان کی دوسری کھیپ بھی آ کر مجھے خوف زدہ کرسکتی تھی۔ چنانچہ میں نے اسٹوو جلا کر چائے بنائی اور ایک کپ گراہم کو بھی دیا۔ یہ ایک اخلاقی تقاضا تھا۔ چائے پینے کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ اس قدآور اور چوڑے شانوں والے آدمی میں کوئی نہ کوئی کشش ضرور ہے۔

دوسرے دن کی صبح بے حد خوب صورت تھی۔ دھلا دھلا نیلا آسمان بہت پیارا لگ رہا تھا اور خوش گوار فضا دیکھ کر یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ گزر جانے والی رات بڑی دہشت انگیز تھی۔ میں سائیکل پر سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہوگئی۔ جب مارکیٹ والے چوک میں پہنچی تو وہاں اژدھام تھا اور سڑک بند تھی۔ ہوا یہ تھا کہ کل رات کے طوفانِ بادوباراں کے باعث چرچ کا مینار گر پڑا تھا۔ یہ چرچ اس علاقے کی قدیم اور یادگار عمارت تھی۔ لوگ اس کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مینار اور چرچ کا بچا کھچا حصہ بھی منہدم کردیا جائے مگر دوسرے ماضی کی شاندار یادگار کے انہدام کے خلاف تھے۔

چرچ اور مینار کی دوبارہ تعمیر کے لیے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ لاٹری کے ٹکٹ فروخت کرکے رقم جمع کی جائے۔ لاٹری کے انعامات کے لیے مقامی گیراج کی طرف سے ایک کار دی گئی۔ کسی نے کھاد کے ٹرک پیش کیے۔ کسی نے کشتی، دو افراد کے لیے تفریحی سفر کے ٹکٹ بھی آ گئے اور چھوٹے انعامات کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ لاٹری کا ٹکٹ خریدنے والے ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی انعام ضرور ملے گا۔

مقامی لوگوں نے بھی دل کھول کر ٹکٹ خریدے اور کچھ رفاہی اداروں نے دوسرے شہروں میں بھی فروخت کیے۔ اس طرح مینار اور چرچ کے بجلی سے منہدم ہونے والے حصے کی تعمیر کے لیے کافی رقم جمع ہوگئی۔

لاٹری کے ٹکٹوں کی فروخت والے ایام میں گراہم جب بھی سنیچر کی صبح کو اپنا بل لینے آتا یہ ضرور کہتا۔ ”میں نے بھی لاٹری کے بہت سے ٹکٹ خریدے ہیں۔ مجھے کسی انعام کی توقع نہیں لیکن اگر میرے نام کھاد کے دو چار ٹرک نکل آئیں تو مزہ آجائے۔“

میں ہنستے ہوئے بتاتی ”میں نے بھی کسی انعام کے لالچ میں ٹکٹ نہیں خریدے لیکن اگر مجھے انعام میں کار مل جائے تو ہر صبح بڑے آرام سے دفتر پہنچ جایا کروں۔

جس روز لاٹری کا نتیجہ نکلنا تھا۔ میں گھر پر ہی رہی۔ میرا خیال تھا کہ یہ مقامی لوگوں کا معاملہ ہے اور اس اجتماع میں انہیں ہی شریک ہونا چاہیے۔ لاٹری کے نتیجے کا علم مجھے گراہم کے ذریعے ہوا جب دوسری صبح اس نے دودھ انڈے دینے کے لیے باورچی خانے کی کھڑکی بجائی۔

میں ڈریسنگ گاؤن کی ڈوری کمر کے گرد کستی ہوئی کچن میں گئی اور کھڑکی کھولی تو وہ مسرت سے لبریز لہجے میں بولا۔ ”ہم نے لاٹری جیتی بلکہ لوٹ لی ہے۔ تمہیں ایک جوان بچھیا انعام کے طور پر ملی ہے اور مجھے کار۔“

مجھے اپنے انعام سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ آخر میں ایک گائے کا کیا کرتی۔ دفتر میں سب نے مجھے مبارک باد دی اور پوچھا۔ ”کیا تم یہ کام چھوڑ کر مویشی

پالنا شروع کردو گی؟“

میں نے سوچا کہ میں انعام میں ملنے والی گائے واپس کردوں گی مگر اسی شام جب وہ کسان جس نے اس گائے کی پیش کش کی تھی۔ گائے میرے گھر لے آیا تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کا نام پوسی تھا۔ وہ بڑی خوب صورت چتکبری گائے تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں مجھے بہت بھلی لگیں اور میں پہلی نظر میں ہی پیار کرنے لگی۔

کسان نے اصطبل یا باڑے کا بغور جائزہ لیا اور باڑ کی تار کو بھی اچھی طرح دیکھا کہ وہ کہیں سے ٹوٹی ہوئی تو نہیں ہے۔ پھر اس نے ناند کا اتنی باریک بینی سے معائنہ کیا جیسے وہ اس میں سونا چاہتا ہو۔ اس کے بعد اس نے مجھے گائے کی دیکھ بھال اور چارے کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

”گراہم تو تمہارے پڑوس میں رہتا ہے۔ وہ اسے دیکھ لیا کرے گا۔“

اگلے چند روز میں نے پوسی پر بھرپور توجہ دی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی میرے جذبات سمجھتی ہے۔ جب میں اسے گھاس دانہ ڈالتی تو وہ ہلکے ہلکے ڈکرا کر جیسے میرا شکریہ ادا کرتی۔ گراہم اپنے بہت سے مویشیوں کی دیکھ بھال کے بعد شام کو وقت نکال کر باڑے کے گیٹ پر آ جاتا اور میرے ساتھ پوسی کے بارے میں باتیں کرتا رہتا۔

اب مجھے پتا چلا کہ کسان باڑوں کے گیٹ پر جھکے باتیں کیوں کرتے رہتے ہیں۔ دراصل مویشیوں کے بارے میں بات چیت ہی ان کی دوستی کا وسیلہ ہوتی ہے۔

دوسرے ہفتے جمعہ کو میں پوسی کی دیکھ بھال کے باعث دیر سے کھانا کھا رہی تھی کہ فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بروس بول رہا تھا۔ ”ہیلو! تم سے بات کیے عرصہ گزر گیا ہے سارہ!“

حیرت ہے کہ مجھے اس کی آواز سن کر خوشی ہوئی نہ دکھ۔ میں نے کہا۔ ”پوسی کی وجہ سے اب میں کھانا کھانے بیٹھی ہوں۔“

”پوسی! وہ کون ہے۔“

”پوسی میری گائے ہے۔ میں نے اسے باڑے میں رکھا ہوا ہے۔“

”گائے! باڑا! تمہارا ارادہ کیا ہے سارہ؟“ بروس نے تعجب سے کہا۔ ”خیر چھوڑو۔ بات یہ ہے کہ میں نے گیلی سے تعلقات ختم کر دیے ہیں۔ وہ میری غلطی اور غلط انتخاب تھی۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہارا مجھ سے ملنا ضروری ہے؟“

”مجھ پر طنز مت کرو سارہ! میں تمہیں اس وقت تفصیل نہیں بتا سکتا کہ ایک پبلک فون بوتھ سے بات کر رہا ہوں اور فون کے انتظار میں کھڑے آدمی کے تیور ٹھیک نظر نہیں آتے۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ کل لنچ تمہارے ساتھ کروں گا اور اتوار کی سہ پہر تک وہیں رہوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

میں سوچ میں پڑ گئی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے! وہ ہفتہ وار تعطیل میرے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ چند ہفتے قبل یہی بات میرے لیے بڑی مسرور کن ہوتی مگر اب نہیں۔ اب تو میں اسے بھول چکی تھی۔ اس کی آمد مجھے خواہ مخواہ ڈسٹرب کرنے کا باعث بنتی۔ میں اسے فون کر کے روکنا چاہتی تھی مگر پھر میں نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا اور سوچا کہ وہ آ جائے تو اچھا ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے سب سے پہلے دروازے کا لاک دیکھا۔ وہ ٹھیک تھا۔ پھر میں نے کھانے کی میز تیار کی۔ رات کو میں نے گراہم کے نام ایک رقعہ لکھا کہ ہفتہ وار تعطیل کے لیے زیادہ دودھ رکھ جائے۔

صبح کو گراہم نے دروازہ کھٹکھٹایا اور پوچھا۔ ”کیا تمہارے ہاں مہمان آ رہے ہیں۔ اگر کریم درکار ہو تو بتا دو۔“

”نہیں، شکریہ گراہم۔ میرا دوست بروس لندن سے ہفتہ وار تعطیل منانے آ رہا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے دروازہ بند کر دیا اور کچن میں چلی گئی۔

بروس لنچ کے وقت پہنچ گیا۔ وہ شرٹ اور پینٹ میں بچ رہا تھا۔ ابھی میں بروس سے کھل کر بات بھی نہیں کر پائی تھی کہ پوسی ڈکرانے لگی۔ یہ اس کے چارے دانے کا وقت نہیں تھا۔ میں اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اندر آئی تو وہ پھر ڈکرانے لگی۔ مجھے اس کے ناوقت اور یوں بری طرح ڈکرانے سے خیال آیا کہ کہیں وہ بروس سے جیلس تو نہیں ہو گئی۔ مگر پھر میں نے اپنا یہ خیال احمقانہ تصور کرتے ہوئے رد کر دیا۔

جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو بروس برہمی سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہاری گائے ڈکرا ڈکرا کر کانوں کے پردے پھاڑ رہی ہے۔ کیا تم اسے خاموش نہیں کرا سکتیں۔“

”اس نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ اگر اس نے ڈکرانا بند نہ کیا تو مجھے گراہم کے پاس جا کر پوچھنا پڑے گا۔“

”یہ گراہم کون ہے؟“ بروس نے پوچھا۔

”میرا ہمسایہ ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے۔ ہمیشہ میری مدد کرتا ہے۔“

”تم اس سے خاصی متاثر لگتی ہو۔ اچھا ہوا کہ میں آ گیا۔“

میں اس سے آگے کچھ نہ سن سکی کیونکہ پوسی نے پھر ڈکرانا شروع کر دیا تھا اور اس کی آواز بہت قریب سے آ رہی تھی۔ میں نے چیختے ہوئے کہا۔ ”تم کیا کہہ

رہے ہو بروس؟ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔“

”میں چیخ چیخ کر تو بات کرنے سے رہا۔ مجھے ہی تمہاری گائے کو ٹھیک کرنا پڑے گا۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلا اور گائے کو گالیاں بکنے لگا۔

میں بھی باہر نکل آئی۔ میں نے دیکھا کہ بروس گائے کو صرف گالیاں ہی نہیں بک رہا بلکہ اسے پتھر بھی مار رہا ہے اور وہ باڑے میں ادھر ادھر دوڑتے ہوئے ڈکرائے جا رہی ہے۔

”اسے مت مارو ظالم!“ میں چلائی۔ ”تمہیں اس کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ میں گراہم کو بلاتی ہوں۔“

گراہم! جب سے میں یہاں آیا ہوں تمہاری زبان پر یہی نام ہے۔ میں شہر جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلا۔ چند لمحوں بعد مجھے کار کا دروازہ بند ہونے اور پھر کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ جب میں گھر سے باہر آئی تو گراہم کی گائیں کار کے آگے آگے بھاگ رہی تھیں اور ان کے رکھوالے انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اتنے میں گراہم بھی بروس کی کار کے پاس پہنچ گیا اور دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہونے لگی جو گالم گلوچ میں بدل گئی۔ میں جلدی سے پلٹی اور باڑے میں آ گئی جہاں پوسی ابھی تک ڈکرائے جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد گراہم وہاں آ گیا اور غصے سے بولا۔ ”میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ تم اپنی گائے کی دیکھ بھال ٹھیک سے نہیں کرتیں۔ تمہاری اس بچھیا کی وجہ سے میری گائیں بھی جوش میں آ گئیں۔ اگر میں بروقت نہ پہنچ جاتا تو تمہارا پاگل بوائے فرینڈ انہیں مار ڈالتا۔“

”وہ میرا بوائے فرینڈ نہیں اور پلیز ذرا پوسی کو دیکھو۔ وہ کس بری طرح ڈکرا رہی ہے۔ کیا ہو گیا ہے اسے؟“

”کیا تم واقعی نہیں جانتیں کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟“ گراہم نے تعجب سے کہا۔

”یہ بھی اس طلب کی وجہ سے بے تاب و بے چین ہے جس میں میں مبتلا ہو گیا ہوں۔“

”تم کس طلب میں مبتلا ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”ساتھی کی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ ساتھی تم ہو۔“

میں بھی مسکرا دی۔ میری یہ مسکراہٹ اس بات کا اقرار تھی کہ میں بھی اس کی ساتھی بننے کو تیار ہوں۔

❀❀❀

میری اور گراہم کی شادی کو ایک ماہ ہونے والا ہے۔ جو اسی ٹوٹے ہوئے مینار والے چرچ میں ہوئی تھی جس کی تعمیر کے لیے ہم نے لاٹری کے ٹکٹ خریدے تھے۔ گراہم نے وہ کار مجھے دے دی ہے اور میں نے اپنی گائے گراہم کو۔ وہ مجھ سے کہتا ہے کہ مجھے تو لاٹری میں کار نہیں تم ملی ہو اور میں اس سے کہتی ہوں کہ مجھے انعام میں بچھیا نہ ملتی تو تم میرے شوہر کیسے بن سکتے تھے؟

تب وہ اثبات میں سر ہلا کر اعتراف کرتا ہے کہ ہاں جب تک بچھیا نہیں آئی تھی۔ تم مجھے لفٹ ہی نہیں دیتی تھیں۔ میں بچھیا کا شکر گزار ہوں کہ جس نے تمہیں میری بیوی بنا دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سچی موتی

اقبال بھٹی

ایک ادھیڑ عمر میاں بیوی کا احوال' ان کا لوگوں سے پیار اور شفقت سارے علاقے میں مشہور تھا. ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کے در سے کوئی بھوکا نہیں لوٹتا. دو نوجوانوں کا قصہ' انہیں اس بوڑھے جوڑے کی محبت راس نہیں آسکی تھی.

مغرب سے درآمدہ ایک ایسی کہانی جو آپ کے لیے سوچ کے کئی در وا کردے گی

سڈنی سے لیورپول تک کے راستے میں بحری علاقے کا وہ واحد ہوٹل تھا جو غریب اور کم اجرت پانے والوں کا مرکز تھا اور اس بندرگاہ پر کوئی جہاز کم از کم سات دن تو لنگر انداز ہوتا ہی تھا۔ اس عرصے میں کم اجرت پانے والے مزدوروں کے لیے ٹام ورتھ کا یہ ہوٹل کسی جنت سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اس بندرگاہ سے جہازوں میں سامان لادا جاتا تھا۔ مقامی لوگ سامان لادنے کا کام کرتے تھے اور اپنے کام کے بدلے میں اجرت کے علاوہ کچھ ایڈوانس بھی مانگ لیتے تھے اور شہر میں جا کر ہوٹلوں میں مزے اڑاتے تھے۔ جب کہ جہاز پر ملازمت کرنے والے ملاح صرف ایک شفٹنگ کمانے کے لیے ایک ایک مہینے کام کرتے تھے پھر بھی اپنی مرضی کی اجرت ملنے پر انہیں شبہ ہی رہتا تھا اور اگر انہیں اجرت مل جاتی تھی تو وہ اپنا وقت ملر پوائنٹ پر واقع ٹام ورتھ کی جنت میریز چلے جاتے تھے۔ یہ جگہ ٹام ورتھ اور اس کی بیوی نے جسے ملاح پیار سے آنٹی وم کہتے تھے' چند سال پہلے قائم کی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کا پیار سارے علاقے میں مشہور تھا پھر بھی اگر کبھی ان دونوں میں لڑائی بھی ہوتی تب بھی آنے والے ملاحوں کو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ آنے والوں کو مناسب قیمت پر اچھا کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ نہانے کے لیے گرم پانی اور پرسکون کمرہ جہاں قیام کرنے والا سکون سے سو سکے یا جو بھی کام چاہے کر سکے۔

یہاں ایک سہولت اور میسر تھی اور وہ یہ کہ اگر کسی ملاح کی حالت مستحکم نہ ہوتی تو وہ یہاں اپنا حساب کھول سکتا تھا اور مہینوں ادھار پر گزارا کر سکتا تھا جب تک کہ اسے کوئی معقول ملازمت نہ مل جائے۔ اس سے رقم کا مطالبہ بھی نہیں کیا جاتا تھا لیکن بیشتر سیاح ایسا کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

ایک رات..... جنیٹ اور بارکلے اس ریسٹورنٹ میں پہنچے۔ اس رات ان کے پاس ایک چھوٹی سی رقم تھی اور وہ اس سے عیش کرنا چاہتے تھے۔ دونوں نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور ٹام ورتھ کے ریسٹورنٹ میریز پہنچے تھے۔

جنیٹ کبھی ایک جہاز میں سنیئر ارنٹس تھا اور آئندہ اسے ایک اہم عہدہ ملنے کی توقع تھی لیکن اسے سمندر سے نفرت تھی پھر بھی وہ پیسوں کی خاطر ملازمت کرتا رہا اور آج وہ ایک مسافر بردار بحری جہاز کا کموڈور اسکیپر تھا لیکن جن دنوں میں وہ محض ایک اپرنٹس تھا اس کے پاس پیسوں کی قلت رہتی تھی جب وہ اپنے دوست کے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں پہنچا تو اس نے چند بن منگوائے تھے اور اپنے دوست کے ساتھ بیٹھ کر ان بنوں ہی سے بھوک مٹائی تھی۔ اس کے بعد وہ جوا کھیلتے رہے تھے اور ریسٹورنٹ میں بجنے والی موسیقی سے لطف اندوز ہوتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ

بور ہو گئے اور انہوں نے واپس اپنے جہاز پر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر وہ لوگ ریسٹورنٹ سے باہر نکل ہی رہے تھے کہ انہیں آنٹی وم نے روک لیا تھا۔

"ہیلو لڑکو! تم اتنی جلدی جا رہے ہو؟" انہوں نے ہمیشہ کی طرح نرم لہجے میں کہا۔

"ہم دراصل بور ہو گئے تھے چنانچہ واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔" جنیٹ نے کہا۔

"ارے تو ایسی بھی کیا بات ہے بھئی۔ تم لوگ میرے شوہر اور میرے ساتھ آج رات کا کھانا کھاؤ۔ تم آج ہمارے گھر میں ہمارے مہمان بن کر رہ سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم ضرور کھانے میں شریک ہوں گے۔" جنیٹ کے دوست بارکلے نے جنیٹ کے بولنے سے پہلے کہا۔

بارکلے کے جواب پر آنٹی وم بہت خوش ہوئی تھیں اور وہ دونوں واپس اپنی میز پر آ بیٹھے تھے۔ پھر دو گھنٹے بعد جب وہ دونوں وہاں بیٹھے بیٹھے بور ہو گئے اور ریسٹورنٹ سے تمام گاہک جا چکے تب آنٹی وم نے ریسٹورنٹ بند کیا تھا اور ان کے بوڑھے شوہر نے اپنی جیسی پرانی فورڈ گاڑی نکال کر اسٹارٹ کی اور ان دونوں کو اس میں بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر وہ دونوں کو اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں لے گئے جو ڈالنگ ہرٹ میں واقع تھا۔ اس علاقے میں یوں تو ایسے بہت سے لوگ رہتے تھے جو بندرگاہ پر کام کرتے تھے لیکن بارکلے اور جنیٹ اس علاقے میں پہلی بار آئے تھے پھر آنٹی وم نے ان کے لیے کھانا تیار کیا تھا جس میں گوشت کے ساتھ بہت سی سبزیاں بھی شامل کی گئی تھیں۔ کھانا بہت مزیدار تھا اور بارکلے اور جنیٹ نے خوب سیر ہو کر کھایا تھا۔ کھانے کے بعد آنٹی وم انہیں سٹنگ روم میں لے آئی تھیں۔ جہاں کافی دیر تک وہ لوگ باتوں میں مشغول رہے تھے۔

آنٹی زیادہ وقت اپنی بیٹی کے بارے میں باتیں کرتی رہی تھیں جو نیو برٹن میں رہتی تھی اور جس کی شادی ایک ہیڈ کارگو کلرک سے ہو گئی تھی۔ ان کے بچے بھی تھے جن کی یاد آنٹی کو بہت ستاتی تھی۔ آنٹی نے اپنے نواسے نواسیوں کی تصاویر بھی ان دونوں کو دکھائیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور وہ بہت جذباتی ہو گئی تھیں پھر کچھ دیر بعد آنٹی کے شوہر نے گفتگو کا رخ موڑ دیا اور ان دونوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے تھے جب بحری سفر کرنا ایک بہت ہی مشکل کام ہوتا تھا اور آنٹی کے شوہر بھی ایک زمانے میں بندرگاہ پر کام کرتے رہے تھے پھر انہوں نے اپنی رہائش کے لیے اس علاقے کو مستقلاً پسند کر لیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب بھی وہ بے کار نہیں ہیں بلکہ ان کے کاندھوں پر کچھ ذمے داریاں ہیں جنہیں وہ پورا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بندرگاہ پر کام کرنے والے لوگوں کے لیے خدمات انجام دے رہے تھے۔ جب وہ کام کرنے والے بھوکے پیاسے ہوتے تو وہ انہی کے ریسٹورنٹ کا رخ کرتے تھے اور آنٹی کے شوہر کو ان کی خدمت کر کے سکون ملتا تھا۔ ان کی ان باتوں نے بارکلے پر بہت اثر چھوڑا تھا اور جنیٹ بھی متاثر نظر آ رہا تھا۔

جنیٹ اور بارکلے تقریباً ساری رات ہی وہاں ٹھہرے تھے اور اس عرصے میں آنٹی اور ان کے شوہر نے ان سے بہت سی باتیں کی تھیں پھر آنٹی کے شوہر نے پیشکش کی تھی کہ وہ ان دونوں کو بندرگاہ تک چھوڑنے خود جائیں گے۔ بارکلے نے انہیں منع بھی کیا تھا کیونکہ وہ خاصے تھک چکے تھے اور ان کی عمر بھی اتنی تھی کہ اپنے فلیٹ میں پہنچنے کے لیے انہیں جو سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں ان کے لیے وہ بھی کافی تھکن کا باعث تھا لیکن بارکلے اور جنیٹ کے منع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کے باجود وہ نہیں مانے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بارکلے اور جنیٹ وہاں سے پیدل جائیں۔ آنٹی نے ان دونوں سے وعدہ لیا تھا کہ وہ جب بھی اس علاقے سے گزریں گے جہاں ان کی بیٹی رہتی ہے تو وہ اس سے ملنے ضرور جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ بہت سے لوگوں کو پہلے بھی اپنی بیٹی کی خیریت کا پتا کرنے کے لیے بھیج چکی ہیں اور ان کا اپنی بیٹی سے ملنے کا یہ بھی ایک رابطہ ہے۔ وہ لوگوں کو اکثر کچھ چیزیں بھی دیتی تھیں جو وہ ان کی لڑکی تک پہنچاتے تھے چنانچہ انہوں نے ان دونوں کو بھی چند چیزیں دی تھیں جو انہیں ان کی لڑکی تک پہنچانی تھیں۔ ان چیزوں میں آنٹی کے ریسٹورنٹ کے فوٹو اور ایک کیک شامل تھا جو آنٹی نے اپنے نواسے کی سالگرہ کے لیے بنایا تھا۔ انہوں نے وہ کیک کھول کر ان دونوں کو بھی دکھایا تھا۔ اس کا رنگ براؤن تھا اور وہ بہت خوش رنگ لگ رہا تھا۔ اس کی سطح پر المنڈ گولڈن شوگر سے ڈیزائن بنایا گیا تھا۔ آنٹی نے وہ کیک ایک ڈبے میں پیک کر دیا تھا اور واپسی پر ان دونوں کے ساتھ کر دیا تھا۔ انہوں نے اس ڈبے پر ایک کاغذ کی چٹ پر اپنی بیٹی کا نام اور پتا لکھ کر چپکا دیا تھا۔

اپنے جہاز پر پہنچنے کے بعد بارکلے نے وہ کیک کا ڈبہ اپنے صندوق میں رکھ کر لاک کر دیا تھا اور سفر کے دوران اس کی بہت حفاظت کی تھی کیونکہ ان کی اجرت بہت کم تھی اور بعض اوقات ان کے پاس پینے کے لیے اپنے سگریٹ بھی نہیں ہوتے تھے۔ ایسے حالات میں بھی بارکلے تو گزارا کر لیتا تھا لیکن جنیٹ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی تھی اور جب اسے بھوک لگتی تھی تو وہ بارکلے سے درخواست کرتا تھا کہ وہ آنٹی کے کیک میں سے ایک ٹکڑا کاٹ کر اسے دے دے۔ اس طرح اس کی بھوک بھی مٹ جائے گی اور ایک سلائس کٹ جانے سے کوئی فرق بھی نہیں پڑے گا یا پھر یہ کہ وہ درخواست کرتا کہ لیور پول پہنچنے کے بعد وہ ایسا ہی دوسرا کیک خرید کر ان کی بیٹی کو دے دیں گے لیکن بارکلے اس کی بات نہیں مانتا تھا اور اس نے لیور پول پہنچنے تک اس کیک کی اپنی جان کی طرح حفاظت کی تھی اور اپنے صندوق کی چابی بھی جنیٹ سے چھپا کر رکھتا تھا۔

جب ان کا جہاز لیور پول پہنچا تھا تو ان دونوں کو ہی فرصت نہیں ملی تھی کہ کسی اور معاملے پر سوچ سکیں سوائے اس کے کہ جہاز پر لدا ہوا مال گودی پر اتاریں اور گودی سے نیا مال جہاز پر سوار کریں تاکہ اسے آگے پہنچایا جا سکے دوسری صبح جہاز کو لیور پول سے روانہ ہو جانا تھا۔

ان لوگوں نے کام کی زیادتی کی وجہ سے دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور بڑی مستعدی سے کام میں مصروف تھے کہ انہیں اچانک ایک شخص اپنی طرف آتا نظر آیا جس کا تعلق ہرگز بھی جہاز کے عملے سے نہیں تھا۔ وہ ان کے قریب آ کر رک گیا تھا اور انہیں بغور دیکھ رہا تھا۔

"کیا تمہارا نام بارکلے ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" بارکلے نے جواب دیا۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" اس نے کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"ہمیں ایک خط ملا ہے جو میری ساس نے بھیجا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ تم لوگ ہمارے بچوں کے لیے ان کا بھیجا ہوا ایک کیک لا رہے ہو۔"

"وہ میرے کیبن میں ہے لیکن....."

"تم کیا کر رہے ہو؟ تمہیں باتوں سے فرصت نہیں ہے۔" بارکلے کی بات اس آواز سے ادھوری رہ گئی تھی اور اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تھا جہاں اس

کا منتظم اعلیٰ کھڑا تھا وہ کام کرنے والوں کی نگرانی کر رہا تھا اور بارکلے کو باتیں کرتا دیکھ کر اسے ڈانٹ رہا تھا۔

"میں کام ہی کر رہا ہوں۔" بارکلے نے کہا اور پھر اجنبی کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں جتنی جلدی ممکن ہوا وہ کیک اپنے کیبن سے لے کر آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں تمہیں گودی کے دروازے کے قریب ہی ملوں گا۔" اجنبی نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس پر بارکلے نے شکر ادا کیا کیونکہ وہ اپنے منتظم کا غصہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

پھر تقریباً شام سات بجے کے قریب بارکلے اور جنیٹ کو فرصت ملی تھی اور وہ نہا دھو کر تیار ہوئے تھے پھر بارکلے نے کیک کا ڈبہ اپنے صندوق سے نکالا تھا اور وہ دونوں گودی کے دروازے پر پہنچے تھے جہاں دروازے کے نگراں نے انہیں روک کر انگوائری کی تھی اور کیک کا ڈبہ بارکلے کے ہاتھ سے لے کر اس کی پیکنگ کھولی تھی پھر مطمئن ہونے کے بعد ڈبہ واپس اسے پکڑا دیا تھا لیکن انہیں وہ اجنبی کہیں نہیں ملا تھا چنانچہ بارکلے نے اس پتے کا سہارا لیا تھا جو آنٹی وم نے اسے لکھ کر دیا تھا اور وہ دونوں تھوڑی سی تگ و دو کے بعد اس پتے پر پہنچ گئے تھے۔ راستے کے اخراجات بارکلے ہی نے ادا کیے تھے کیونکہ جنیٹ کے پاس بالکل رقم نہیں تھی۔

گھر کے دروازے پر جنیٹ نے دستک دی تھی جس کا جواب ذرا تامل سے ملا تھا۔ دروازہ کھولنے والی کوئی عورت تھی اور اس نے دروازے کی جھری سے جھانک کر باہر دیکھا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"مسز پامل، ہم بندرگاہ پر کام کرنے والے ہیں ہمیں آپ کی والدہ نے سڈنی سے ایک کیک دے کر بھیجا ہے۔" بارکلے نے کہا۔

"کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟" اندر سے پوچھا گیا۔

"میرے ساتھ میرا دوست ہے اور بس۔" بارکلے نے کہا اور اس کے جواب کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا اور اندر ملگجی سی روشنی میں بارکلے کو ایک چہرہ نظر آیا، وہ خاتون بہت سراسیمہ سی لگ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے تم جلدی سے اندر آ جاؤ۔ سرگوشی میں کہا گیا اور دونوں دروازے میں قدم رکھ کر ایک تاریک سے ہال میں داخل ہو گئے پھر انہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑا تھا اور خاتون نے کمرے کی کھڑکیوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے گرا دیے تھے۔ اس کے بعد اس نے کمرے کی لائٹ آن کی تھی اور بارکلے اور جنیٹ کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی کیونکہ وہ کمرہ کسی طرح بھی ایک معمولی کلرک کا کمرہ نہیں لگتا تھا۔ اس کمرے میں بیش قیمت سامان سجا ہوا تھا اور خاتون بھی اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے بہت امیر معلوم ہوتی تھی۔ بارکلے نے جنیٹ کی آنکھوں میں دیکھا تھا وہ بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ انہیں آنٹی وم کی باتیں یاد آ رہی تھیں جو انہوں نے اپنی بیٹی کے بارے میں انہیں سڈنی میں بتائی تھیں۔

خاتون نے بارکلے کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیکٹ کی طرف دیکھا اور پھر اسے لینے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائے۔

"کیا یہی ہے؟" اس نے پوچھا۔ بارکلے نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پیکٹ اس کے حوالے کر دیا۔ پیکٹ لینے کے بعد اس عورت نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی نظروں میں سوالیہ تاثر تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے..... تم ایک سیکنڈ رکو۔" اس نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔

"اوہ..... بے چاری غریب آنٹی۔ یہ ان کی بیٹی تو بہت مختلف ہے۔" جنیٹ نے کہا۔

وہ لوگ کچھ دیر بے چینی سے کھڑے اس کا انتظار کرتے رہے۔ ان کی ٹوپیاں ان کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔ چند منٹوں کے بعد وہ خاتون واپس آئی تھی لیکن اب اس کا انداز مختلف تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کے ہاتھوں میں کافی کی ٹرے تھی۔

"میں تمہیں انتظار کروانے کی معافی چاہتی ہوں۔ بھلا تم بھی کیا سوچ رہے ہوگے؟ بیٹھو میں تمہارے لیے کافی نکالتی ہوں۔"

"نہیں شکریہ۔" بارکلے نے کہا۔ "دراصل ہمیں فوراً ہی واپس جانا ہے۔"

"ارے ایک کپ کافی سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" اس نے پیالیوں میں کافی ڈالتے ہوئے کہا۔

"دراصل ہم کھانے سے پہلے کافی نہیں پیتے۔" جنیٹ نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں معافی چاہتی ہوں۔ دراصل میرے پاس اس وقت کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے جو میں پیش کرسکوں۔" اس عورت نے کہا۔ "یہی ہوسکتا ہے کہ میں تمہیں تھوڑا سا کیک پیش کردوں۔" اس نے پیالیوں میں کافی انڈیل کر انہیں ان دونوں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ کیک تمہارے لڑکے کی سالگرہ کے لیے ہے۔" جنیٹ نے پوچھا۔

"اوہ..... میری لڑکی۔" ایک لمحے کو وہ عورت حیرت زدہ سی نظر آئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود پر جیسے قابو پالیا تھا۔

"تمہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل اس کو چینی کی چیزیں منع ہیں اور میں نے یہ بات اپنی ماں سے چھپائی ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ انہیں دکھی کروں۔ تم اگر چاہو تو کیک کھا سکتے ہو۔ میں نے تھوڑا سا چکھا ہے۔ وہ بہت مزیدار ہے۔"

"نہیں شکریہ۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔" جنیٹ نے بارکلے کی توقع کے خلاف کہا اور بارکلے کو پہلی بار خوشی کا احساس ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بہت مشکور ہوں۔" اس عورت نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور چند نوٹ ان دونوں کی طرف بڑھائے۔

"یہ تمہارے کام کا حقیر سا معاوضہ ہے۔" اس نے رقم جنیٹ کے ہاتھ میں دے دی اور جنیٹ کا رنگ حیرت سے سفید پڑ گیا۔

"اس رقم کو اپنے لاکر میں رکھ دینا میڈم! آپ نے ہمیں کیا سمجھا ہے؟" جنیٹ نے غصے سے کہا۔

"ارے تم ناراض ہوگئے۔ اس میں ایسی خفگی کی کیا بات ہے۔" اس عورت نے کہا اور ان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔

"آپ کے شوہر آج جہاز پر مجھ سے ملے تھے اور مجھ سے کیک کے بارے میں پوچھا تھا۔" بارکلے نے چلتے چلتے اس عورت سے کہا۔

"میں اس وقت بہت مصروف تھا چنانچہ کیک انہیں نہیں دے سکا پھر انہوں نے کہا کہ وہ ڈیک کے گیٹ کے پاس مجھے ملیں گے لیکن جب میں کیک لے کر وہاں پہنچا تو وہ وہاں نہیں تھے۔"

"اوہ..... اچھا اگر تم اب ان سے ملو تو انہیں میری طرف سے شکریہ کہنا اور کہنا کہ وہ گھر جلدی آجائیں۔" اس عورت نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ

دونوں اس کے مکان سے باہر آگئے۔

"اچھا بارکلے تم جنیٹ کا خیال رکھنا اور اسے رات کا کھانا وقت پر کھلانا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور دروازہ بند کرلیا۔

واپسی پر وہ دونوں آنٹی وم کی اس بیٹی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے واپس آئے تھے جو ان کی توقعات پر پوری نہیں اتری تھی۔

جہاز پر واپس آنے کے بعد انہیں پتا چلا تھا کہ ان کا جہاز فوراً ہی گلاسگو کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔

اس کے بعد چونکہ ان کی یادداشت اتنی اچھی بھی نہیں تھی چنانچہ کچھ ہی عرصے بعد وہ لوگ اس واقعے کو تقریباً بھلا بیٹھے تھے پھر انہیں اس بات کی یاد اچانک ایک واقعے نے دلائی تھی اور یہ واقعہ جنیٹ کے ساتھ پیش آیا تھا۔

پورٹ سعید کی بندرگاہ پر جہاز میں سامان لادنے والے مختلف پیکٹ اور ڈبے اور میگزین جہاز پر لاد رہے تھے۔ جنیٹ کی نظر ایک میگزین پر پڑی اور وہ اس پر چھپی ہوئی تصویر غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد اس نے وہ میگزین بارکلے کو دکھایا تھا اور ہاتھ سے اس تصویر اور اس کی خبر کی طرف بارکلے کی توجہ دلائی تھی۔ اس میگزین میں آنٹی وم کی بیٹی مسز پلمل کی تصویر تھی اور خبر میں لکھا تھا کہ وہ اپنے گھر میں مردہ حالت میں پائی گئی ہے اور اسے اتنا مارا گیا ہے کہ اس کی موت واقع ہوگئی ہے۔ اس کی موت کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی لیکن پولیس چند شہادتوں پر تحقیقات کررہی ہے اور جلد ہی قاتل کی گرفتاری متوقع ہے۔ خبر میں یہ بھی لکھا تھا کہ پولیس جلد ہی ان دو ملاحوں تک بھی پہنچنے والی ہے جو مسز پلمل کی موت والی رات اس کا پتا پوچھتے ہوئے پائے گئے تھے۔ پولیس ان سے سوالات کرنا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ مسز پلمل کا شوہر بھی شک کی بنا پر کسی اور کیس میں پولیس کی حراست میں تھا چنانچہ وہ اپنی بیوی کے قتل کے شبہے سے آزاد قرار دیا گیا تھا۔

"آخر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" جنیٹ نے بارکلے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہ ہم اسکیپر سے ملیں اور جو کچھ ہم جانتے ہیں اسے بتادیں۔"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟" چند لمحے سوچنے کے بعد بارکلے نے کہا۔

"نہ تو ہم نے یہ جرم کیا ہے اور نہ ہی ہم اس کے بارے میں انہیں کچھ معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں سوائے اس کے کہ جب ہم واپس ہوئے تھے تو وہ ٹھیک ٹھاک تھی لیکن ہماری بات پر بھلا کون یقین کرے گا پھر اسکیپر کو یہ سب کچھ بتانے کا مطلب ہوگا کہ ہمارا باقی کا سفر بھی اچھا نہیں کٹے گا۔ اور ہمیں بار بار پولیس کا سامنا کرنا پڑے گا بہتر یہی ہے کہ ہم کچھ نہ کہیں اور سڈنی پہنچنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھایا جائے۔ ممکن ہے اس وقت تک پولیس بھی اصل مجرم کو گرفتار کرچکی ہو اس طرح ہم شک سے بھی آزاد ہوجائیں گے اور اگر ایسا نہیں بھی ہوا تو ہم آنٹی وم سے تو مل ہی سکیں گے اس کے بعد ہم پولیس کو بھی سب کچھ بتادیں گے۔"

پھر انہوں نے یہی کیا تھا وہ سڈنی پہنچنے تک خاموش رہے تھے پھر جہاز کے لنگر انداز ہوتے ہی وہ آنٹی وم کے ریسٹورنٹ پہنچے تھے جہاں معمول کے مطابق گاہکوں کا ہجوم تھا۔ انہی وہ ریسٹورنٹ کے باہر ہی تھے کہ نیلے رنگ کی یونیفارم میں ایک پولیس افسر ان کی طرف بڑھا۔

"تم بارکلے اور جنیٹ ہو؟" اس نے پوچھا اور ان دونوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اثبات میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سر ہلا دیا۔

"تمہیں چند سوالات کے جواب دینے کے لیے ہمارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا۔" اس افسر نے کہا اور ان دونوں کو قریب کھڑی گاڑی میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی میں پہلے سے دو پولیس مین اور موجود تھے ایک تو اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھا تھا اور دوسرا اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ شاید میری بات پر یقین نہ کریں اور آپ کو میری بات احمقانہ لگے لیکن ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم آنٹی وم سے ملنے کے بعد آپ کے پاس آئیں گے۔" بارکلے نے نیلی وردی والے آفیسر سے کہا۔

"واقعی۔" آفیسر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اب جب تک ہم ہیڈ کوارٹر نہ پہنچ جائیں تم اپنی انرجی ضائع مت کرنا۔"

ہیڈ کوارٹر کا راستہ طویل نہیں تھا۔ انہیں ایک بڑی سی بلڈنگ کے سامنے اتارا گیا تھا اور پھر آفیسر اپنے ساتھ اندر لے گیا تھا اور ایک خالی کمرے میں لے جانے کے بعد دونوں کو دھکا دے کر کرسیوں پر بٹھا دیا گیا تھا۔

"پولیس یہ نہیں کر سکتی۔" بارکلے نے چیخ کر کہا تھا۔

"پولیس والے یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ویسے ہمارا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔" نیلی وردی والے نے کہا اور دوسرا اپنی جیکٹ اتارنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک آہنی دستانہ پہن لیا تھا۔

"میں سچائی اگلوانا جانتا ہوں۔" اس نے کہا اور جینٹ کی گھگی بندھ گئی۔

"میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" جینٹ نے کہا۔ "یہ سب کیا دھرا اسی کا ہے۔" اس نے بارکلے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا تھا۔ میں کہتا ہوں یہ سب اس نے کیا ہے۔ تم اس سے پوچھو یہ تمہیں خود بتا دے گا۔" جینٹ نے پھر کہا اور اس کی بات سنتے ہی وہ تینوں بارکلے کی طرف مڑ گئے۔ بارکلے خاموش بیٹھا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے کانوں میں اب بھی جینٹ کی سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بارکلے نے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ کر چہرہ چھپا لیا۔ وہ منتظر تھا کہ اب کسی بھی لمحے اس کے چہرے پر ضرب پڑنے والی ہے۔ اچانک اس کے کانوں سے جینٹ کی تیز آواز ٹکرائی۔

"تم سب اپنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" اس آواز پر بارکلے نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس کے سامنے جینٹ کسی پولیس آفیسر کی طرح کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جو اس نے ان تینوں میں سے کسی کے ہولسٹر سے نکالا تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماہر نشانہ باز ہو۔

"تینوں افراد مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

"احمقانہ باتیں مت کرو لڑکے، چلو کیوں نہ ہم آپس میں معاملہ نمٹا لیں۔" ان میں سے سب سے بڑے شخص نے جینٹ سے کہا۔ ان تینوں کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔

"کیوں نہیں۔" جینٹ نے پستول ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا اور دوسرے ہی لمحے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے اس شخص کے منہ پر زبردست مکا مارا اور وہ شخص نیچے جھکتا چلا گیا۔

"اب بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

جینٹ نے غصے سے کہا اور انہیں بے تحاشہ مارنے لگا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کو بالکل ہی بھول گیا تھا پھر بارکلے بھی اس کے ساتھ لڑائی میں شامل ہو گیا لیکن وہ دونوں جہاز پر محنت کی وجہ سے بہت تھکے ہوئے تھے چنانچہ زیادہ دیر تک لڑ نہیں سکتے تھے اور کچھ ہی دیر بعد ان کے بازو جواب دے گئے اور ایسے میں موقع ملتے ہی وہ دونوں بھاگتے ہوئے اس عمارت سے باہر آ گئے پھر جو بھی پہلی کار انہیں نظر آئی اس سے انہوں نے لفٹ مانگ لی اور سیدھے اپنے جہاز پر پہنچ گئے۔ ریوالور اب بھی ان کے پاس تھا جسے انہوں نے لاکر میں رکھ دیا تھا اور ڈر کے مارے ان دونوں کا برا حال تھا وہ دونوں اپنے کیبن تک محدود ہو گئے تھے۔

"آخر تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں اس سارے چکر کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بھلا سارے چکر سے تمہارا مطلب کیا تھا؟" بارکلے نے کچھ دیر بعد جینٹ سے پوچھا۔

"بھلا میں کیسے جان سکتا ہوں۔" جینٹ نے جواب دیا۔

"میں تو ان لوگوں کی توجہ پہلے خود سے ہٹانا چاہتا تھا تاکہ میں ان کے ریوالور پر قبضہ کر سکوں اور پھر میں اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا تھا اور تم..... تم بالکل احمقوں کی طرح بے کار ہی بیٹھے رہے تھے۔" جینٹ نے چڑانے والے انداز میں کہا۔

اگلے روز بارکلے اور جینٹ نے یہ خبر بڑے اطمینان سے سنی تھی کہ آنٹی وم اور ان کے شوہر چونکہ اپنے ریسٹورنٹ کی آمدنی کا ٹیکس ادا نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ان کا ریسٹورنٹ چند ہفتوں کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ بارکلے اور جینٹ کے خیال میں یہ ان کے لیے ایک نیک شگون تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ دونوں کئی ہفتوں تک آپس میں اس الجھن پر بحث کرتے رہے تھے اور طرح طرح کی ترکیبیں سوچتے رہے تھے کہ اس الجھن سے کیسے نجات حاصل کی جائے اور پھر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ وہ سڈنی سے کہیں اور چلے جائیں۔ ان چند ہفتوں میں انہوں نے نیلے سوٹ والے اجنبی کو کئی بار جہاز کے آس پاس منڈلاتے دیکھا تھا۔ وہ ان دونوں ہی کی تلاش میں تھا لیکن جہاز پر نہیں آیا تھا اور آخر کار جہاز سڈنی سے روانہ ہوگیا تھا اور ان دونوں کی جان میں جان آئی تھی۔

لیورپول پہنچنے کے بعد وہ دونوں ایک بار پھر خوفزدہ ہوگئے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی جنیٹ کو کام کرنے کے لیے تجارتی سامان کے حصے میں بھیج دیا گیا تھا اور بارکلے کو گودی پر کام میں لگا دیا گیا تھا۔ وقتی طور پر وہ ایک بار پھر اس مسئلے کو بھول گئے تھے اور وہ مسئلہ غیر حل شدہ رہ گیا تھا۔

پھر ایک روز جنیٹ اور بارکلے کی ملاقات ساؤتھ کورنیا کے علاقے میں ہوگئی۔

"یہ ساری مصیبت اس کیک کی وجہ سے آئی ہے۔" جنیٹ نے بارکلے سے کہا۔

"میں نے اس سوچ میں بہت وقت لگایا ہے کہ آخر ہم سے کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے کہ ہم اس مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ میں نے تمہیں پہلے نہیں بتایا تھا لیکن جب تم کیک اپنے صندوق میں چھپا کر لے جا رہے تھے تو ایک روز میں نے تمہارے صندوق کی چابیاں حاصل کرلی تھیں اور چپکے سے تمہارے کیبن میں پہنچ گیا تھا۔ تم بے خبر سو رہے تھے میں نے تمہارا صندوق کھول کر کیک باہر نکالا تھا پھر میں نے اس کیک کی جگہ پیکٹ میں ایک لکڑی کا ٹکڑا رکھ دیا تھا اور وہ کیک کھا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جوں ہی جہاز لیورپول کی بندرگاہ پر پہنچے گا میں تم سے الگ ہوجاؤں گا یا پھر تمہیں کبھی اس بارے میں نہیں بتاؤں گا اور جہاز کے لنگر انداز ہوتے ہی ایک دوسرا بالکل ویسا ہی کیک خرید کر پیکٹ میں سے لکڑی کا ٹکڑا نکال کر رکھ دوں گا اس طرح کبھی بھی کسی کو اس کے بارے میں معلوم نہیں ہوسکے گا پھر میں نے کیا بھی یہی تھا لیکن میرے ساتھ ایک مشکل تھی۔"

"کیسی مشکل؟"

"موتی۔"

"کیسے موتی؟"

"کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ اس کیک کے درمیان میں نقلی موتیوں کی ایک مالا تھی جس نے مجھے مشکل میں ڈال دیا تھا۔"

"کیا تم وہ بھی کھا گئے تھے؟"

"نہیں احمق میرا مطلب ہے کہ ان موتیوں نے مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ بے چاری بوڑھی آنٹی نے موتیوں کی وہ مالا اپنی بیٹی کو چونکانے کے لیے اس کیک میں رکھی ہوگی جیسے بعض لوگ پڈنگ یا کسٹرڈ میں سکے ڈال کر کرتے ہیں۔ میں نے سوچا کیوں نہ نئے کیک کا کچھ حصہ کاٹ کر اس میں وہ مالا رکھ دی جائے۔"

"پھر!"

"میں پھر مشکل میں پھنس گیا کیونکہ جب جہاز لنگر انداز ہی تھا تو میرے پاس میری رقم خرچ ہوچکی تھی اور میں ایک بار پھر قلاش ہوگیا تھا چنانچہ میں نے موتیوں کی وہ مالا ایک شخص کو فروخت کردی۔ وہ شخص اپنی بیٹی کے لیے ایسی جیولری خریدتا رہتا ہے۔ میں نے وہ مالا اسے فروخت کرنے کے بعد ایک ویسی ہی سستی سی مالا خرید کر اس کیک میں رکھ دی۔ اس طرح

کم از کم رقم خرچ کر کے مجھے ایک اچھی رقم بھی ہاتھ آ گئی اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔"

"لیکن اس بات سے تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"دیکھو بارکلے غور سے سنو میں تمہیں پھر سے سمجھاتا ہوں۔ جو موتیوں کی مالا میں نے کیک سے نکالی تھی وہ دراصل سچے موتیوں کی مالا تھی۔ تقریباً آٹھ ہزار پاؤنڈ کی مالیت کی تھی۔"

"کیا؟"

"ہاں یہ حقیقت ہے۔ میرا خیال ہے کہ آنٹی وم اور ان کے شوہر سچے موتیوں اور قیمتی اشیا کی اسمگلنگ کا کام عرصے سے کرتے رہے تھے۔ وہ اسی طریقے سے چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھجواتے تھے جب ہم وہ خاص کیک لے کر آنٹی وم کی بیٹی کے پاس پہنچے تھے تو اس کی تاک میں کوئی اور بھی تھا کوئی ایسا شخص جس کو اس کاروبار کا علم ہوچکا تھا اور اس کا تعلق پولیس کے محکمے سے نہیں تھا چنانچہ جب ہم وہ کیک آنٹی وم کی بیٹی پلمل کو دے کر آئے تو دوسرا شخص اسے حاصل کرنے وہاں پہنچا اور اس نے اس کیک کی خاطر پلمل کو ہلاک کردیا۔ دوسری طرف آنٹی کی بیٹی کا شوہر دوسرے کسی جرم میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا۔"

"نہیں۔" بارکلے نے حیرت سے پوچھا۔

"آخر تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی تھی؟"

"اس لیے کہ تم خود کو بہت امانت دار سمجھتے ہو اور کیک والے قصے میں تو تم آسمان سر پر اٹھا لیتے۔"

"شاید لیکن تمہیں یہ ساری حقیقت کیسے معلوم ہوئی جو تم مجھے بتا رہے ہو۔"

"یہ باتیں مجھے خود بہ خود سمجھ میں نہیں آئیں بلکہ میں نے کیپ ٹاؤن کے علاقے میں یہ باتیں آنٹی کے بوڑھے شوہر سے معلوم کیں جن سے میری وہاں اتفاقی ملاقات ہوگئی تھی۔

"لیکن وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟"

"وہ آنٹی کے وہاں پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے جنہیں ہیروں کی چوری کے سلسلے میں سات سال کی سزا سنا دی گئی تھی اس کے علاوہ آنٹی وم خوب صورت لڑکیوں کی مدد سے منشیات کا کاروبار چلاتی تھی اور اس کا یہ کاروبار برسوں سے دنیا کے مختلف حصوں میں چل رہا تھا۔"

جنیٹ کی اس بات کے بعد دونوں کے درمیان طویل خاموشی رہی تھی بالکل یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں اپنے اپنے ماضی میں جھانکنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"مجھے یہ پریشانی ہے کہ اصل سچے موتیوں کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔" بارکلے نے کچھ دیر بعد کہا۔

"وہ سچے موتی اب بھی یقیناً لیورپول کی کسی خوب صورت لڑکی کی گردن میں سجے ہوں گے۔" جنیٹ نے جواب دیا۔

"لیکن اس لڑکی کو شاید پتا بھی نہ ہو کہ وہ سچے موتی ہیں؟" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "کیونکہ وہ موتی میں نے نقلی سمجھ کر ہی ایک غریب شخص کو بیچے تھے۔ کاش میں جان سکوں کہ وہ خوش قسمت لڑکی کون ہے۔" جنیٹ نے حسرت سے کہا اور مسکرانے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

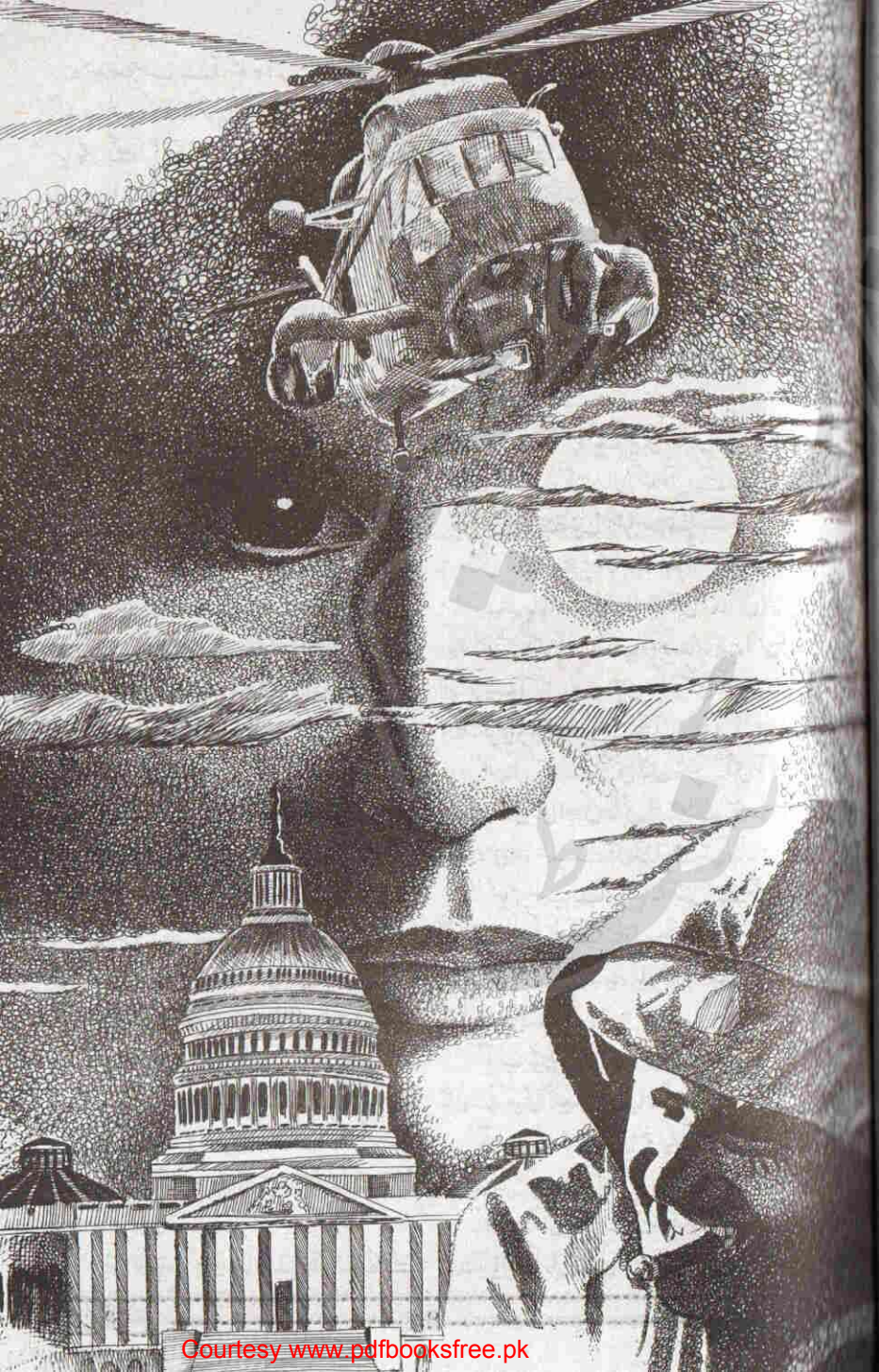

قسط نمبر 3

بازی گر

حسام بٹ

وقت سب سے بڑا بازی گر ہے۔ اس کی بازی گری اور رنگا رنگی انسانوں کو عجیب تماشے دکھاتی ہے جو لوگ وقت کی آواز نہیں سمجھتے وہ اس کا شکار ہوکر حالات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ گزرے ہیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں وقت کی باگیں موڑ دیں حالات کا رخ تبدیل کرکے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخ میں امر ہوکر رہ گئے۔ آج ان کا نام فخر سے لیا جاتا ہے۔

ایک آشفتہ سر نوجوان کی سرگزشت' اس نے پھولوں کی چاہ کی تھی مگر حالات نے اس کا دامن کانٹوں سے بھردیا مگر اس نے وقت کے آگے سپر ڈالنے کی بجائے اس سے مقابلے کی ٹھان لی تھی۔

سطر سطر تجسس قدم قدم ہنگامے لیے نئے افق کی دلچسپ و دلکش سلسلے وار کہانی

میرا دماغ کسی خوف ناک سونامی کی زد پر تھا۔ پورے وجود میں ایٹمی دھماکے ہورہے تھے۔ تاریکاری میری سوچ کو زہریلا اور سانسوں کو مہلک بنارہی تھی۔ اگر میں خود کو نہ سنبھالتا تو مجھے ختم ہونے میں چند سیکنڈ ہی لگتے۔ دوسری جانب سے امی کی گھبرائی ہوئی آواز مسلسل میری سماعت پر دستک دے رہی تھی۔

"بیٹا تم خاموش کیوں ہو کیا تم نے میری بات سن لی ہے۔"

"جی امی!" میں نے اپنے حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں میں پہلی فرصت میں آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔"

فون بند کرکے میں نے وحید صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے مجھے ہی گھور رہے تھے۔ میرے متوجہ ہونے پر انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو میری سمجھ میں آ گیا کہ آپ کے گھر سے فون تھا اپنی پرابلم؟"

"اے بگ پرابلم!" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے ابھی اور اسی وقت گھر جانا ہوگا وحید صاحب۔"

"کیا میں آپ کی مشکل جان سکتا ہوں۔" وہ بڑی اپنائیت سے بولے۔

"فرحانہ کو غنڈوں نے اغوا کرلیا ہے۔" میں نے بتایا۔

ان کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

"کون فرحانہ!"

"ابھی چند لمحے جس کی ذات کے حوالے سے آپ مجھ سے سوالات کررہے تھے۔" میں نے بتایا۔ "میں جس لڑکی کو چاہتا ہوں اس کا نام فرحانہ ہے۔"

"اوہ......!" انہوں نے ہونٹ سکیڑے اور ہمدردی بھرے لہجے میں بولے؟

"پھر تو آپ کو فوراً گھر پہنچنا چاہیے۔ آپ کے پاس کنوینس نہیں ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو اپنی گاڑی میں ڈراپ کردیتا ہوں۔"

وحید صاحب کی پرخلوص پیش کش کے سامنے میں نے گردن جھکادی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وحید صاحب نے آئندہ دس منٹ میں خالد رشید صاحب کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا پھر مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر میرے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔

میرا ذہن مسلسل اسی سوال کی کھوج میں لگا ہوا تھا کہ وہ غنڈے کون ہوسکتے ہیں جنہوں نے فرحانہ کو اغوا کیا تھا۔ فرحانہ یا اس کے باپ عبدالخالق کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ یہ لوگ برسوں سے میرے پڑوس میں آباد تھے۔ میں نے کسی کے ساتھ ان کا معمولی سا جھگڑا بھی ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ پھر فرحانہ کا اغوا کیا معنی رکھتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں فرحانہ کو میری وجہ سے اغوا تو نہیں کیا گیا۔ آج کل میری ایک فسادی اور عنادی "صاحب" سے ٹھنی ہوئی تھی۔ پچھلے دنوں میں نے اور خوش ولی نے اس کے بھیجے ہوئے دو غنڈوں کی خوب درگت بنائی تھی۔ عین ممکن تھا کہ یہ غلیظ حرکت اسی نے کی ہو۔

فرحانہ میری رگ رگ اور نس نس میں رواں دواں تھی۔ اس کے اغوا کی خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کسی نے میرے دل کو شکنجے میں کس دیا ہو۔ دماغ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور میری آنکھوں میں نیلی آگ کی اذیت ناک تڑپ جاگ اٹھی تھی۔ ان لمحات میں مجھے جوش نہیں، ہوش سے کام لینا تھا۔ اگر لومڑی نے شیر کے منہ میں ہاتھ دے ہی دیا تھا تو شیر کو اب اپنی جبلی وضع داری نبھانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میرا نام اسد اللہ ہے یعنی اللہ کا شیر۔ جس کسی نے بھی میری ذات کے حوالے سے فرحانہ کو اغوا کیا تھا، وہ میرے غیظ و غضب سے بچ نہیں سکتا تھا۔ ان شاء اللہ۔

"مسٹر اسد اللہ!" وحید صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟"

"کون سی بات وحید صاحب!" میں نے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ کی محبوبہ کو غنڈوں نے اغوا کیا مگر یہ اطلاع آپ کی والدہ نے آپ تک پہنچائی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ "کیا فرحانہ کی رہائش آپ کے قریب ہی ہے؟"

"جی سر!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "وہ میری پڑوسن ہے۔"

"اوہ آئی سی" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔ "آپ ان غنڈوں کے بارے میں کوئی گیس لگا سکتے ہیں مسٹر اسد اللہ؟"

میں نے کینہ پرور سونڈ بوٹڈ شخص کا ذکر کرنا مناسب نہ جانا اور سرسری انداز میں کہا۔ "فی الحال تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا جناب وہ لوگ نہایت امن پسند اور شریف النفس لوگ ہیں۔ گھر پہنچ کر ہی اندازہ ہوگا۔ یہ کیا ماجرا ہے۔"

"ان کی کسی سے دشمنی نہیں لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ انہیں کسی اور کی دشمنی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہو۔" وحید صاحب نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں کیوں۔ بار بار میرا دھیان ایک ہی طرف جارہا ہے۔"

"آپ پہیلیاں نہیں بجھوائیں وحید صاحب۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کے ذہن میں جو کچھ ہے کھل کر بیان کریں۔"

"پچھلے دنوں آپ نے فیکٹری کے مفاد کی خاطر بہت زیادہ سرگرمی دکھائی ہے۔" وہ ڈرائیونگ پر توجہ

مرکوز رکھتے ہوئے مستحکم لہجے میں بولے۔ "جس کے نتیجے میں کئی افراد کو ذلت اور نقصان اٹھانا پڑا یہ انتقامی کارروائی ان میں سے بھی تو کسی کی ہوسکتی ہے۔"

"میں ایسا نہیں سوچ رہا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان لوگوں کی دشمنی مجھ سے زیادہ سے زیادہ میری فیملی سے ہوسکتی ہے۔ فرحانہ ایک انتہائی غیر متعلق کردار ہے۔ یہ بات میرے اور فرحانہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ ہمارے درمیان کوئی سنجیدہ اور ان مٹ رشتا استوار ہو چکا ہے حتیٰ کہ ہم دونوں کے گھر والوں کو بھی اس کی خبر نہیں۔"

اسی نوعیت کی گفتگو کے دوران میں ہم گھر پہنچ گئے۔ اس وقت سہ پہر بلکہ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے وحید صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود گھر کے اندرونی حصے میں امی کے پاس پہنچ گیا۔ امینہ آنٹی بھی وہیں موجود تھیں۔ ازاں بعد مجھے بتایا گیا کہ فرحانہ کے والد کو بھی اس سانحے کی اطلاع دے دی گئی تھی اور بھی وہ بس پہنچنے ہی والے تھے۔ عبدالخالق کی بندر روڈ پر وال کلاک اور گھڑیوں کی دکان تھی۔

امینہ آنٹی پریشان، امی ہلکان اور شازیہ بے انتہا خوف زدہ نظر آرہی تھیں۔ میں ان کے درمیان جا بیٹھا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"اب بتائیں یہ سب کیسے ہوا؟"

"شازیہ اور فرحانہ مارکیٹ گئی تھیں۔" امی نے اکھڑی ہوئی سانس کے ساتھ بتایا۔ "واپسی میں ایک گاڑی ان کے ساتھ آ کر لگی اور..... اور.....!"

بولتے بولتے امی کی حالت بگڑنے لگی۔ میں نے جلدی سے انہیں انہیلر دیا اور تین تکیوں کی ٹیک بنا کر انہیں نیم دراز کرتے ہوئے کہا۔ "آپ سکون سے لیٹی رہیں میں شازیہ سے پوچھ لیتا ہوں۔"

امینہ آنٹی نے روہانسی آواز میں کہا۔ "بیٹا! ہمیں تمہارا ہی سہارا ہے۔ فرحانہ کے ابو تو ہم عورتوں سے بھی زیادہ کم زور دل کے ہیں۔ فرحانہ کی واپسی کے لیے جو بھی کرنا ہے تمہیں ہی کرنا ہے۔"

"آپ بالکل بے فکر ہو جائیں آنٹی!" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "فرحانہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں اس پر ایک ذرا سی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ اس کی صحیح سلامت واپسی کے لیے مجھے اگر جان کی بازی بھی لگانا پڑی تو میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔ آپ مطمئن ہو جائیں۔"

پھر میں شازیہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "شازی! ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم فرحانہ کے ساتھ مارکیٹ گئی تھیں مجھے بتاؤ، وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔"

"بھائی جان!" میرے حوصلہ دلانے پر وہ خاصی حد تک سنبھل گئی تھی۔ "ہم مارکیٹ سے واپس آرہی تھیں کہ ایک گاڑی ہمارے ساتھ آ کر لگی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگی۔ "اچانک اس گاڑی کے دروازے کھلے اور اندر سے دو خطرناک افراد باہر آ گئے۔ اس کے پاس کلاشنکوفیں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک کلین شیو اور دوسرا بھاری مونچھوں والا تھا اور وہ دونوں شکل ہی سے خطرناک غنڈے دکھائی دیتے تھے۔"

"پھر..... پھر کیا ہوا؟" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"ان میں سے جو کلین شیو تھا اس نے گہری نظر سے ہم دونوں کا جائزہ لیا اور کرخت لہجے میں پوچھا۔ "تم میں سے شازیہ کون ہے؟"

میں تو ان شیطانوں کو دیکھتے ہی گھبرا گئی تھی۔ اس شخص کے سوال پر فرحانہ جلدی سے بولی۔ "میں ہوں شازیہ.....!"

شازیہ کا اتنا کہنا تھا کہ میں سمجھ گیا اس اغوا کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واردات کی حقیقت کیا تھی۔ میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”ہاں شازی! اس کے بعد کیا ہوا؟“

”فرحانہ نے جیسے ہی خود کو شازیہ کہا۔ مونچھوں والے غنڈے نے مجھے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔“ وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ”پھر انہوں نے آنِ واحد میں فرحانہ کو زبردستی اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر کھڑی ہوتی وہ گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی تھی۔“

”اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے وہ غنڈے شازیہ کو اغوا کرنے آئے تھے لیکن وہ اس کے صورت آشنا نہیں تھے۔“ آنٹی امینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میری بچی قربانی کی بکری بن گئی۔“

”بعض اوقات بہت زیادہ بہادری دکھانا بھی مصیبت کا باعث بن جاتا ہے آنٹی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر اس موقع پر فرحانہ جوش میں آکر غلط بیانی سے کام نہ لیتی تو وہ غنڈے یقیناً شازیہ کو اٹھا لے جاتے.....

.....بہرحال.....!“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”فرحانہ اور شازیہ میری نظر میں ایک جیسی اہمیت کی حامل ہیں۔ میں بہت جلد فرحانہ کو ان غنڈوں کے چنگل سے چھڑا لے آؤں گا۔“

”اللہ تمہاری زبان مبارک کرے بیٹا!“ آنٹی امینہ نے تہ دل سے کہا۔

میں نے شازیہ سے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے ان غنڈوں کے حلیوں کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟“

”دونوں کے چہرے کرخت اور آنکھیں سفاک تھیں۔“ وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کلین شیو غنڈا گورا چٹا، دبلا پتلا اور پستہ قامت تھا۔ جبکہ بھاری مونچھوں والا سانولا اور دراز قد تھا۔ وہ دیکھنے میں ہٹا کٹا نظر آتا تھا۔ بس، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی۔“

”اور گاڑی۔“ میں نے پوچھا۔ ”گاڑی کیسی تھی؟“

”وہ اندھے شیشوں والی ایک سیاہ جیپ تھی۔“ شازیہ نے بتایا۔ ”اس کے اندر کچھ بھی دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔“

”جیپ نمبر پر تو تمہاری نگاہ پڑی ہوگی.....؟“

وہ فوراً میرے سوال کی تہہ میں پہنچ گئی۔ جلدی سے بولی۔ ”نہیں بھائی جان! حالات اتنی تیزی سے پیش آئے تھے کہ میں اس جیپ کا نمبر نوٹ نہیں کر سکی۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے پژمردہ سی سانس خارج کی پھر بڑا دل خراش سوال کیا۔

”بھائی جان! میری تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں، پھر وہ غنڈے مجھے کیوں اغوا کرنا چاہتے تھے۔“

شازیہ کے استفسار پر میرا دل خون ہو گیا۔ میں نے خود پر جبر کرتے ہوئے بس اتنا کہا۔ ”فی الحال میں کوئی اندازہ قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں شازی! اغوا کنندگان کی جانب سے کوئی رابطہ ہو تو پتا چلے.....!“ پھر میں نے روئے سخن امی کی جانب پھیرتے ہوئے اضافہ کیا۔

”امی! کیا اس واقعے کے بعد اغوا کنندگان میں سے کسی نے کوئی فون کیا؟“

”نہیں.....!“ امی نے مجھے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”البتہ.....!“

انہوں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ ”البتہ کیا؟“

وہ بدستور کھوجتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”آج کل تمہاری فیکٹری میں کیا چل رہا ہے۔“

امی کا سوال سن کر میں بری طرح چونکا اور اضطراری انداز میں کہا۔

”کیا چل رہا ہے، آپ کو تو سب خبر ہی ہے۔“

”نہیں۔“ انہوں نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ”مجھے سب خبر نہیں ہے۔ تم نے بہت کچھ مجھ سے چھپا رکھا ہے۔ آج دن میں ایک پراسرار فون آیا تھا.....!“

”پراسرار فون؟“ میں نے چونک کر امی کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتانے لگیں۔ ”لگ بھگ دو بجے دوپہر فون کی گھنٹی بجی شازیہ پڑوس میں تھی۔ میں نے بہ مشکل اٹھ کر فون اٹینڈ کیا۔ میرے ہیلو کے جواب میں دوسری جانب سے ایک کرخت مردانہ آواز میں پوچھا گیا۔

”آپ اسد کی ممی بات کر رہی ہیں؟“

”ہاں! میں اسد کی والدہ ہوں آپ کون؟“

”میں جو کوئی بھی ہوں، آپ مجھے اپنا دشمن نمبر ایک سمجھیں۔“ اس شخص نے نہایت ہی سفاکی سے کہا۔

”اس دشمنی کی وجہ؟“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

”تمہارا بیٹا۔“ وہ پھنکارا۔

غصے کی شدت میں اس شخص نے ادب آداب کا دامن بھی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ”میرے بیٹے نے ایسا کیا کر دیا ہے؟“

”تفصیل تو تم اپنے بیٹے سے ہی پوچھنا۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسد نے جس راستے پر چلتے ہوئے ترقی کی ہے، یہ اسے راس نہیں آئے گا۔ میں عنقریب اس کی خوشی کو خاک میں ملا کر رکھ دوں گا اور اسے ایسا عبرت ناک سبق سکھاؤں گا کہ اس کی آنے والی نسلیں میرا نام سنتے ہی تھر تھر کانپنے لگیں گی۔“

”اے تم کون ہو..... اور کیا بکواس کر رہے ہو؟“ مجھے بھی غصہ آ گیا۔

”میں کون ہوں، بہت جلد تم لوگوں کو پتا چل جائے گا۔“

اس کے ساتھ اس بدبخت نے فون بند کر دیا تھا۔ میں نے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ سوچا تھا کہ جب شام میں تم گھر واپس آؤ گے تو پھر بات کروں گی لیکن اس سے پہلے ہی.....!“ امی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بھیگی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”اسد! یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ بتاؤ مجھے، تمہاری فیکٹری میں کیا گڑبڑ چل رہی ہے۔ تم نے کن خطرناک لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا ہے؟“

”امی! یہ ایک طویل کہانی ہے اور یہ موقع ایسے قصوں کو لے کر بیٹھنے کا نہیں ہے۔ ذرا فرصت ملے تو پھر آپ کو اس کی تفصیل سناؤں گا۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”عین ممکن ہے، شازیہ کے جھانسے میں فرحانہ کا اغوا میری وجہ سے ہوا ہو لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں امی کہ آپ کا بیٹا کسی ایسی ویسی کارروائی میں ملوث نہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے ہاتھ اور دامن صاف ہیں۔“

”مجھے اپنے دودھ اور تربیت پر پورا بھروسا ہے اسد!“ امی نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن کچھ تو پتا چلے کہ ادھر تمہاری فیکٹری میں ہو کیا رہا ہے؟“

”مختصراً اتنا سمجھ لیں امی!“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”فیکٹری کے تین ملازم اکاؤنٹنٹ انور، فورمین عظیم اور مارکیٹنگ منیجر یاسین بیگ نقلی ادویات کے گھناؤنے دھندے میں ملوث تھے وہ فیکٹری میں تیار ہونے والی اصلی ادویات کے ساتھ نقلی ادویات ڈسٹری بیوٹر تک پہنچاتے تھے۔ مجھے ان کی مذموم سرگرمیوں کا پتا چلا تو میں نے فیکٹری مالکان کو اس کی خبر کر دی۔ پھر میرے تعاون سے مالکان نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان تینوں افراد کو ٹھوس ثبوت کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ اس کے بعد پہلی فرصت میں انہیں نوکری سے نکال دیا گیا۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے اپنی سانس کو ہموار کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"امی! میں اپنے کیے پر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوں۔ میں نے جو کیا وہ میرے فرائض کا حصہ تھا اور آئندہ بھی میں اپنا فرض پورا کرتا رہوں گا اور جہاں تک فرحانہ کے اغوا کا معاملہ ہے تو اسے بھی صحیح و سلامت واپس لانا میری ذمے داری ہے۔"

"اللہ ان ناسوروں کو غارت کرے جو اسی درخت کو کاٹ ڈالتے ہیں جس کا وہ پھل کھا رہے ہوتے ہیں۔" امی کا اشارہ ان تین افراد کی طرف تھا۔ جو میری اور ولی کی مشترکہ کوششوں سے اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچے تھے۔ "میری دعا ہے بیٹا کہ پاک پروردگار تمہیں ہر محاذ پر فتح دے۔"

"آمین.....!" میں نے تہہ دل سے کہا۔

آنٹی امینہ نے کہا۔ "بیٹا! اب تم جلدی سے فرحانہ کی تلاش میں سرگرم ہو جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ اسے تمہارے ہی دشمنوں نے شازیہ سمجھ کر اغوا کیا ہے۔"

"انہوں نے فرحانہ کو شازیہ نہیں سمجھا تھا بلکہ خود فرحانہ نے اپنے آپ کو شازیہ کی حیثیت دے کر ان کا کام آسان کر دیا تھا۔" میں نے صاف اور کھرے الفاظ میں کہا۔ "اور فی الحال حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ فرحانہ کے اغوا میں میرے وہی دشمن ملوث ہیں جن کا ابھی ذکر ہوا ہے یا یہ کوئی اور ہی لوگ ہیں۔ جب تک اغوا کنندگان کی طرف سے کوئی فون نہیں آتا صورتِ حال واضح نہیں ہوگی۔"

اسی لمحے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ شازیہ دیکھنے گئی اور واپس آ کر بتایا کہ خالق انکل آئے ہیں۔

"میں نے انکل کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں بھی وہیں جاتا ہوں۔" میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

خالق انکل کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ بڑی مصیبت میں دکھائی دیتے تھے۔ وہ ایک دھان پان اور پستہ قامت شخص تھے اور نظر کا خاصا موٹا چشمہ بھی لگاتے تھے۔ وہ تو عام حالات میں بھی خاصے نروس رہا کرتے تھے کجا یہ کہ ان کی اکلوتی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا تھا۔

"اسد بیٹا!" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "مجھے بتاؤ، یہ سب ہوا کیا ہے؟"

وحید صاحب کی سوالیہ نگاہ بھی مجھی پر لگی ہوئی تھی۔

میں نے اندرون خانہ سے حاصل ہونے والی معلومات کو جامع مگر مختصر الفاظ میں ان دونوں کے گوش گزار کر دیا۔ وحید صاحب نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولے۔

"اس کا مطلب ہے، بلی تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ مجھے جو شک تھا یہ اسی سلسلے کی کڑی ہے ہیں نا.....!"

میں ان کے اشارے کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ یہی کہنا چاہ رہے تھے کہ فرحانہ کے اغوا میں ان لوگوں کا ہاتھ ہے جنہیں خالد صاحب نے ایک ساتھ فیکٹری سے نکال دیا تھا۔ امی کا دھیان بھی اسی طرف گیا تھا۔ موجودہ صورتِ حال میں جو بھی اس قصے کو سنتا وہ لامحالہ اسی انداز میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا مگر میرا ذہن ابھی تک کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

"نہیں وحید صاحب۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"اغوا کنندگان عموماً رقم کے حصول کے لیے کسی کو اٹھاتے ہیں۔" وحید صاحب نے گہری سنجیدگی سے

کہا۔ "لیکن اگر میرا شک درست ہے تو فرحانہ کو اغوا کرنے والے رقم کا مطالبہ نہیں کریں گے۔"

"جب تک اغوا کنندگان کی طرف سے رابطہ نہیں ہوتا، کچھ بھی کہنا ممکن نہیں۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے مسٹر اسد! مجھے اجازت دیں۔" وحید صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "آپ کو جب بھی میری مدد کی ضرورت پیش آئے بس ایک فون کر دیجیے گا۔ ویسے میں خالد صاحب کو صورت حال سے آگاہ کر دوں گا۔ آپ کو زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

رخصت ہونے سے پہلے وحید صاحب نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا۔ جس پر ان کے گھر کا اور سیل فون کا نمبر درج تھا۔ میں وحید صاحب کو سی آف کر کے واپس آیا تو خالق صاحب نے اضطرابی لہجے میں کہا۔

"اسد بیٹا! جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ فیکٹری میں تمہاری کسی سے دشمنی تھی۔ اس بندے کو تمہاری وجہ سے نوکری سے نکال دیا گیا۔ اس بات کا انتقام لینے کے لیے وہ تمہاری بہن شازیہ کو اغوا کرنا چاہتا تھا مگر غلطی سے وہ فرحانہ کو اٹھا لے گیا۔"

"انکل! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" میں نے متحمل انداز میں جواب دیا۔ "لیکن فرحانہ اپنی غلطی کی وجہ سے اغوا ہوئی ہے۔ اسے اسمارٹ بننے کی کیا ضرورت تھی؟"

بات کے اختتام پر میرے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔ عبدالخالق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بیٹا جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب یہ سوچو کہ فرحانہ کو اس شیطان کے چنگل سے کیسے آزاد کرانا ہے۔ ہماری ساری امیدیں تم ہی سے جڑی ہوئی ہیں۔"

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں انکل۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں ان شاء اللہ آپ کی امیدوں پر پورا اتر کے دکھاؤں گا۔ بس ایک بار اس کیس کا سرا میرے ہاتھ لگ جائے۔"

"بیٹا! میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔" عبدالخالق لجاجت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

"کیسی درخواست انکل؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

"تم فرحانہ کو ڈھونڈنے اور واپس لانے کے لیے چاہے جو بھی راہ اختیار کرنا مگر ایک کام ہرگز ہرگز نہیں کرنا۔"

عبدالخالق کے پراسرار لجاجت بھرے انداز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے بے حد حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"کون سا کام انکل؟"

"تم اس معاملے میں پولیس کو بالکل ملوث نہ کرنا۔" وہ منت ریز انداز میں بولے۔

"کیوں انکل؟" میری الجھن دوچند ہو گئی۔ "اغوا کنندگان نے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔۔ یہ معاملہ قابلِ دخل اندازی پولیس ہے۔ ہم پولیس کو اس واقعے سے بے خبر رکھ کر جرم کے مرتکب ہوں گے۔"

وہ باقاعدہ دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے غم زدہ لہجے میں بولے۔ "بیٹا! یہ قانون اور قاعدے کی باتیں وہاں اچھی لگتی ہیں جہاں قانون اپنی اصل شکل میں موجود ہو اور معاشرے پر اس کا کما حقہٗ اطلاق بھی ہوتا ہو۔ مجھے ایک سال پہلے اپنے ملک کی پولیس کا ایک تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ میں مرتے مر جاؤں گا مگر ان پر بھروسا نہیں کروں گا۔"

میرے علم میں ایسا کوئی واقعہ نہیں تھا جو پچھلے سال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈیڑھ سال میں خالق صاحب کے ساتھ پیش آیا ہو۔ میں نے خاصے تعجب سے پوچھا۔

"انکل! آپ کس واقعے کا ذکر کر رہے ہیں؟"

"اس واقعے کا ذکر میں نے صرف تمہاری آنٹی سے کیا تھا۔" وہ تلخی سے بولے۔ "اور امینہ کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اس بات کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ فرحانہ کو بھی نہیں۔"

"لیکن ہوا کیا تھا؟" میں نے متذبذب لہجے میں کہا۔ "مجھے کچھ تو بتائیں۔"

"ضرور بیٹا! تمہیں میں ضرور بتاؤں گا۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔ "کوئی سال بھر پہلے مجھے بھتے کی ایک پرچی موصول ہوئی تھی۔ جس میں مجھ سے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک پراسرار کال کے ذریعے مجھے میری اور میری فیملی کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے وارننگ دی گئی تھی کہ اگر میں نے اس معاملے کی پولیس کو بھنک بھی پڑنے دی تو بہت برا ہوگا۔ اتنا برا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔" بات کے اختتام پر انہوں نے ایک جھرجھری لی۔

"جہاں تک میرا اندازہ ہے" میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اس بارے میں پولیس کو بتا دیا تھا؟"

"ہاں۔" انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "یہ میری زندگی کی پہلی اور آخری بھیانک غلطی تھی۔ اس غلطی کا کیا نتیجہ برآمد ہوا تھا؟"

"نہیں پتا آپ بتائیں؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"میں نے جب پولیس کو بھتے کی اس پرچی کے بارے میں بتایا تو انہوں نے مجھے بہت حوصلہ دیا اور سختی سے منع کر دیا کہ مجھے ایک پیسا بھی ادا نہیں کرنا۔ میں نے آفیسر سے کہا۔

"سر! یہ لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ عدم ادائیگی کی صورت میں اگر انہوں نے میرے یا میری فیملی کے ساتھ کوئی مہلک معاملہ کر دیا تو میں کیا کروں گا؟"

"آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔ وہ لوگ کتنے بھی خطرناک کیوں نہ ہوں لیکن قانون سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو سکتے۔" پولیس آفیسر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ یہ بتائیں انہوں نے رقم کی ادائیگی کے لیے آپ کو کتنا وقت دیا ہے۔"

"دو دن۔" میں نے جواب دیا۔

بس تو پھر ٹھیک ہے۔" آفیسر بڑے اطمینان سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ اپنی فیملی کے لیے تو قطعاً پریشان نہ ہوں انہوں نے دو دن کا وقت دیا ہے تو وہ دو دن کے بعد ہی آپ کی دکان پر ہی آئیں گے اور اسی وقت ہم انہیں گرفتار کر لیں گے۔"

"وہ کیسے سر؟" میں نے حیرت بھری نظر سے آفیسر کو دیکھا۔

"میں آج ہی سے دو سادہ لباس اور مستعد پولیس اہلکاروں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "آپ سے میں ان لوگوں کا تعارف کرا دوں گا۔ یہ لوگ آپ کی دکان کھلنے سے پہلے وہاں موجود ہوں گے اور جب تک آپ دکان بند کر کے گھر نہیں چلے جاتے یہ اپنی ڈیوٹی پر موجود رہیں گے۔" وہ ایک لمحے کے لیے سانس ہموار کرنے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"بھتا خور جب آپ کے پاس ایک لاکھ کی رقم وصول کرنے آئے تو آپ ان سادہ لباس اہلکاروں کو بس ہلکا سا اشارہ کر دیجیے گا۔ یہ چیتے کی مانند لپک کر

اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیں گے اللہ اللہ خیر سلا۔"

"ٹھیک ہے سر۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ "سر! کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی نا؟"

"بالکل نہیں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "جو لوگ تعاون کے لیے پولیس کے پاس آتے ہیں ہم انہیں مکمل تحفظ بھی فراہم کرتے ہیں اور ہر ممکنہ ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔ ویسے خالد صاحب! آپ بہت خوش قسمت انسان ہیں۔"

آفیسر کی بات میری عقل کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خوش قسمت وہ کیسے سر!"

"وہ ایسے کہ انہوں نے آپ سے صرف ایک لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔" آفیسر معنی خیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ورنہ یہ لوگ تو پانچ دس لاکھ سے کم کی بات ہی نہیں کرتے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور آفیسر کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گیا۔

اگلے روز سے میری دکان کے قریب دو سادہ لباس پولیس اہلکار تعینات کر دیے گئے۔ جب بھی میری دکان پر کوئی گاہک آتا تو وہ مجھ سے نگاہیں چار کرتے اور نظروں ہی نظروں میں مجھ سے پوچھتے کہ کہیں یہ شخص وہی بھتا خور تو نہیں جس کی سرکوبی کے لیے انہیں وہاں متعین کیا گیا ہے۔ میں بھی نظری انکار کر دیتا۔

میں اس انتظام سے بہت خوش تھا اور دل ہی دل میں پولیس ڈی پارٹمنٹ کو دعائیں بھی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ان لوگوں پر شدید غصہ بھی آتا تو بلا سوچے سمجھے منہ اٹھا کر پولیس کے خلاف الٹا سیدھا بول جاتے ہیں۔ میں نے تو انہیں انتہائی محنتی اور فرض شناس پایا تھا۔

میرا اطمینان اس وقت غارت ہو کر رہ گیا جب بھتا خور پرچی پر درج ایک لاکھ کی رقم وصول کرنے آ گیا میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جو مجھے پرچی دے کر گیا تھا۔

میں نے اس سفاک شخص کو اپنے سامنے پاتے ہی اپنے محافظوں کی جانب نگاہ اٹھائی لیکن تا حد نظر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیے۔ میری نگاہ مایوس اور نامراد واپس لوٹ آئی۔ بھتا خور نے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

"منع کیا تھا نا' پولیس کو بیچ میں نہیں ڈالنا لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ خیر' میں خالی ہاتھ تو واپس نہیں جاؤں گا۔ اس وقت تمہاری دکان میں جتنی رقم ہے وہ فوراً میرے حوالے کر دو اور اس کے ساتھ ہی تمام قیمتی رسٹ واچ بھی ایک شاپنگ بیگ میں ڈال کر مجھے دے دو۔ ہری اپ۔"

بات کے اختتام پر اس نے گن بھی نکال لی تھی۔ میں نے آخری مرتبہ اپنے محافظوں کی جانب نگاہ دوڑائی لیکن لاحاصل۔ اسی لمحے بھتا خور کی دھمکی آمیز آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"اگر تم نے ایک منٹ میں میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو اس دکان کے اندر تمہاری لاش تڑپتی دکھائی دے گی۔"

کسی بھی انسان کے لیے سب سے قیمتی شے اس کی جان ہوتی ہے۔ میں اس بھتا خور کی بات ماننے کے لیے مجبور ہو گیا۔ وہ سہ پہر کا وقت تھا اور میری میز کی دراز میں ساٹھ ہزار سے زیادہ کا کیش تھا۔ ازیں علاوہ' میں نے شاپنگ بیگ میں جو رسٹ واچ بھر کر اس شیطان کے حوالے کیں ان میں بعض بہت قیمتی اور نایاب گھڑیاں تھیں۔ میرے پاس کوئی دوسرا راستا نہیں تھا۔ وہ خطرناک آدمی گن کے زور پر مجھے لگ بھگ سوا لاکھ کی ڈزدے کر اطمینان سے فرار ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے ابھی اپنی بربادی کا ماتم شروع بھی نہیں کیا تھا کہ مجھے وہ دونوں محافظ نظر آ گئے جو تھوڑی دیر پہلے کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے غصیلے لہجے میں ان دونوں کو اپنے پاس بلا لیا۔

"کیا ہوا انکل؟" ایک نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

دوسرا جلدی سے بولا۔ "انکل! آپ خاصے پریشان نظر آ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے نا؟"

"میری پریشانی کو تم لوگ جہنم میں ڈالو۔" میں نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔ "یہ بتاؤ' تم دونوں کہاں مر گئے تھے؟"

"انکل! میں تو عصر کی نماز پڑھنے گیا تھا۔" ایک مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "کچھ بتائیں تو سہی' آخر معاملہ کیا ہے؟"

"اور تم؟" میں نے پہلے کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسرے سے پوچھا۔

"میں..... میں واش روم گیا تھا؟"

ان دونوں کے چہروں کے تاثرات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ بھتا خور کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور انہوں نے دانستہ اسے سیف پیسج دیا تھا جب میں نے انہیں بتایا کہ وہ بھتا خور آیا تھا اور میرا بھٹا بٹھا کر چلا گیا ہے تو ان کے چہروں پر مصنوعی حیرت نمودار ہوگئی اور وہ دونوں بہ یک زبان ہو کر بولے۔

"کدھر گیا ہے وہ؟"

وہ جدھر گیا تھا' میں نے اسی سمت اشارہ کر دیا۔ ان دونوں کمینوں نے میری بتائی ہوئی سمت میں دوڑ لگا دی۔ وہ دن اور آج کا دن' میں نے پھر ان کی شکل نہیں دیکھی۔" یہاں تک بتانے کے بعد خالق صاحب نے ایک متضحل اور دکھ بھری سانس خارج کی پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں بولے۔

"اسد! اس دن سے پولیس کے محکمے پر سے میرا یقین اٹھ گیا ہے۔ اگر یہ لوگ مجرموں کو تحفظ نہ دیں۔ ان کے ہاتھ مضبوط نہ کریں تو ہمارا ملک جنت کا نمونہ بن جائے۔ اس لیے بیٹا! میری تم سے درخواست ہے کہ فرحانہ والے معاملے میں پولیس کو ہرگز ہرگز ملوث نہیں کرنا۔"

اُدھر عبدالخالق صاحب کی التجا ختم ہوئی' ادھر میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ڈسپلے پر اجنبی نمبر فلیش ہوتے دیکھ کر میں چونکا۔ میں نے خالق صاحب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کال ریسیو کا بٹن دباتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہیلو.....!"

"ہیلو سورما! کیسے ہو؟" دوسری جانب سے طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔

یہ آواز مجھے جانی پہچانی سی لگی مگر فوری طور پر یاد نہ آ سکا کہ میں نے اس شخص کو کہاں سنا ہے۔

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "کون ہو تم؟"

"کمال ہے' آپ تو اپنے باپ کو پہچاننے سے انکار کر رہے ہو۔" وہ بڑے بے ہودہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "یاد کرو' ہماری پہلی ملاقات کو جب تم ایک کچرا چننے والے بچے کی حمایت میں میرے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے تھے۔"

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں صورتِ حال مجھ پر روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ یہ وہی سوٹڈ بوٹڈ کمینہ تھا میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"میں تم جیسے اوچھے اور گھٹیا لوگوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ بتاؤ' کس مقصد سے فون کیا ہے۔"

"میں تم سے رشتے داری کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں

اپنا سالا بنانا چاہتا ہوں۔ اس مقصد کے لیے میں نے تمہاری اکلوتی بہن شازیہ کو اغوا کرایا ہے۔" وہ بڑے فخر سے اپنے کالے کرتوتوں کی تفصیل بیان کرنے لگا۔ "ہماری شادی میں آؤ گے نا؟"

"پتا نہیں' تم کیا بکواس کر رہے ہو۔" میں نے غصیلے انداز میں کہا۔

"میری بہن شازیہ تو اس وقت گھر میں میرے پاس موجود ہے۔"

"مجھے چکما دینے کی کوشش نہ کرو' یہ کام تم پہلے ہی بہت کر چکے ہو۔" وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولا۔ "کچرے والے بچے کی حمایت میں تم نے مجھ سے جو بدتمیزی کی تھی اس کا بدلہ لینے کے لیے میں نے اپنے دو آدمیوں کو تمہارے پیچھے بھیجا مگر وہ دونوں تمہارے سامنے ہلکے پڑ گئے۔ تم نے مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا تھا۔ یہ تو شکر ہے جس فائٹر کے سینے میں خنجر لگا اس کی جان بچ گئی ہے۔ جبھی مجھے احساس ہوا کہ تمہیں لائٹ نہیں لینا چاہیے چنانچہ.....!" وہ لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

"چنانچہ' میں نے اپنے آدمیوں کی مدد سے بڑی خاموشی کے ساتھ تمہارے بارے میں تحقیقات کرائیں اور یہی بات سمجھ میں آئی کہ تمہارا راز ہڑپ کرنے کے لیے مجھے تمہارا بہنوئی بننا ہوگا کہو میرا آئیڈیا کیسا ہے؟"

"تم' تمہارا یہ خبیث آئیڈیا اور تمہارا تحقیقاتی مشن سب الو کے پٹھے اور چابی کے لٹھے ہیں۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ پھر ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ "میری بہن شازیہ اللہ کے فضل و کرم سے میرے پاس محفوظ ہے اور اللہ نے چاہا تو وہ ہمیشہ محفوظ ہی رہے گی۔ تمہارے آدمیوں نے الو کا گوشت کھایا ہے۔ جھک ماری ہے۔"

"تم اس طرح کے پینترے بدل کر مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "تمہاری بہن اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ اگر اس کی سلامتی چاہتے ہو تو میں جہاں بلاؤں چپ چاپ چلے آؤ اور بالکل اکیلے۔"

"لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" میں نے اس کی باتوں کو ایک ذرا اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا "اگر تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں آ رہا تو میں تمہیں اپنی بہن شازیہ کی آواز سنا دیتا ہوں۔"

"میرا نام ندیم شیروانی ہے۔" وہ بڑے فخر سے بولا۔ "اور تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں کتنا خطرناک انسان ہوں۔ تم نے میرے ساتھ دشمنی مول لے کر اپنی زندگی کو اذیت اور کرب کے حوالے کیا ہے۔"

"تم اگر شیروانی ہو تو میں بہت جلد تمہارا کوٹ یا واسکٹ بنا دوں گا۔" میں نے اس کے زخموں پر مرچیں چھڑکتے ہوئے کہا۔ "اور جہاں تک تمہاری خطرناکی کا تعلق ہے تو وہ میں نے دو واقعات میں ہی نوٹ کر لی ہے۔ پہلی مرتبہ میں نے تمہاری ناک سے خون کا فوارہ جاری کیا اور تم کچھ نہ کر سکے دوسری دفعہ میں نے تمہارے بھیجے ہوئے غنڈوں کو بھری دوپہر میں ذلیل و رسوا کر ڈالا اور تم ہاتھ ملتے رہ گئے اور اب.....!" میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اب تیسری بار تم نے ایک نہایت ہی گری ہوئی حرکت کی ہے۔ میری بہن کے مغالطے میں تم نہ جانے کس کو اٹھوا لے گئے ہو۔"

"تمہاری بکواس بند کرانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔" وہ غصے سے گویا پاگل ہوتے ہوئے بولا۔ میرے الفاظ نے جلتی پر تیل کا کام دکھایا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں..... میں تمہیں شازیہ کی آواز سناتا ہوں۔"

میں نے معنی خیز انداز میں عبدالخالق کی طرف دیکھا اور دوبارہ انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرنے کے بعد سیل فون کا اسپیکر آن کردیا۔ اگلے ہی لمحے وہاں ندیم شیروانی کی کرخت آواز ابھری۔ وہ فرحانہ سے مخاطب تھا۔

"لو اپنے بھائی جان سے بات کرو۔"

میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ فرحانہ کے اغوا نے مجھے اندر باہر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان نازک لمحات میں، میں بڑی مشکل سے اپنے حواس اور اعصاب کو قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ اگر میں اس نامراد ندیم شیروانی کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر نہ کرتا تو یہ کھیل بری طرح بگڑ سکتا تھا۔ سیل فون کے اسپیکر سے فرحانہ کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

"ہیلو سر! آپ کیسے ہیں؟"

"اوہ فرحانہ۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے کیا حماقت کی ان غنڈوں کے سامنے خود کو شازیہ کیوں ظاہر کیا؟"

"سر! شازیہ تو خیریت سے ہے نا؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"ہاں، ہاں، وہ خیریت سے ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "تم میرے سوال کا جواب دو۔"

"سر! میں ان لفنگوں کو دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کسی برے ارادے سے شازیہ کو پوچھ رہے ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "شازیہ میری دوست ہے۔ بس سر پتا نہیں، اس وقت میرے دماغ میں کیا آئی کہ.....!"

بولتے بولتے فرحانہ کی آواز معدوم ہوگئی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ ندیم شیروانی نے اسے فون سے دور ہٹا دیا ہوگا۔ اگلے ہی لمحے میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا اور سیل فون کے اسپیکر پر ندیم کی تھکی ہوئی شکست خوردہ آواز سنائی دی۔

"تمہاری قسمت بہت اچھی ہے اسد! میرے آدمی اس لڑکی کی چالاکی کی وجہ سے دھوکا کھا گئے۔ خیر، بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔"

"دیکھو شیروانی!" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "تمہاری دشمنی مجھ سے ہے، بہتر ہوگا کہ اس آگ میں غیر متعلق لوگوں کو جھونکنے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر تمہارے اندر ذرا سی بھی انسانیت موجود ہے تو فرحانہ کو چھوڑ دو۔"

"میرے اندر ذرا سی نہیں بلکہ بہت زیادہ انسانیت موجود ہے۔" وہ مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔ "لیکن میں کسی بھی گیم میں اپنا نقصان نہیں کرتا۔ فرحانہ کو میں چھوڑ دوں گا مگر اس کے لیے تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔"

"بولو، کیا تعاون چاہیے مجھ سے۔" میں نے سر سراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ تو ثابت ہوگیا کہ فرحانہ تمہاری بہن کی دوست ہے۔" وہ مکاری سے بولا۔ "اور یہ جس طرح تمہیں سر، سر کہہ کر پکار رہی تھی اس سے لگتا ہے کہ یہ تمہاری اسٹوڈنٹ بھی ہے؟"

"ہاں، میں پارٹ ٹائم ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "دوسرے اسٹوڈنٹ کی طرح فرحانہ بھی میری ایک اسٹوڈنٹ ہے۔"

"مجھے تم سے کس قسم کا تعاون چاہیے میں گاہے بگاہے بتاتا رہوں گا۔" وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "فی الحال، مجھے فرحانہ کے گھر والوں کا رابطہ نمبر چاہیے میں انہیں فون کر کے معاملات طے کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم پندرہ بیس منٹ کے بعد دوبارہ مجھے فون کرو، جب تک میں ان کا نمبر تلاش کر کے رکھتا

ہوں۔" میں نے تعاون آمیز انداز میں کہا۔ "یا ایسا کرتے ہیں کہ میں تم سے خود رابطہ کرتا ہوں۔"

"نہیں۔" وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے قطعیت سے بولا۔ "تم مجھے فون نہیں کرو گے۔ تم اس بات پر خوش ہو رہے ہو نا کہ میرا نمبر تمہارے پاس آ گیا ہے تو اس خوش فہمی کو ذہن سے نکال دو کہ یہ نمبر اب تمہیں ایکٹیو ملے گا۔ میں کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا ہوں۔"

"اوکے تم پندرہ بیس منٹ کے بعد مجھے فون کرو۔" ادھر میری بات ختم ہوئی۔ ادھر اس نے رابطہ منقطع کر دیا میں نے فون بند کرنے کے بعد عبدالخالق کی طرف دیکھا اور کہا۔

"انکل! آپ نے فرحانہ کی آواز سن لی۔ وہ زندہ سلامت ہے۔"

"ہاں بیٹا!" انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "لیکن اسے اس ظالم شخص کے چنگل سے چھڑانا بھی تو ہے۔"

"سب ہو جائے گا۔ میں آپ کی بیٹی کو آپ کی نگاہوں کے سامنے صحیح سلامت لا کر کھڑا کر دوں گا۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "وہ میری دشمنی کی نذر ہوئی ہے۔ اس کی واپسی اب میری ذمے داری ہے لیکن اس کے لیے آپ کو مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔ بولیں، کریں گے تعاون؟"

"کیوں نہیں بیٹا۔" وہ تڑپ کر بولے۔ "تم جو کہو گے، میں وہی کروں گا۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "نمبر ایک، آپ آنٹی کو لے کر فوراً اپنے گھر پہنچیں نمبر دو محلے میں کسی کو یہ خبر نہیں ہونا چاہیے کہ فرحانہ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ یہ بات آنٹی کو بھی اچھی طرح سمجھا دیں۔ نمبر تین میں بھی تھوڑی دیر میں آپ ہی کے پاس آ رہا ہوں۔"

میری انتہائی سنجیدگی سے کی گئی باتیں انکل خالق کی کھوپڑی میں بیٹھ گئیں۔ وہ آنٹی امینہ کو لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ مجھے امی نے گھیر لیا۔

"کیا ہوا فرحانہ کا کچھ پتا چلا؟"

"سب پتا چل گیا ہے؟" میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بالکل خیریت سے ہے اور بہت جلد واپس بھی آ جائے گی۔"

"کیا اغوا کنندگان سے تمہارا کوئی رابطہ ہوا؟"

"جی امی!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ابھی اسی سے مذاکرات کر کے آ رہا ہوں۔"

"کون ہے وہ بدبخت؟" امی جلال میں آ گئیں۔ "کیا یہ مردود انہی میں کوئی ہے جنہیں فیکٹری میں سے نکالا گیا ہے۔"

"نہیں امی! یہ کوئی دوسرا ہی چکر ہے۔"

"دوسرا چکر!" وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے تکنے لگیں۔ "کہاں کہاں دشمنیاں پال رکھی ہیں تم نے.....؟"

"امی! آپ کو یاد ہوگا.....!" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "دو ماہ پہلے جب میں اس نوکری کے لیے انٹرویو دینے گیا تھا تو میرا ایک آدمی سے جھگڑا ہوگیا تھا اور میں نے مکا مار کر اس کی ناک سے خون جاری کر دیا تھا۔"

"ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "وہ جو کسی کچرے والے بچے کو زدوکوب کر رہا تھا اور تم بچے کی حمایت میں اس سے الجھ گئے تھے۔"

"جی امی! میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس شیطان کا نام ندیم شیروانی معلوم ہوا ہے۔ اسی نے فرحانہ کو اغوا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرایا ہے۔"

امی چند لمحات تک ٹٹولتی نظر سے مجھے دیکھتی رہیں پھر عجیب سے لہجے میں بولیں۔ "اسد! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں؟"

"نہیں امی.....!" میں الجھ کر رہ گیا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"کوئی اتنی معمولی سی بات پر تمہاری بہن کے انغوا جیسا سنگین قدم نہیں اٹھا سکتا۔" وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں۔ "تمہاری آنکھیں چغلی کھا رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ سچ سچ بتاؤ' اس نا مراد شیروانی کے ساتھ دشمنی اس حد تک کیسے بڑھ گئی۔"

میں امی سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا لہٰذا انہیں من وعن وہ واقعہ سنا دیا جب میں نے اور خوش ولی نے مل کر شیروانی کے غنڈوں کی دھلائی کی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر امی نے کہا۔

"رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے بیٹا آج وہ شازیہ کے مغالطے میں فرحانہ کو اٹھا لے گئے ہیں۔ کل وہ تمہاری بہن کے ساتھ بھی کوئی اوچھی حرکت کر سکتے ہیں۔ تم کیوں خواہ مخواہ لوگوں کو اپنا دشمن بناتے پھر رہے ہو.....؟"

امی کے آخری الفاظ کرب اور اذیت میں ڈوبے ہوئے تھے میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ ان لمحات میں وہ بہت آزردہ اور ٹوٹی پھوٹی نظر آئیں۔ انہوں نے زندگی بھر خود بے حساب دکھ اٹھائے تھے اور ہمیں پال پوس کر جوان کیا تھا۔ آج میری وجہ سے انہیں ملول ہونا پڑا تھا لیکن خدا جانتا تھا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے پھر ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی! میں نے تو ظلم اور زیادتی کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ معاملہ اتنی سنگین صورت اختیار کر لے گا۔ شیروانی بڑا ہی کمینہ اور کینہ پرور انسان ہے ذرا سی بات کو اس نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔"

"بیٹا! یہ انا بڑی عجیب و غریب شے ہے۔" امی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر اس کا مثبت استعمال کیا جائے تو یہ انسان کو فرش سے عرش تک لے جاتی ہے مگر منفی انا ایک اچھے خاصے انسان کو بھی شیطان بنا دیتی ہے۔ میں نے تمہیں لاکھ بار سمجھایا کہ برے لوگوں سے دور رہو مگر تمہیں تو ہیرو بننے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔ پتا ہے' تمہاری وجہ سے.....!" بولتے بولتے امی کی آنکھیں چھلک آئیں۔ لمحاتی توقف کے بعد وہ اضافہ کرتے ہوئے بولیں۔

"تمہاری وجہ سے آج پہلی مرتبہ امینہ کے سامنے میری گردن جھکی ہے اس واقعے کی وجہ سے اس سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکی!"

"مجھے آپ کی سبکی کا پورا احساس ہے امی۔" میں نے تہہ دل سے کہا۔ "اگرچہ اس معاملے میں بخدا میرا کوئی قصور نہیں لیکن یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ فرحانہ کو اگر میری وجہ سے انغوا کیا گیا ہے تو میں بہت جلد اسے صحیح و سلامت واپس بھی لے کر آؤں گا۔ مجھے شیروانی جیسے بدبختوں سے بخوبی نمٹنا آتا ہے۔"

"تم کس کس سے نمٹو گے بیٹا!" امی نے بڑے کرب کے ساتھ کہا۔ "ابھی دن میں جو فون آیا تھا میں اس کے لیے ابھی سے پریشان ہو رہی ہوں۔ یہ شیروانی تو ایک ہے اور وہ پورے تین شیطان..... بیٹا تمہیں کچھ اندازہ ہے ہم کتنے خطرناک حالات میں گھرتے چلے جا رہے ہیں۔"

"کچھ نہیں ہوگا امی!" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "آپ کو فکرمند ہونے کے بجائے اپنے بیٹے پر بھروسا کرنا چاہیے۔ میں اپنی جان پر کھیل کر آپ لوگوں کی حفاظت کر سکتا ہوں۔"

"میں یہی تو نہیں چاہتی ہوں پگلے۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "ایک ماں کے سامنے تم اپنی جان پر کھیلنے کی بات کر رہے ہو۔ اللہ پاک نے اگر تمہیں صحت اور جوانی دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی کو دنگا فساد کے لیے وقف کر دیا جائے۔ نہیں' ہرگز نہیں۔" انہوں نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی پھر بڑے مضبوط لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں آگ اور خون کے اس کھیل کا حصہ نہیں بننے دوں گی۔" وہ بڑے جذباتی اور حساس لمحات تھے میں امی کو یہ نہیں سمجھا سکتا تھا کہ ہم یوٹوپیا کے باسی نہیں ہیں۔ ہمارا ملک بلکہ پوری دنیا ہی انسانوں کا ایک جنگل ہے جہاں ہر رنگ و نسل کے جانور پائے جاتے ہیں۔ بکری اور بھیڑ کی زندگی گزارنے سے تو بہتر ہے انسان خودکشی ہی کر لے۔ یہاں وحشی درندوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہی ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ زندگی اور موت تو اس قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ مظلوم کی دادرسی کرنے کے دوران میں اگر ظالم کے ہاتھوں کوئی تکلیف' کوئی نقصان بھی پہنچے تو اسے کھیل کا حصہ سمجھتے ہوئے مسکرا کر قبول کر لینا چاہیے۔

مگر یہ ایسی باتیں کرنے کا موقع نہیں تھا۔ امی پہلے ہی بہت دکھی تھیں۔ میری جرأت اور بہادری کی کوئی بھی تقریر انہیں مزید غم زدہ کر سکتی تھی لہٰذا مصلحت کے تقاضے نبھاتے ہوئے میں نے کہا۔

"امی! آپ جیسا چاہیں گی ویسا ہی ہوگا۔ اب آپ اطمینان سے گھر میں آرام کریں۔ میں خالق انکل کے پاس جا رہا ہوں۔ اغوا کنندگان سے جو بھی معاملہ ہوگا وہ میری موجودگی میں ہونا چاہیے۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آ کر آپ کو رپورٹ پیش کرتا ہوں۔"

"جاؤ بیٹا اللہ تمہاری مدد کرے گا۔"

"آمین۔" میں نے تہہ دل سے کہا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو شازیہ نے پہلی مرتبہ لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟"

میں نے سوالیہ نظروں سے امی کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولیں۔

"ہاں ٹھیک ہے' شازیہ کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "آپ گھر میں اکیلی رہیں گی؟"

"کچھ نہیں ہوگا مجھے۔" امی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "فرحانہ' شازیہ کی وجہ سے اغوا ہوئی ہے۔ اس کا جی چاہ رہا ہوگا۔ یہ ساری کارروائی دیکھنے کا.....!"

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

.....☆☆☆.....

مجھے فرحانہ کے گھر آنے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا۔ شاید اس سے پہلے میں ایک آدھ بار ہی ادھر آیا ہوں گا لیکن اس وقت فرحانہ محض میری ایک پڑوسن تھی اس سے میرا روحانی' ذہنی یا قلبی کوئی بھی تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ اب صورت حال قطعی مختلف تھی۔ میں اس کے گھر کے اندر داخل ہوا تو اس کے وجود کی مخصوص مہک نے اپنے حصار میں لے لیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا اس گھر کی ہر ہر شے کے اندر وہ موجود ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ وہاں موجود نہیں تھی مگر میرا تصور اسے جا بہ جا دیکھ رہا تھا۔

یہ تصور اور تخیل بڑی عجیب و غریب چیزیں ہیں۔ انسان کا جس شے میں دل لگا ہوتا ہے وہ ہر لمحہ اسے اپنے آس پاس نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ کسی عزیز ترین ہستی کی موت کا یقین نہیں آتا۔ ہمارا تصور اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ کوئی ہم سے جدا ہو چکا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ تصور کا تعلق خالصتاً روحانی دنیا سے ہے۔ یہ مادیت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جب کوئی شے ہمارے پاس نہیں رہتی تو اس کا مطلب ہے، وہ جسمانی طور پر ہم سے الگ ہو جاتی ہے کیونکہ موت صرف مادے کو ہے، روح کبھی فنا نہیں ہوتی۔

میں بھی ان لمحات میں تصور کی کرشمہ سازیوں میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ فرحانہ ابھی گھر کے کسی گوشے سے نمودار ہو کر حیرت سے مجھے دیکھے گی اور بے ساختہ اس کے لب تھرتھرائیں گے۔

"سر آپ یہاں۔"

ایسا کچھ نہیں ہوا اور میں اپنے دل و دماغ کو فرحانہ کی یاد سے مہکاتے ہوئے انکل آنٹی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ جنوری کے ابتدائی ایام تھے اور رات میں اچھی خاصی خنکی ہو جاتی تھی لہٰذا ایک اندرونی کمرے کو "ہیڈ کوارٹر" بنا لیا گیا۔ اتفاق سے فون کی لائن بھی اسی کمرے میں تھی۔

میں نے قلم اور رف پیڈ سنبھال لیا پھر عبدالخالق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "انکل میں نے آپ کو ہر زاویہ تفصیل سے سمجھا دیا ہے۔ آپ میری ہدایت کے مطابق عمل کریں گے۔ بیچ میں، میں آپ کی مدد کے لیے موجود ہوں۔ میں پیڈ پر لکھ کر آپ کو گائیڈ کرتا رہوں گا۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے عبدالخالق کو اپنے ڈرائنگ روم ہی میں اغوا کنندگان سے گفتگو کرنے کے اسرار و رموز اچھی طرح از بر کرا دیے تھے۔ میں سچویشن کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ شیروانی کا ایک اور وار خالی گیا تھا۔ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اب اس گھٹیا شخص سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ فرحانہ کو آزاد کرنے کے لیے رقم کا مطالبہ کرے گا۔ یہ میرا اندازہ تھا۔ آئندہ لمحات میں درحقیقت کیا پیش آنے والا تھا اس کے بارے میں قبل از وقت حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میری ہدایت کے جواب میں انکل خالق نے اثبات میں گردن ہلائی اور بڑی فرمانبرداری سے بولے "بیٹا جب ہم نے تمہیں اپنا بڑا مان لیا ہے تو پھر تمہاری ہر بات بھی مانیں گے۔"

"بڑے تو آپ ہی ہیں انکل آپ اس قسم کی باتیں کر کے خوامخواہ مجھے گناہ گار نہ کریں۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "یہ معاملہ ایسا ہے کہ اگر آپ نے اپنا دماغ چلایا تو کوئی بھی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ میں اپنے دشمن کے انداز اور عادت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"بے فکر ہو جاؤ بیٹا!" امینہ آنٹی نے کہا۔ "ہم تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ فرحانہ کو کوئی نقصان نہ ہو۔"

"دنیا کی کوئی طاقت فرحانہ کا ایک بال بھی بانکا نہیں کر سکتی، نقصان پہنچانا تو بہت بڑی بات ہے۔" میں نے چٹانی لہجے میں کہا۔

ان لمحات میں مجھے خود بھی اپنی آواز عجیب سی لگی تھی۔ میرا یہ دعویٰ میرے سچے جذبات کا ترجمان تھا۔ فرحانہ میری جان تھی۔ میری زندگی تھی بلکہ میری زندگی کا حاصل تھی۔ میں اسے شمہ بھر نقصان پہنچتے ہوئے بھی بھلا کیسے دیکھ سکتا تھا۔ امی کے سامنے میں نے بڑے صبر و سکون کا مظاہرہ کیا تھا لیکن مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس ذلیل شیروانی نے میرے ساتھ جو دشمن داری شروع کی تھی وہ بہت دور تک جانے والی تھی۔ آگ اور خون کا یہ خطرناک کھیل آسانی سے رکنے والا نہیں تھا۔

میں انہی آتشیں خیالات کے ساتھ الجھا ہوا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انکل، آنٹی اور شازیہ نے یک بہ یک چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے فون اٹینڈ کیا۔ وہ وحید صاحب کی کال تھی۔ میرے "ہیلو" کے جواب میں انہوں نے پوچھا۔

"مسٹر اسد! کیا رہا۔ اغوا کنندگان کی طرف سے کوئی رابطہ کیا گیا؟"

"جی وحید صاحب! رابطہ ہو چکا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"بلکہ اغوا کنندگان سے میری تفصیلی بات بھی ہو گئی ہے۔"

"کیا وہ نامراد انہی میں سے کوئی ہے جنہیں خالد صاحب نے فارغ کیا تھا؟" وحید صاحب نے پوچھا۔ "میرا ذہن بار بار ادھر ہی جا رہا ہے۔"

"نہیں وحید صاحب" میں نے کہا۔ "اغوا کی اس کارروائی میں ان تینوں میں سے کسی کا ہاتھ نہیں۔ یہ میرے کسی اور دشمن کا کارنامہ ہے۔"

"کیا آپ اپنے اس دشمن کو جانتے ہیں۔"

"برائے نام سا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بدذات ایک ایسا شخص ہے جسے نت نئی دشمنیاں پالنے اور پھر انہیں نبھانے کا شوق ہے۔ دو ماہ پہلے ایک ذرا سی بات پر میری اس سے منہ ماری ہو گئی تھی۔ اس نے اس واقعے کو ایشو بنا لیا اور چند روز قبل مجھے اپنے غنڈوں سے پٹوانے کی کوشش بھی کی۔ اس وقت میرا دوست خوش ولی بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ ہم دونوں نے مل کر اس کے بھیجے ہوئے بدمعاشوں کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی تھی۔ اس کے چند روز بعد یہ فرحانہ کا اغوا والا واقعہ پیش آ گیا ہے۔"

"اس نامعقول کے نام سے واقف ہیں آپ۔" وحید صاحب نے پوچھا۔

"جی آج ہی واقف ہوا ہوں۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "اس نے اپنا نام ندیم شیروانی بتایا ہے اور خود کو وہ انتہائی خطرناک بھی ڈکلیئر کر رہا تھا۔" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"وحید صاحب! میں نے اس بندے کو صرف دو بار دیکھا ہے اور دونوں مرتبہ آئی آئی چندریگر روڈ پر "برہانی ٹریڈرز" والی بلڈنگ کے بہت قریب اس کے پاس سفید رنگ کی ہنڈا سٹی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسی علاقے میں کوئی بزنس کرتا ہے۔"

"اس کا حلیہ بتا سکتے ہیں؟" وحید صاحب نے سوال کیا۔

میں نے جواب میں انہیں شیروانی کا قد کاٹھ، وضع قطع اور حلیے سے تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ میری بات مکمل ہونے پر انہوں نے کہا۔

"میں اپنے طور پر اس بندے کو چیک کرانے کی کوشش کروں گا۔ اگر اس کا آفس عاطف صاحب کی فرم کے آس پاس ہی ہے تو وہ زیادہ عرصے تک میری نظر سے اوجھل نہیں رہ سکے گا۔" لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر اسد! ان حالات میں، میں آپ کی جو بھی مدد کر سکتا ہوں، بلا تکلف بتائیں۔"

"بس آپ میرے حق میں دعا کرتے رہیں۔" میں نے کہا۔ "باقی میں سب نمٹ لوں گا۔ اس کمینے کو ہینڈل کرنا میرے لیے مشکل ثابت نہیں ہوگا۔"

"اوکے۔" انہوں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "جیسے ہی معاملہ آگے بڑھے اور کوئی نئی بات سامنے آئے آپ فوراً مجھے اطلاع دیں گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی ضرور۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "وحید صاحب! جب تک فرحانہ بہ خیر و عافیت گھر واپس نہیں آجاتی۔ میں فیکٹری نہیں آسکوں گا۔"

"فیکٹری کو فی الحال آپ ذہن سے نکال دیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "میں نے خالد صاحب کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کردیا ہے۔"

"تھینک یو وحید صاحب!" میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ خلوص دل سے بولے۔ "یو آر آلویز ویل کم مسٹر اسد!"

اس کے بعد ہمارے درمیان قائم سیلولر رابطہ ختم ہوگیا۔

اِدھر میرا فون کال سے فری ہوا' اُدھر اس کی گھنٹی بج اٹھی۔ نمبر اجنبی تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے "ہیلو" کہا۔

"تمہارا فون اتنا بزی کیوں جارہا تھا۔" شیروانی کی جھلائی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "میں کافی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں۔ کیا پولیس کو اس معاملے میں گھسیٹنے کی کوشش کررہے تھے؟"

"یہ تمہارا وہم ہوسکتا ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "فرحانہ کے گھر کا نمبر نوٹ کرو۔ میرا مطلب ہے فون نمبر۔"

اس نے نمبر نوٹ کرنے کے بعد کہا۔ "اس لڑکی نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس کے پڑوسی ہو اور یہ تمہاری اسٹوڈنٹ بھی ہے۔"

"فرحانہ نے تمہیں جو بھی بتایا ہے وہ غلط نہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "اب اس پنچائت کا کیا مقصد ہے۔"

میں نے شیروانی کے ساتھ شروع ہی سے ایسا رویہ اپنا رکھا تھا۔ جیسے مجھے فرحانہ کی زیادہ پروا نہیں ہے۔ یہ بہت ضروری تھا۔ اگر اسے پتا چل جاتا کہ فرحانہ میری کمزوری ہے تو اس کا پلڑا بھاری ہوجاتا۔ ابھی تک تو میں نے اسے جوتے کی نوک پر رکھا ہوا تھا۔ میری کمزوری کا احساس ہوجانے کے بعد وہ مجھے ذلیل کرنے کی ہر کوشش کرتا۔ اس موقع پر فرحانہ کو عقل مندی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ اسے اپنی کسی بھی بات سے شیروانی کو یہ احساس نہیں ہونے دینا چاہیے تھا کہ ہمارے بیچ کوئی سنجیدہ رشتہ قائم ہوچکا ہے۔

"کیا تم اس وقت فرحانہ کے گھر ہی میں بیٹھے ہوئے ہو۔" شیروانی نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں۔" میں نے قطعیت سے جواب دیا۔ "میں اپنے گھر میں ہوں۔ فرحانہ کے گھر کا فون نمبر تمہارے پاس پہنچ چکا ہے۔ اب تم میرے کان کھانے کے بجائے ان لوگوں سے رابطہ کرو۔"

"تم اتنی آسانی سے خود کو اس معاملے سے الگ نہیں کرسکتے اسد!" وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں ذرا فرحانہ کے گھر والوں سے بات کرلوں پھر بتاتا ہوں' تمہیں مزید کیا کرنا ہے۔"

"جب کی جب دیکھی جائے گی۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میرا فون آن ہے۔ جب جی چاہے کال کرلینا۔ چوہے کی طرح بل میں چھپ کر بیٹھنا مجھے نہیں آتا۔" اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

میں نے شازیہ سے کہا کہ وہ گھر سے میرے سیل فون کا چارجر لے آئے۔ مسلسل استعمال سے اس کی بیٹری لو ہورہی تھی۔ ابھی پتا نہیں' مجھے اور کتنی لمبی لمبی کالیں ریسیو کرنا تھیں۔

شازیہ "جی' بھائی جان!" کہتے ہوئے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ اگلے ہی لمحے خالق صاحب کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے انہیں فون اٹینڈ

کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسپیکر فون آن کردیجیے گا۔"

انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی اور ریسیور کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ میں کھسک کر ان کے قریب جا بیٹھا اور احتیاطاً میں نے اپنا سیل فون وائبریٹر پر ڈال دیا تاکہ اگر وہ شیطان چیک کرنے کے لیے مجھے کال کرے تو خالق صاحب کے فون سے اسے میرے سیل فون کی گھنٹی سنائی نہ دے۔

"ہیلو!" عبدالخالق جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولے۔

"کیا تم فرحانہ کے باپ عبدالخالق ہو۔" اسپیکر فون سے شیروانی کی تصدیق طلب آواز ابھری۔

انکل خالق نے میری ہدایات کے مطابق عمل شروع کردیا سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہاں میں فرحانہ کا باپ ہوں۔ مگر تم کون ہو اور میری بیٹی کو کیسے جانتے ہو؟"

"فرحانہ اس وقت میرے قبضے میں ہے۔"

"اوہ' تم وہی ہو جس نے میری بیٹی کو اغوا کیا ہے؟"

"ہاں صحیح پہچانا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"ہم سے تمہاری کیا دشمنی ہے بھائی!" خالق نے پریشانی بھرے انداز میں کہا۔ "ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ ہم تو تمہیں جانتے تک نہیں۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"تم میرا نام اور دشمنی کا سبب جاننے کے چکر میں پڑ کر وقت برباد کروگے۔" وہ سفاکی سے بولا۔ "اس سے تمہاری بیٹی کے لیے مشکلات کھڑی ہوسکتی ہیں۔ تمہیں صرف اس بات پر توجہ دینا چاہیے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔"

"کک..... کیا چاہتے ہو تم؟" خالق صاحب نے پوچھا۔

شیروانی نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ "صرف پانچ لاکھ روپے۔"

میں ساتھ ساتھ رف پیڈ پر خالق صاحب کے لیے ہدایت بھی تحریر کرتا جارہا تھا۔ جو شیروانی کے سوالات کے جواب میں خالق صاحب کو فالو کرنا تھیں۔

"صرف پانچ لاکھ.....؟" خالق صاحب نے اس کے الفاظ دہرائے۔ "یہ بات تو تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے پانچ ہزار ہوں۔ بھائی! میری اتنی حیثیت نہیں ہے میں گھڑیوں کی ایک معمولی سی دکان چلاتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے' تمہیں اپنی بیٹی سے محبت نہیں۔" وہ بے دردی سے بولا۔ "ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی۔"

"ایک منٹ.....!" خالق صاحب نے میری ہدایت کے مطابق تڑپ کر کہا۔

"تم میری بات کا یقین کرو۔ میں اتنی بڑی رقم کا انتظام نہیں کرسکتا۔"

"میں تمہیں انتظام کرنے کے لیے وقت دیتا ہوں۔" شیروانی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "کل شام پانچ بجے تک کا وقت ہے تمہارے پاس۔"

"رقم بہت زیادہ ہے اور مہلت انتہائی کم۔" خالق صاحب نے بے بسی سے کہا۔ "بھائی! مجھ پر رحم کرو۔ میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"میں تمہیں رات بھر سوچنے کا موقع دیتا ہوا۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔ "صبح تک تم کسی فیصلے تک پہنچ ہی جاؤ گے۔ میں ٹھیک آٹھ بجے صبح تمہیں دوبارہ فون کروں گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے لیے بیٹی زیادہ اہم ہے یا پانچ لاکھ روپے اور ایک بات ذہن میں رکھتے ہوئے کوئی بھی فیصلہ کرنا۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

courtesy www.pdfbooksfree.pk

”پانچ لاکھ میں سے ایک پیسا بھی کم نہیں ہوگا۔ میں نے تمہاری حیثیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہی یہ فیصلہ کیا ہے ورنہ پانچ لاکھ کی آج کل اوقات ہی کیا ہے او کے اللہ حافظ۔“

”ایک منٹ‘ ایک منٹ......!“ خالق صاحب نے اضطراری انداز میں کہا۔

”فرحانہ کی ماں کا برا حال ہے۔ ذرا اسے فرحانہ کی آواز سنا دو۔ اس طرح انہیں یہ یقین آ جائے گا کہ ہماری بیٹی تمہارے قبضے میں ہے۔“

”ضرور‘ ضرور یہ تو پارٹی کا حق بنتا ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

”آپ لوگ اپنی بیٹی کی صرف آواز ہی نہ سنو بلکہ اپنی تسلی کے لیے اس سے ایک دو باتیں بھی کرلو۔“

شیروانی کی بات ختم ہوئی تو اسپیکر فون پر فرحانہ کی آواز ابھری۔ ”ابو! یہ بہت سفاک لوگ ہیں۔ آپ ان کی بات مان لیں اور مجھے فوراً گھر لے جائیں۔“

اس دوران میں آنٹی امینہ کھسک کر فون کے قریب آ گئی تھیں۔ میں نے بڑے واضح انداز میں شازیہ کو اشارہ کر دیا تھا کہ اس کی آواز نہیں نکلنا چاہیے۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا کر میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا تھا۔

”بیٹی میری جان! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ خالق صاحب نے شفقت پدری میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں ان ظالموں کے چنگل سے صحیح و سلامت چھڑا لاؤں گا۔“

امینہ آنٹی نے ممتا سے لب ریز آواز میں پوچھا۔ ”بیٹی! تم خیریت سے تو ہو نا۔ ان لوگوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں دی؟“

”نہیں امی......!“ فرحانہ نے مختصراً کہا۔

اس کے بعد شیروانی کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ”ابھی تک تو تم لوگوں کی بیٹی ٹھیک ٹھاک اور صحیح سلامت ہے لیکن اگر تم نے میرے مطالبے پر توجہ نہ دی تو میں اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکوں گا۔“

اس دھمکی کے ساتھ شیروانی نے رابطہ منقطع کر دیا۔

آنٹی امینہ کی سسکی نکل گئی۔ وہ روہانسی آواز میں بولیں۔ ”وہ حرامی میری بچی کو مار ڈالے گا۔“ پھر وہ روئے سخن خالق صاحب کی طرف پھیرتے ہوئے بولیں۔ ”آپ کہیں سے بھی پانچ لاکھ کا بندوبست کریں۔ میں فرحانہ کو ذرا سی تکلیف پہنچتے نہیں دیکھ سکتی۔“

”آنٹی کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”کل شام کے پانچ بجنے میں ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ جب تک ہم کوئی نہ کوئی راستا نکال ہی لیں گے۔ آپ نے اگر حوصلہ ہار دیا تو میرے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔“

”میں اپنی بیٹی کی زندگی کی خاطر دکان بیچ ڈالوں گا۔“ خالق صاحب جذباتی لہجے میں بولے۔ ”جان ہے تو جہان ہے۔“

”اس کی نوبت نہیں آئے گی انکل!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”مجھے قوی امید ہے کہ میں اس معاملے کو بہ خوبی ہینڈل کر لوں گا اور بہ فرضِ محال......!“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک تپتی ہوئی سانس خارج کی پھر بڑے اعتماد سے اپنی بات مکمل کر دی۔

”بہ فرضِ محال‘ اگر اس کمینے کو پانچ لاکھ دینا بھی پڑے تو اس رقم کا میں خود انتظام کروں گا۔ آپ کی دکان ان شاء اللہ۔ فروخت نہیں ہوگی۔“

”بیٹا!“ دونوں نے بہ یک وقت الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم اتنی بڑی رقم کا بندوبست کہاں سے کرو گے؟“

”میں جب کہہ رہا ہوں تو ایسا کر کے بھی دکھاؤں گا۔“ میں نے بدستور اٹل لہجے میں کہا۔ ”فرحانہ کو میری دشمنی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس کو ان لوگوں سے چھڑا کر بہ حفاظت واپس لانا میری ذمے داری ہے۔ اگر میں فرحانہ کی رہائی کے لیے پانچ لاکھ خرچ کروں گا تو بعد میں یہ رقم میں اغوا کنندگان کی ناک کے راستے نکال بھی لوں گا۔ آپ خاموشی سے تماشا دیکھیں۔ آگے آگے ہوتا ہے کیا!“

میری بات ختم ہوئی تو سیل فون کے وائبریٹر نے مخصوص تھرتھراہٹ کے ساتھ کسی کال کی آمد کا اعلان کیا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ وہ شیروانی کی کال ہوگی۔ میں نے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کال اٹینڈ کر لی۔ میری توقع کے عین مطابق وہ ندیم شیروانی تھا۔

”ہیلو......!“ اس کی مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے بےزار کن لہجے میں کہا۔ ”ہاں‘ بولو۔“

”میں نے فرحانہ کے باپ سے بات کر لی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”مبارک ہو۔“ میں نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔ ”میں نے خالق سے پانچ لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔“

”کیا اس رقم سے تمہارا جہنمی پیٹ بھر جائے گا۔“ میں نے دانستہ اس کی باتوں پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔

”کیا تم ہر وقت مرچیں چبائے رہتے ہو۔“ وہ تلخی آمیز لہجے میں بولا۔ ”کسی بات کا سیدھا جواب نہیں ہے تمہارے پاس۔“

”اگر آج تک تم نے مجھ سے کوئی سیدھی بات کی ہوتی تو پھر تمہارا یہ شکوہ بجا ہوتا۔“ میں نے بیزاری کے عالم میں کہا۔ ”ہمارا پہلا تعارف ہی خاصا خوں خوار تھا۔ تم نے مجھے گالی دی تھی اور میں نے تمہاری ناک کو خون اگلنے پر مجبور کر دیا تھا۔“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو......!“

”مجھے تمہاری ایک ایک بدتمیزی اور سرکشی اچھی طرح یاد ہے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ”اور میں تم سے چن چن کر حساب لوں گا۔“

”ادھار تو تم نے بھی مجھ پر بہت چڑھا دیا ہے۔“ میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ”اللہ مجھے تمہارا قرض اتارنے کا جلد ہی موقع فراہم کرے گا۔“

وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ”میں نے فرحانہ کے باپ سے جتنی رقم مانگی ہے کیا وہ کل شام پانچ بجے سے پہلے اس کا انتظام کر پائے گا؟“

”مجھے اس بات کا کوئی اندازہ نہیں۔“ میں نے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر انکل خالق کو اپنی بیٹی کی زندگی عزیز ہوگی تو وہ کہیں سے بھی پانچ لاکھ اکٹھے کر کے تمہارے منہ میں ضرور ٹھونسے گا۔“

”وہ لوگ تمہارے پڑوسی ہیں۔“ وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ ”کیا اس مشکل کی گھڑی میں تم ان کی مدد نہیں کرو گے؟“

”میں بھلا کسی کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ میں نے روکھے لہجے میں کہا۔ ”میں تو خود ایک غریب مسکین آدمی ہوں۔“

”میں بتاؤں گا تم اپنے پڑوسیوں کی کس طرح مدد کر سکتے ہو۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”صبح ٹھیک آٹھ بجے میں دوبارہ خالق کو فون کروں گا اگر اس موقع پر تم بھی وہاں موجود رہو تو اچھی بات ہے۔“

”میں کوئی تمہارا ملازم نہیں ہوں جو تم ڈکٹیشن دے رہے ہو۔“ میں نے غصہ دلانے والے انداز میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”تم جاؤ جہنم میں الٹی کھوپڑی سمیت۔“ وہ بھنا کر بولا۔

میں نے یہ کہتے ہوئے لائن کاٹ دی۔ ”سیم ٹو یو۔“ آنٹی امینہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”کون سی بات آنٹی!“ میں نے پوچھا۔

”بیٹا! تمہاری تمام تر ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہیں اور تم فرحانہ کی واپسی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے بھی تیار ہو لیکن......!“ انہوں نے توقف کر کے متذبذب انداز میں مجھے دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولیں۔

”لیکن جب تم اس شیطان سے بات کرتے ہو تو تمہارے انداز میں ہمارے لیے کھلی لاتعلقی پائی جاتی ہے ایسا کیوں بیٹا......؟“

”آپ نے اغوا کنندگان کو شیطان کہہ کر سارا مسئلہ ہی حل کر دیا ہے آنٹی۔“ میں نے ایک پرسکون سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”شیطان، انسان کا کھلا دشمن ہے لہٰذا اپنے دشمن کی نظر سے اپنی کمزوریوں کو چھپا کر رکھنا چاہیے۔ اگر اس کمینے کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ میں فرحانہ کی واپسی کے مشن میں سب سے زیادہ سرگرم ہوں تو پھر وہ آپ کے لیے ایسی ایسی مشکلات کھڑی کرے گا جس کا آپ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ میں آپ سے لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھوں۔“

”اسد بیٹا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ عبدالخالق نے توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہماری کشتی کا ناخدا یہی ہے اور مجھے اپنے پروردگار سے پوری امید ہے کہ یہ نیا بخیر و عافیت کنارے لگے گی۔“

”ان شاء اللہ!“ میں نے تہہ دل سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”انکل! صبح آٹھ بجے تک راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ آپ اطمینان سے نیند پوری کریں تاکہ کل حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے تازہ دم رہیں۔“

شازیہ بھی میری تقلید میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ آنٹی امینہ نے امید بھری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شازیہ بیٹی! آج کی رات تم ہمارے گھر میں رک جاؤ۔ فرحانہ کے بغیر یہ گھر کتنا سونا سونا ہو رہا ہے۔“

شازیہ نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا تو میں نے اسے فرحانہ کے گھر رات گزارنے کی اجازت دے دی اور خود اپنے گھر چلا آیا۔

امی میرے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو قدرے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پھر میرے عقب میں دور تک نگاہ دوڑاتے ہوئے بولیں۔

”شازیہ کہاں ہے؟“

”امینہ آنٹی نے اسے روک لیا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ فرحانہ کو بہت مس کر رہی ہیں۔“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا جو شازیہ کو وہاں چھوڑ دیا۔“ امی نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ”واقعی، آج اس گھر پر جو قیامت ٹوٹی ہے اسے الفاظ میں بیان کرنا یا اعصاب پر سہنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔“

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

امی مجھ سے اس ٹیلی فونک گفتگو کی تفصیل جاننے کو بے قرار تھیں جو تھوڑی دیر پہلے انکل خالق اور شیروانی کے بیچ ہوئی تھی۔ میں نے انہیں من و عن یہ احوال سنا دیا میرے خاموش ہونے پر امی نے کہا۔

”یہ شیروانی بہت ہی کائیاں اور فتنہ پرور انسان ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ تمہاری دشمنی کے حوالے سے اس کا تیر تکا بن گیا ہے تو اس نے پیسے کھرے کرنے کے لیے دوسری چال چلی ہے۔“

”امی! شیروانی جیسے بدخصلت اور شیروانی صفت شخص سے کوئی بھی گھٹیا سے گھٹیا حرکت سرزد ہو سکتی ہے۔“ میں نے کڑواہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں بھی اسے من مانی کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اس کا زہر نکالنے کے میرے پاس ایک سو ایک طریقے ہیں۔“

”تمہارے عزائم سے مجھے ڈر لگ رہا ہے بیٹا!“ امی نے تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ ”سچ بتاؤ، تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

قبل اس کے کہ میں امی کے پرتفکر سوال کا جواب دیتا۔ میرے سیل فون کے وائبریٹر نے کسی کال کی آمد کا اعلان کیا۔ میں نے فوراً کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

”ہیلو، کون؟“

نمبر اجنبی تھا چنانچہ مجھے لفظ ”کون“ کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ دوسری جانب سے ایک جانی پہچانی دبنگ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”مسٹر اسد، یہ میں ہوں...... عاطف رشید۔“

”اوہ......!“ میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ ”سر! آپ اور اتنی رات کو؟“

”ہاں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”مجھے بھائی صاحب کی زبانی تمہارے تازہ ترین حالات کی خبر ہوئی ہے۔ تازہ سچویشن کیا ہے؟“

”سر میں ابھی آپ کو پیپرز میں سے دیکھ کر بتاتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں امی کے پاس سے اٹھا اور ڈرائنگ روم کی جانب قدم بڑھا دیے۔

”پیپر میں سے دیکھ کر......!“ عاطف صاحب کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

”سوری سر!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں اس وقت امی کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہاں کھل کر بات نہیں ہو سکتی تھی اس لیے انہیں سنانے کے لیے میں نے وہ جملہ بول دیا تھا۔ اب میں ڈرائنگ روم میں آ گیا ہوں۔“

”ویری گڈ۔“ وہ سراہنے والے انداز میں بولے۔ ”آپ بہت موقع شناس اور معاملہ فہم ہیں مسٹر اسد!“

”تھینک یو سر!“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ پھر انہیں تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ”اغوا کنندہ صبح آٹھ بجے مغوی کے باپ سے رابطہ کرے گا اور بتائے گا کہ شام پانچ بجے کہاں رقم پہنچا کر فرحانہ کو وصول کرنا ہے۔ اس نے پانچ لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔“

”آپ نے اس سلسلے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔“ عاطف صاحب نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”یہ واقعہ آپ کی دشمنی کے سبب پیش آیا ہے اور مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ مغوی کے والدین نے سب کچھ آپ پر چھوڑ دیا ہے۔“ وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئے پھر گہری سانس خارج کرتے ہوئے ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

”کیا اس معاملے میں پولیس کو ملوث کرنے کی ضرورت ہے؟“

”ہرگز نہیں سر!“ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”فرحانہ کا باپ اس کے حق میں نہیں۔ ماضی کے ایک تلخ تجربے کی بنا پر وہ کسی بھی قیمت پر پولیس پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں۔ اگر میں کہوں گا تو وہ کسی نہ کسی طرح پانچ لاکھ کا بندوبست بھی کر دے گا۔“

”اور آپ کے کیا ارادے ہیں؟“

”سر!“ میں اس کمینے بدذات کے چہرے پر اتنے چرکے لگانا چاہتا ہوں کہ آئینہ دیکھ کر وہ خود کو پہچان پائے۔“ میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”اس شخص نے مجھے بہت زیادہ ذہنی اور روحانی اذیت پہنچائی ہے۔“

”ریلیکس مسٹر اسد!“ عاطف صاحب کی گمبھیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”یہ موقع جوش میں آنے کا نہیں‘ ہوش میں رہنے کا ہے۔“ میں نے یہ پوچھا تھا کہ رقم کی ادائی کے سلسلے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”میں اس شیطان کو پھوٹی کوڑی بھی نہیں دوں گا اور فرحانہ کو بخیر و عافیت اس کے چنگل سے بھی نکال لاؤں گا۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”میں آپ کے جذبے اور ہمت کی قدر کرتا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ”لیکن اس کے لیے بڑی مضبوط حکمت عملی کی ضرورت ہوگی۔“

”اس کی صبح آٹھ بجے والی کال کے بعد ہی کوئی حکمتِ عملی ترتیب دی جاسکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”جب تک یہ معلوم نہ ہوجائے کہ وہ کس طرح رقم وصول کرنا چاہتے ہیں اور فرحانہ کی واپسی کیسے ہوگی۔ میں کوئی منصوبہ نہیں بنا سکتا۔“

”او کے صبح اغوا کنندہ سے جو بھی بات ہو‘ آپ مجھے اس سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔“ عاطف صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کے جس بھی کام آسکا‘ مجھے خوشی ہوگی۔“

”تھینک یو سر!“ میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ ہمارے محسن ہیں اسد اللہ۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ”لہٰذا کسی بھی موقع پر تکلف سے کام نہیں لیجیے گا۔“

”سر! آپ سے ایک فوری فیور چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں بولیں۔“ ان کی مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”میں کل کا پورا دن خوش ولی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی موجودی میں مجھے بڑا حوصلہ ملتا ہے۔“

”ٹھیک ہے آپ اس سے کانٹیکٹ کر کے پروگرام سیٹ کرلیں۔“ وہ فراخ دلی سے بولے۔

الوداعی کلمات کے بعد ہمارے بیچ سلسلۂ رابطہ ختم ہوگیا۔

میں واپس امی کے کمرے میں آ گیا۔ امی نے تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”کس کا فون تھا؟“

”عاطف صاحب کا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”برہانی ٹریڈرز کے مالک‘ میں نے آپ کو ان کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔“

”کیا کہہ رہے تھے وہ؟“ امی نے بدستور تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔

”میرے پاس ایک فائل میں ان کے کچھ کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔“ میں نے موقع محل کی مناسبت سے معاملات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”انہی کے بارے میں کچھ پوچھ رہے تھے بہرحال.....!“ میں نے ذرا رک کر ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”وہ جو کچھ جاننا چاہ رہے تھے میں نے انہیں بتا دیا ہے۔“

”بیٹا!“ امی خاصی فکرمندی سے بولیں۔ ”فرحانہ والا معاملہ خاصا الجھ نہیں گیا۔“

”اگر الجھ گیا ہے تو وقت آنے پر سلجھ بھی جائے گا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں سب سنبھال لوں گا۔“

”ایک بات پوچھوں۔ سچ سچ بتاؤ گے؟“ امی نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے گول مول جواب نہیں چاہیے۔“

”ٹھیک ہے امی۔“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”آپ پوچھیں میں سیدھا اور کھرا جواب دوں گا۔“

”کیا فرحانہ کے ساتھ تمہارا کوئی خاص تعلق ہے۔“ امی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”کیوں.....!“ میں چونک اٹھا۔ ”آپ کس حوالے سے پوچھ رہی ہیں؟“

امی کے لہجے میں شامل سنسنی خیزی نے میرے ذہن کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ پتا نہیں انہوں نے یہ سوال کس مقصد سے کیا تھا۔ انسان کے دل میں چور ہو تو اس کا چہرہ چغلی کھائے بغیر نہیں رہتا۔ مجھے نہیں معلوم ان لمحات میں میرے چہرے پر کس قسم کے تاثرات تھے البتہ امی کی کھوجتی ہوئی نگاہ مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔

”سوال پر سوال نہیں کرتے۔“ امی نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ”جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ فرحانہ کی ذات کے حوالے سے تمہاری سرگرمی بے معنی نہیں ہے۔“

”میں کب کہہ رہا ہوں‘ بے معنی ہے۔“ میں نے خود کو قابو میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ندیم شیروانی میرا دشمن ہے میں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اگرچہ اس نقصان کا تعلق مالی معاملات سے تھا تاہم ندیم شیروانی نے میرے ہاتھوں خاصی ہزیمت اٹھائی ہے۔ وہ ایک منتقم المزاج شخص ہے۔ اپنی ذلت کا بدلہ چکانے کے لیے اس نے میرے گھر کا سراغ لگایا اور پھر مجھے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کے لیے میری بہن شازیہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات کہ شازی اپنی خوش قسمتی کے باعث اغوا ہونے سے محفوظ رہی اور فرحانہ کی غلطی نے اسے میرے دشمن کے پاس پہنچا دیا۔ یہ ٹھیک ہے فرحانہ اپنی غلطی کے باعث اس مصیبت میں گرفتار ہوئی ہے لیکن.....!“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فرحانہ کے ساتھ جو ناخوش گوار واقعہ پیش آیا ہے اس کا ذمے دار میں ہوں۔ لہٰذا اس کی بخیریت بازیابی کے لیے اگر میں سر گرم ہوں تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے۔“

”اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔“ میرے خاموش ہونے پر امی نے گمبھیر انداز میں کہا۔

”تم جو کچھ کر رہے ہو‘ یہ تمہارا فرض بنتا ہے۔ اس نازک موقع پر ہم اپنے پڑوسیوں کی جتنی بھی مدد کریں وہ کم ہے۔ اسی خیال کے تحت میں نے شازیہ کو فرحانہ کے گھر میں رات گزارنے کی اجازت بھی دی ہے۔ بیٹا! پڑوسیوں کے بہت زیادہ حقوق ہوتے ہیں۔ تمہیں سرگرم اور متفکر دیکھ کر مجھے قلبی سکون اور اطمینان حاصل ہو رہا ہے مگر.....!“

امی نے جملہ نامکمل چھوڑا تو میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ”مگر کیا امی!“

”مگر یہ کہ.....!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولیں۔ ”میں نے جو سوال کیا تھا‘ شاید تم اس کا زاویہ نہیں سمجھ سکے ہو۔“

امی پہیلیوں کے انداز میں اپنے استفسار کی پرتیں کھول رہی تھیں۔ ان کے اسی پراسرار انداز سے میرے دل کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پتا نہیں‘ وہ کس کھوج میں تھیں۔ میں نے ان کی سوچ تک رسائی حاصل کرنے کی خاطر کہا۔

”آپ سمجھائیں گی جبھی تو آپ کا زاویہ میری سمجھ میں آئے گا امی!“

”میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا فرحانہ کی ذات میں تمہاری دلچسپی موجودہ واقعے کے سبب ہے یا اندر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خانہ کوئی اور معاملہ بھی ہے۔" امی نے ٹٹولنے والے انداز میں سوال کیا۔ "مجھے شازیہ کی زبانی اڑتی اڑتی کچھ سننے کو تو ملی ہے لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔"

شازیہ کی بچی نے پتا نہیں امی کو کیا کیا بتایا تھا۔ وہ مجھے بھی بڑے معنی خیز انداز میں فرحانہ کے حوالے سے چھیڑتی رہتی تھی۔ شازیہ اور فرحانہ میں گہری دوستی تھی۔ یقیناً فرحانہ نے میرے اور اپنے تعلقات کے بارے میں شازیہ کو بتایا ہوگا یہ معاملہ شازیہ کے ذریعے امی تک پہنچ گیا تھا۔ امی نے ہم دونوں یعنی مجھے اور شازی کو دوستوں کی طرح رکھ کر پالا تھا اور ہم بے دھڑک اور بے جھجک ہر بات ان سے کرلیا کرتے تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ کسی بے تکلف اور مخلص دوست کا سا برتاؤ کیا کرتی تھیں لہٰذا ہمارے بیچ جھوٹ، مکر وفریب یا ریاکاری وغیرہ کا گزر نہیں تھا۔ منافقت سے امی کو سخت چڑ تھی۔

"جب شازیہ نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے تو آپ میرے منہ سے کیوں سننا چاہتی ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس نے آپ سے کوئی غلط بیانی تو نہیں کی ہوگی۔"

"میں نے جس انداز میں تم دونوں کی پرورش کی ہے اس کے نتیجے میں کسی غلط فہمی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اسد!" امی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنی تربیت پر پورا بھروسا ہے۔"

"پھر..... پھر الجھن کس بات کی ہے امی؟" میں نے متعجب نظر سے انہیں دیکھا۔

"الجھن کوئی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی پریشانی ہے۔" وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولیں۔ "بس میں دوطرفہ تصدیق چاہتی ہوں۔"

اس مرتبہ میں نے امی کے ادھورے جملے پر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولیں۔

"اسد! کسی بھی معاملے کی ادھوری معلومات ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ انسان آدھے سچ اور آدھے جھوٹ میں الجھ کر کہیں کا نہیں رہتا اور کوئی بہت بڑا نقصان اٹھالیتا ہے۔ میں تازہ ترین حالات کی نزاکت کو اچھی طرح محسوس کرسکتی ہوں۔ اس ہنگامی صورتِ حال میں تم خاصے متفکر اور پریشان ہو چنانچہ میں تمہارے ذہن کو کسی نئے امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ.....!" امی نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولیں۔

"شازیہ کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ فرحانہ صرف تمہاری اسٹوڈنٹ ہی نہیں بلکہ وہ ایک خاص زاویے سے تمہاری ذات میں بھی دلچسپی رکھتی ہے۔ وہ تمہیں پسند کرتی ہے میں بات گھما پھرا کر نہیں کرنا چاہتی۔ سادہ الفاظ میں یوں سمجھو کہ فرحانہ تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتی ہے کیا یہ درست ہے؟"

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی امی یہ درست ہے۔"

"اس سلسلے میں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" امی نے استفسار کیا۔ "میرے نزدیک تمہاری بات کی زیادہ اہمیت ہے اس لیے پوچھ رہی ہوں۔"

"میں بھی اسے پسند کرتا ہوں۔" میں نے جی کڑا کر کے کہہ دیا۔ "اور اس سے شادی کی خواہش رکھتا ہوں۔"

امی نے ایک سکون بخش سانس خارج کی اور مطمئن انداز میں بولیں۔ "بس یہی جاننا چاہتی تھی۔"

"امی!" میں نے مستحکم انداز میں کہا۔ "میری خواہش اور خوشی اپنی جگہ لیکن اگر آپ کو میرا یہ فیصلہ

پسند نہ آئے تو میں آپ کی خواہش کے سامنے سر جھکا دوں گا۔"

"میں اپنی اولاد کا سر کسی قیمت پر جھکنے نہیں دوں گی۔" امی نے بڑے تفاخر سے کہا۔

"میں نے تم دونوں کو اعتماد کے ساتھ سر اٹھا کر جینا سکھایا ہے۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی ہو نہیں سکتی کہ تم دونوں میرے جذبات کا احترام کرتے ہو لہٰذا میں تمہارے جذبات کا خون کس طرح کرسکتی ہوں۔ تمہاری پسند مجھے بھی پسند ہے اسد! جتنی جلدی ہو سکے فرحانہ کو اس شیطان کے چنگل سے چھڑا لاؤ۔ میری دعائیں اور نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔"

"تھینک یو امی!" فرطِ جذبات سے میری آواز لرز کر رہ گئی۔

اسی لمحے میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے سیل کی اسکرین پر نگاہ ڈالی تو وہاں خوش ولی کا نام نظر آیا۔ میں نے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا دوست خوش ولی ہے۔ آپ آرام کریں میں ڈرائنگ روم میں جا کر اسے حالات کی سنگینی سے آگاہ کرتا ہوں۔"

امی نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں ان کے پاس سے اٹھ آیا اور خوش ولی کی کال ریسیو کرتے ہوئے ڈرائنگ روم کی جانب قدم بڑھا دیے۔

"ہیلو خوش ولی!"

"یار اسد!" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ "تھوڑی دیر پہلے عاطف صاحب نے مجھے فون کیا تھا انہوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ کل میں آفس نہیں جاؤں گا بلکہ کل پورا دن مجھے تمہارے ساتھ گزارنا ہے۔"

"ہاں اس کے لیے میں نے ہی عاطف صاحب سے درخواست کی تھی۔" میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم صبح آٹھ کے بعد کسی بھی وقت میرے گھر آجاؤ۔"

"خیریت تو ہے نا.....؟" خوش ولی کی آواز سے فکرمندی جھلکتی تھی۔

"خیریت نہیں ہے یار!" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"تمہاری امی اور شازیہ تو ٹھیک ہے نا؟" اس کی تشویش میں اضافہ ہوگیا۔

"ہاں وہ دونوں خیر وعافیت سے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "مگر فرحانہ کے ساتھ تھوڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ!" وہ تیز آواز میں مستفسر ہوا۔

"فرحانہ کو اغوا کرلیا گیا ہے۔" میں نے بکھرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"کک..... کیا کہہ رہے..... ہو یار.....؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" میں نے حتی الامکان خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "مجھے کل تمہاری اشد ضرورت ہے۔"

"کل کیوں میں ابھی آجاتا ہوں۔" وہ بڑی اپنائیت سے بولا۔ "لیکن کچھ بتاؤ تو سہی۔ یہ سب ہوا کیسے؟"

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں خوش ولی کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔

"فرحانہ کو اغوا کرنے والا وہ منحوس شخص ہے پہلے میں نے جس کی ناک سے خون کا فوارہ چھڑایا تھا اور ازاں بعد ہم دونوں نے مل کر ریلوے لائن پر اس کے بھیجے ہوئے غنڈوں کی ٹھکائی کی تھی۔ وہ در حقیقت شازیہ کو اغوا کرنا چاہتا تھا۔ مگر فرحانہ کی شوخی نے اسے اس مصیبت میں ڈال دیا اور سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ وہ میرے اور فرحانہ کے تعلق سے آگاہ ہو چکا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں، یہ تو واقعی تشویش ناک بات ہے۔" وہ تائیدی انداز میں بولا۔

"وہ مردود شازیہ کو اغوا کر کے تمہیں ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ فرحانہ کی شکل میں تمہاری ایک اہم کمزوری اس کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہ اس سچویشن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا لیکن یار.....!" لمحاتی توقف کر کے خوش ولی نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی؟"

"کون سی بات؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"جب اسے پتا چل چکا ہے کہ فرحانہ کے ساتھ تمہارا قلبی ناتا ہے تو پھر اسے صرف اور صرف تم پر فوکس کرنا چاہیے تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس صورت میں فرحانہ کے باپ سے پانچ لاکھ تاوان کا مطالبہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"اس نکتے نے ابتدا میں میرے ذہن کو بھی الجھایا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن پھر یہ بات کھل گئی کہ اس خبیث کو بعد میں پتا چلا تھا کہ میرے اور فرحانہ کے بیچ کوئی سنجیدہ معاملہ ہے۔ اس سے پہلے وہ پانچ لاکھ تاوان کا مطالبہ کر چکا تھا۔"

"گویا وہ ایک تیر سے دو شکار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔" خوش ولی نے پرسوچ انداز میں کہا۔ "آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔"

"مجھے بھی کچھ ایسی ہی صورت نظر آ رہی ہے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اس عاقبت نا اندیش شیروانی کو یہ پتا نہیں کہ اس نے کس بلا کو چھیڑ دیا ہے۔ میں اس کمینے کو وہ عبرت انگیز اور یادگار سبق سکھاؤں گا کہ اس کی آنے والی نسلیں میرا نام لے کر اپنے بچوں کو ڈرایا کریں گے۔ میرا نام اسد اللہ ہے یعنی اللہ کا شیر۔ میں اس شیروانی کو ہڈیوں سمیت کچا چبا ڈالوں گا۔"

"تم بہت جذباتی ہو رہے ہو اسد!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں ابھی تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ اس وقت تمہیں میری اشد ضرورت ہے۔"

"نہیں یار! پریشانی والی کوئی بات نہیں!" میں نے صدقِ دل سے کہا۔ "تم صبح آ جانا میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اختتامی کلمات کے بعد ہمارے بیچ سیلولر رابطہ ختم ہو گیا۔

اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ میں فرحانہ کے اغوا کے سبب سخت ذہنی اذیت میں مبتلا تھا اور ہر لمحہ اسے شیروانی کے پنجے سے آزاد کرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن میرے اعصاب اتنے بھی کمزور نہیں تھے کہ رات گزارنے کے لیے مجھے کسی سہارے کی ضرورت پیش آتی۔ میں نے بچپن سے جوانی تک مشکلات اور سخت حالات کا سامنا کیا تھا اور زمانے کی ٹھوکروں نے مجھے اندر باہر سے خاصا مضبوط بنا دیا تھا۔ فرحانہ کا اغوا وقتی پریشانی ضرور تھی تاہم مجھے یقین تھا کہ میں اس پریشانی کو اپنی تدبیر سے اپنے پاؤں کا جوتا بنا لوں گا۔ جو خدا انسان کی آزمائش کے لیے اسے پریشانی میں ڈالتا ہے وہی پریشانی سے نکلنے کا عزم اور حوصلہ بھی بخشتا ہے۔ ایک مسلمان ہونے کے ناتے اس بات پر میرا پختہ ایمان تھا اور مجھے اس فلسفے کا بارہا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔

.....☆☆☆.....

آٹھ بجنے میں ایک منٹ باقی تھا۔ میں اس وقت فرحانہ کے گھر میں موجود تھا۔ میں، فرحانہ کی امی امینہ بیگم اور فرحانہ کا باپ عبدالخالق ٹیلے فون سیٹ کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ شازیہ کو میں نے امی کے پاس بھیج دیا تھا۔ اغوا کار خبیث الاخبیث ندیم

شیروانی نے آٹھ بجے فون کرنے کو کہا تھا اور ہم اس کی کال کا انتظار کر رہے تھے۔

ٹھیک آٹھ بجے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ کم بخت ٹائم کا بہت پابند ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے خالق صاحب کو اشارہ کیا کہ وہ فون اٹینڈ کریں۔ تیسری گھنٹی پر انہوں نے ریسیور اٹھا لیا اور اس کے ساتھ ہی عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فون کا اسپیکر بھی آن کر دیا تاکہ ان کے بیچ ہونے والی گفتگو میں ہم دوسری طرف کی آوازیں بھی سن سکیں۔ "ہم" سے میری مراد میں اور امینہ بیگم ہیں۔ عبدالخالق تو پہلے ہی فون کا ریسیور کان سے لگائے بیٹھے تھے۔

اسپیکر پر شیروانی کی برہم آواز ابھری۔ وہ عبدالخالق سے مخاطب تھا۔ "ریسیور اٹھانے میں اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

"میں..... فون سے تھوڑا دور بیٹھا تھا۔" عبدالخالق نے گھبراہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں اپنی بیٹی کی ذرا بھی پروا نہیں۔" وہ سفاکی سے بولا۔ "تمہیں تو چاہیے تھا کہ ایک گھنٹا پہلے ہی فون سیٹ سے لپٹ کر بیٹھ جاتے۔"

"آئندہ میں یہ غلطی نہیں کروں گا۔ پہلی گھنٹی پر ہی تمہاری کال ریسیو کر لوں گا۔" عبدالخالق نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "فرحانہ کیسی ہے، اس سے میری بات کراؤ۔"

"فرحانہ زندہ ہے اور میری قید میں ہے!" وہ سنگ دلی کا مظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "اس سے تمہاری بات بعد میں کرا دوں گا پہلے یہ بتاؤ، میرا کام کیا یا نہیں؟"

"تم نے جتنی رقم کا مطالبہ کیا ہے وہ میرے اختیار سے باہر ہے۔" عبدالخالق نے بے بسی کہا۔ "لیکن میں پھر بھی تمہاری دی ہوئی مہلت تک ارینج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کی کوشش کروں گا۔ وعدہ کرو کہ تم فرحانہ کو ایک ذرا سی بھی گزند نہیں.....!"

"میں رقم کے انتظام کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہوں احمق انسان۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ "یہ پانچ لاکھ تو میں ہر صورت میں وصول کروں گا۔ اس کے بعد ہی تمہاری بیٹی کی بہ خیریت واپسی ممکن ہو سکے گی۔"

"پھر..... پھر....." عبدالخالق نے لکنت زدہ لہجے میں کہا۔ "تم..... کس کام کی..... بات کر رہے ہو؟"

"لگتا ہے، بیٹی کی جدائی نے تمہاری یادداشت کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ "میں نے کل تمہیں ہدایت کی تھی کہ جب آج صبح آٹھ بجے میں فون کروں تو تمہارا پڑوسی بھی فون کے پاس موجود ہونا چاہیے..... کچھ یاد آیا یا نہیں؟"

"ہاں ہاں! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" عبدالخالق نے جلدی سے کہا۔ "میں نے تمہاری ہدایت پر عمل کیا ہے۔ اسد اس وقت میرے پاس ہی بیٹھا ہے۔"

"فون اس کو دو....." شیروانی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

عبدالخالق نے چپ چاپ ریسیور میری جانب بڑھا دیا۔

"ہیلو.....!" میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

"کیسے ہو سورما!" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "محبوبہ کی جدائی نے تمہاری اکڑ میں کوئی کمی کی یا ابھی تک اسی طرح کلف لگے ہوئے ہو.....؟"

شیروانی کے ریمارکس پر امینہ بیگم اور عبدالخالق کے چہروں پر حیرت اور الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اسپیکر آن ہونے کے سبب شیروانی کی بے ہودہ گوئی نے فرحانہ کے والدین کی سماعت تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آ سکتا تاہم میں نے ترکش کے باقی تیروں کو فریز کرنے کی غرض سے ہاتھ بڑھا کر فی الفور ٹیلی فون کا اسپیکر آف کر دیا پھر ماؤتھ پیس میں کہا۔

"کیا تم نے اسی بکواس کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے؟"

"رسّی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔" اس نے چوٹ کی۔ "میرے ساتھ کوئی بھی سخت بات کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھو کہ تمہاری جانِ من اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ تمہارے گناہوں کی سزا اس بے چاری کو بھگتنا پڑے۔"

"میں تمہاری ان گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں ہوں شیروانی!" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "اس لیے اپنی توانائی اور میرا وقت ضائع کرنے کی حماقت سے باز آ جاؤ تو یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔"

"کون گیدڑ ہے اور کون چیتا....." وہ پھنکار سے مشابہ لہجے میں بولا۔ "اس کا فیصلہ آج ہو جائے گا۔ میں تمہیں بھیگی بلی سے بھی زیادہ قابلِ رحم بنا دوں گا۔"

"دو مرتبہ ہمارا آمنا سامنا ہو چکا ہے شیروانی!" میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "تم میں اگر تھوڑی سی بھی سمجھ بوجھ ہے تو گیدڑ اور چیتے کا فرق تم پر واضح ہو چکا ہوگا....." لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر دوٹوک الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس لیے تم وقت برباد کرنے کے بجائے کام کی بات کرو تو اچھا ہے....."

"کام کی بات.....!" وہ الفاظ کو چباتے ہوئے بولا۔ "کام کی بات یہ ہے کہ پانچ لاکھ روپے کی رقم لے کر تم میرے پاس آؤ گے..... صرف تم....."

"منظور ہے آگے بولو.....؟"

"یہ رقم ایک ہزار والے نوٹوں کی شکل میں ہوگی۔"

اس نے بتایا۔ یعنی ایک ایک لاکھ والی پانچ گڈیاں جنہیں تم کسی چھوٹے ہینڈ بیگ میں رکھ کر مجھ تک پہنچاؤ گے۔"

"ڈن!" میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری بات پوری توجہ سے سن رہا ہوں، بولتے جاؤ۔"

"بیگ سرخ رنگ کا ہوگا....." اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"اوکے.....!" میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"اور..... اور تم کسی ہوشیاری یا چالاکی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔" وہ تنبیہہ کرنے والے انداز میں بولا۔ "تمہاری کوئی بھی ایفی شینسی یا غیر نصابی سرگرمی فرحانہ کی زندگی کا چراغ گل کر سکتی ہے۔"

"میں تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" میں نے اندرونی جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے نہایت ہی تحمل سے کہا۔

"میری اس وارننگ کو خالی خولی دھمکی نہیں سمجھنا۔" وہ سفاکی سے بولا۔ "میں نے اپنے ایک خاص آدمی کو تمہاری نگرانی پر مامور کر دیا ہے۔ وہ مجھے تمہاری سرگرمیوں کی پل پل کی خبر دے گا۔ اگر تم نے پولیس سے رابطہ کرنے یا اپنے طور پر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو سمجھ لینا کہ.....!"

اس نے دھمکی آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے کہا۔ "بے فکر رہو۔ میں تمہاری ہدایت پر من و عن عمل کروں گا۔ اب یہ بھی بتا دو کہ پانچ لاکھ کی رقم لے کر مجھے کہاں آنا ہے؟"

"اتنی بے تابی اچھی نہیں....." وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "پہلے تم لوگ رقم کا بندوبست کر لو۔ میں تین بجے سہ پہر دوبارہ فون کروں گا اور بتاؤں گا کہ تمہیں کیسے اور کہاں رقم پہنچانا ہے۔"

"شیروانی!" میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے اور ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں تمہاری خواہش اور ہدایت کے عین مطابق پانچ لاکھ کی رقم کے ساتھ جہاں تم کہو گے، تن تنہا آ جاؤں گا لیکن تم بھی ایک بات اپنے ذہن میں بٹھا لو کہ فرحانہ کا ایک بال بھی بانکا نہیں ہونا چاہیے۔ میں فیئر ڈیل کا قائل ہوں، اگر تمہاری طرف سے کوئی کھیل کھیلا گیا تو پھر مجھ سے کوئی شکایت نہیں کرنا۔ میں فرحانہ کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں..... کچھ بھی۔"

میں جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ عبدالخالق اور امینہ بیگم کی نگاہیں تو ویسے ہی مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ ایک مرتبہ پھر چونک کر مجھے دیکھنے لگے تھے۔ پہلے جب فون کا اسپیکر آن تھا اور شیروانی نے میری محبوبہ کے حوالے سے فرحانہ کا ذکر کیا تھا تو بھی ان دونوں کے چہروں اور آنکھوں میں اچانک حیرت اور الجھن امڈ آئی تھی۔ بہرحال یہ اچھا ہوا کہ انہوں نے مجھ سے کسی قسم کا استفسار نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں، یہ ان کی مصلحت تھی یا وقتی مجبوری!

شیروانی نے میری بات کے جواب میں کہا۔ "تم بھی فکر نہ کرو، میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا۔ فرحانہ کے لیے تمہارے جذبات کو میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں لیکن مجھے حیرت ہے کہ ابھی تک تم نے اس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی.....؟"

"چھوٹی چھوٹی باتوں پر حیران نہ ہوا کرو۔ اس سے تم اعصابی امراض میں مبتلا ہو سکتے ہو۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "تم فرحانہ کے ماں باپ سے اس کی بات کرا دو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔"

"تم بھی کیا یاد کرو گے.....!" وہ فراخ دلی سے بولا۔

میں نے ریسیور عبدالخالق کی جانب بڑھاتے ہوئے فون کا اسپیکر آن کر دیا تاکہ امینہ بیگم بھی بیٹی کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آواز آسانی سے سن سکے۔ اگلے ہی لمحے اسپیکر پر فرحانہ کی ڈری سہمی آواز ابھری۔

"ابو..... یہ بہت ظالم لوگ ہیں..... پلیز..... آپ ان کا مطالبہ پورا کر کے مجھے..... جلد از جلد چھڑا لیں....."

"فکر نہ کرو بیٹی! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" عبدالخالق نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "آج رات کو تم اپنے گھر میں اطمینان سے سوگی۔"

"میری بچی! تم ٹھیک تو ہو نا.....؟" امینہ بیگم نے جذبات سے مغلوب آواز میں پوچھا۔

"جی امی....." فرحانہ نے نہایت ہی مختصر جواب دیا۔

"تم رات کو اچھی طرح سوئی تھیں نا!" امینہ بیگم مامتا بھرے لہجے میں مستفسر ہوئیں۔ "ان لوگوں نے تمہیں کھانا تو دیا تھا نا..... تم نے ناشتا کیا ہے یا....."

امینہ بیگم کی بات پوری ہونے سے پہلے فون کا اسپیکر ڈیڈ ہو گیا۔ اب وہاں سے کسی قسم کی کوئی آواز نہیں ابھر رہی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ندیم شیروانی نے ٹیلی فونک رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ اب تین بجے سے پہلے اس سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔

عبدالخالق نے ریسیور کریڈل کیا اور تشویش بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ فرحانہ کی امی کی نگاہ بھی مجھی پر لگی ہوئی تھی۔ میرے دل کا چور مجھے ڈرانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے پوچھیں گے کہ میں فرحانہ کے لیے اتنا جذباتی کیوں ہو رہا ہوں اور شیروانی نے فرحانہ کے لیے میری محبوبہ کے الفاظ کیوں استعمال کیے تھے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرے تمام تر خدشات بے بنیاد ثابت ہوئے تھے۔

"بیٹا! اس نازک موقع پر ہمیں تمہارے تعاون اور مدد کی اشد ضرورت ہے۔" عبدالخالق کی غم زدہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "تمہیں ہمت کر کے جانا ہوگا اور فرحانہ کو بہ خیریت واپس لانا ہوگا۔ ہم تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھیں گے۔"

"انکل! آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ایک پڑوسی ہونے کے ناتے یہ مجھ پر فرض ہے کہ میں ان مشکل حالات میں آپ لوگوں کے کام آؤں اور پھر یہ بھی تو دیکھیں، شیروانی کی آپ سے کوئی دشمنی نہیں، فرحانہ میری وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہوئی ہے۔"

"بیٹا! تم بار بار خود کو قصوروار ٹھہرانے کی کوشش نہ کرو۔" امینہ بیگم نے خلوصِ دل سے کہا۔ "جو پریشانی اور دکھ قسمت میں لکھے ہوتے ہیں، وہ مل کر رہتے ہیں۔ ہمیں تم جیسے پڑوسیوں پر فخر ہے۔"

"میں ان شاء اللہ! تین بجے سے پہلے پانچ لاکھ روپے ارینج کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔" عبدالخالق نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "اور اس شیطان کا بتایا ہوا چھوٹا سا سرخ ہینڈ بیگ بھی، تم ذہنی طور پر خود کو تیار کر لو۔"

"انکل! میں ہر لمحہ تیار ہوں۔" میں نے ایک عزم سے کہا۔ "اگر آپ کو رقم کا بندوبست کرنے میں کوئی دقت یا دشواری محسوس ہو رہی ہو تو میں کوشش کر سکتا ہوں۔"

یہ بات میں نے اس بنیاد پر کہی تھی کہ رات عاطف رشید نے اس حوالے سے مجھے مطمئن رہنے کی یقین دہانی کرادی تھی۔ اگر میں ان سے کہتا تو وہ پانچ لاکھ کا انتظام کر سکتے تھے۔ میری کوششوں نے انہیں جتنے بڑے نقصان سے بچایا تھا، یہ پانچ لاکھ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے لیکن تلخ بات یہ ہے کہ میں شیروانی کو ایک روپیا دیے بغیر اس کی شیروانی اتروانے کے موڈ میں تھا۔

"نہیں بیٹا....." عبدالخالق نے نفی میں گردن

ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صدفی صد یقین ہے کہ میں رقم کا بندوبست کر لوں گا۔"

میں ان میاں بیوی کو تسلی دلاسا دے کر واپس آ گیا۔

گھر کا دروازہ شازیہ نے کھولا اور مجھے بتایا۔

"بھائی جان! آپ کے دوست آئے بیٹھے ہیں....."

"تمہارا مطلب ہے خوش ولی؟" میں نے سوالیہ نظروں سے شازیہ کی طرف دیکھا۔

"جی بھائی جان!" شازیہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "امی نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے اور خود بھی وہیں موجود ہیں۔"

میں ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی امی نے خوش ولی سے کہا۔

"لو..... اسد آ گیا۔"

رسمی علیک سلیک کے بعد خوش ولی نے مجھ سے پوچھا۔

"آنٹی بتا رہی تھیں تم شیروانی سے بات کرنے گئے ہو، کیا کہا اس منحوس نے؟"

"ہاں بیٹا!" امی نے بھی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "اس شیطان کی اولاد سے کیا باتیں ہوئیں؟"

میں نے بڑے نپے تلے الفاظ میں، ندیم شیروانی سے ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو کا خلاصہ ان دونوں کے گوش گزار کر دیا۔ امی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے اسد! کیا عبدالخالق سہ پہر تک تین بجے سے پہلے پانچ لاکھ کا انتظام کر لے گا؟"

"انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ بندوبست کر لیں گے۔" میں نے کہا۔

"تب تو ٹھیک ہے۔" امی نے اطمینان بھری سانس خارج کی پھر اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔ "تم لوگ آپس میں باتیں کرو، میں ناشتا بھجواتی ہوں۔"

"آنٹی اس تکلف کی ضرورت نہیں۔" خوش ولی جلدی سے بولا۔

"اسد نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا۔" امی بولیں۔ "تم بھی میرے بیٹے کی طرح ہو، اسے ناشتا کرانے کے ساتھ ساتھ خود بھی کرو گے۔"

خوش ولی لاجواب ہو کر امی کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "امی! اس مردود شیروانی نے ہمارے گھروں کی نگرانی کا بندوبست کر رکھا ہے، اس لیے بالکل نارمل انداز میں ایکٹ کرنا ہے۔ محلے میں کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ ہم اس وقت کتنے سنگین حالات سے گزر رہے ہیں۔ میں نے انکل اور آنٹی کو تو اس سلسلے میں ہدایات دے دی ہیں۔ آپ بھی اس نکتے کو ذہن میں رکھیے گا اور شازیہ کو بھی اچھی طرح سمجھا دیجیے گا۔"

"تم بے فکر رہو.....!" امی نے تشفی آمیز انداز میں کہا اور ڈرائنگ روم سے نکل گئیں۔

"یار اسد! مجھے تو یہ بات بالکل بکواس لگ رہی ہے۔" امی کے جانے کے بعد خوش ولی نے کہا۔

"کون سی بات؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"یہی کہ شیروانی نے ہمارے گھروں کی نگرانی کا بندوبست کر رکھا ہے۔" اس نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں، یہ صرف اس نے تمہیں ڈرانے اور قابو میں رکھنے کے لیے شوشہ چھوڑا ہے۔"

"مجھے اس کی یہ دھمکی کھوکھلی ہی لگتی ہے۔" میں نے خوش ولی کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن احتیاط کرنے میں کیا حرج ہے....."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کوئی مضائقہ یا حرج نہیں ہے۔" وہ سرسری انداز میں بولا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔ "کیا تم واقعی پانچ لاکھ روپے ہینڈ بیگ میں رکھ کر شیروانی کی خدمت میں پیش کردو گے؟"

"ہرگز نہیں!" میں نے پوری قطعیت سے کہا۔

"پھر تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"فرحانہ کا باپ مجھے جو پانچ لاکھ روپے دے گا' میں ان میں سے صرف دس ہزار روپے استعمال کروں گا۔" میں نے خوش ولی کو اپنے ذہن میں ترتیب پانے والے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"یعنی ہر گڈی کے اوپر اور نیچے ہزار کا اصلی نوٹ ہوگا۔ ان نوٹوں کے اندر پوری گڈی جعلی نوٹوں سے بھری ہوگی اس طرح ایک لاکھ والی گڈی تیار کرنے میں صرف دو ہزار روپے خرچ ہوں گے اور پانچ لاکھ کی تیاری میں کُل دس ہزار روپے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے نوٹ کہاں سے حاصل کرنا ہیں لیکن یہ راز صرف ہم دونوں کے بیچ رہے گا۔ میں عبدالخالق کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"گڈ آئیڈیا!" وہ ستائشی انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن ہم یہ دس ہزار بھی ضائع کیے بغیر فرحانہ کو صحیح وسلامت واپس لے آئیں گے۔"

"ان شاءاللہ!" میں نے پورے یقین سے کہا۔

خوش ولی نے بڑے اعتماد سے میری آواز میں آواز ملائی۔ "ان شاءاللہ!"

"خوش ولی!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گمبھیر انداز میں بولنا شروع کیا۔ "ندیم شیروانی نے مجھے تنِ تنہا پانچ لاکھ کی رقم لے کر ٹھیک پانچ بجے اس مقام پر پہنچنے کا حکم دیا ہے جس کے بارے میں وہ تین بجے بتائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ایک ساتھ اس مشن پر روانہ نہیں ہوسکیں گے۔"

"اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "جب وہ کمینہ تین بجے تمہیں مخصوص مقام کے بارے میں بتائے گا تو تم مجھے انفارم کردینا۔ دو گھنٹے اچھا خاصا وقت ہوتا ہے۔ انسان بڑی آسانی سے کراچی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ سکتا ہے۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"میں تم سے پہلے مطلوبہ مقام پر پہنچ جاؤں گا۔"

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہم اس مشن میں شانے سے شانہ ملا کر قدم بہ قدم ایک ساتھ رہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"یہ کس طرح ممکن ہوسکے گا؟" وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

"دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے خوش ولی!" میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اور میں نے جو کہا ہے' اسے کرکے بھی دکھا سکتا ہوں۔"

"ہوں۔" خوش ولی کریدنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب ہے' تمہارے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ ہے؟"

"بالکل.....!" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایسی ہی بات ہے۔"

"وہ بات میں بھی تو سنوں۔" وہ پراسرار انداز میں بولا۔

میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے خوش ولی کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ حیرت اور دل چسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے سننے لگا۔

❁.....❁

وہ کم بخت الوکا چرخا شیروانی وقت کا بہت پکا تھا۔ ٹھیک تین بجے اس نے فرحانہ کے گھر فون کرکے

پہلے تو عبدالخالق سے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ پانچ لاکھ کا بندوبست ہوا یا نہیں۔ عبدالخالق نے جواب میں جب اسے تسلی کرادی تو پھر وہ مجھے ہدایات دینے لگا تھا۔ ظاہر ہے اس موقع پر میں بھی عبدالخالق کے پاس ہی موجود تھا۔ یہ ٹیلی فونک گفتگو بڑی اہمیت کی حامل تھی۔

اس کی ہدایات میں اہم پوائنٹس کچھ اس طرح تھے۔ میں گھر سے رقم لے کر بالکل اکیلا نکلوں گا اور مقررہ مقام تک پہنچنے کے دوران میں کوئی مجھے جوائن نہیں کرے گا۔ میں بس' ویگن یا موٹر سائیکل پر سفر نہیں کروں گا۔ بلکہ مخصوص مقام تک رسائی کے لیے میں رکشا یا ٹیکسی استعمال کروں گا۔ میرے پاس رقم والے سرخ ہینڈ بیگ کے سوا اور کوئی سامان نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بچ بھی لگا دی تھی کہ اس کا ایک شاطر آدمی مسلسل میری نگرانی کررہا ہے۔ اگر میں نے شیروانی کی حکم عدولی کی تو پھر فرحانہ کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔

میں نے اپنے منصوبے کی روشنی میں اس کی ہدایت کو فالو کرنے کی کوشش کی تھی مثلاً یہ کہ میرے ہاتھ میں صرف سرخ ہینڈ بیگ تھا۔ لیکن اس بیگ کے اندر صرف دس ہزار کے اصلی نوٹ تھے۔ میں نے بڑی محنت سے یہ گڈیاں تیار کی تھیں۔ میرے گھر سے مخصوص مقام کا فاصلہ آدھے پونے گھنٹے کا تھا مگر میں ٹھیک چار بجے گھر سے نکلا تھا۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت میں بالکل اکیلا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے خوش ولی نے بھی جوائن کرلیا تھا اور یہ میرے منصوبے کا نہایت ہی حساس حصہ تھا۔

خوش ولی نے پچھلے کچھ عرصے میں کئی جاب ٹرائی کی تھیں جن میں رکشا ڈرائیوری بھی شامل تھی اگرچہ یہ کام اس نے صرف دو ماہ ہی کیا تھا تاہم اس عرصے میں وہ ڈرائیونگ سیکھ گیا تھا۔ اس کے ایک دوست کا اپنا رکشا تھا۔ آج وہی رکشا ہمارے مشن میں ایک اہم کردار ادا کرنے جارہا تھا۔

میں گھر سے ٹھیک چار بجے نکلا اور ٹہلتے ہوئے بس اسٹاپ کی جانب بڑھنے لگا۔ سرخ ہینڈ بیگ میرے ہاتھ میں تھا۔ بس اسٹاپ میرے گھر سے واکنگ ڈسٹینس پر واقع تھا۔ جلد ہی میں وہاں پہنچ گیا۔ خوش ولی مجھ سے پہلے وہاں موجود تھا۔ اس نے اپنا حلیہ اس طرح تبدیل کیا تھا کہ دیکھ کر میں بھی دنگ رہ گیا۔ وہ ایک رکشا کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بالکل پہچاننے میں نہیں آرہا تھا۔ مجھے چونکہ اس کے رکشا کا نمبر ازبر تھا لہٰذا کسی وقت کا سامنا نہیں تھا۔

میں نے اس خیال سے کہ اگر واقعی شیروانی نے اپنا کوئی آدمی میری نگرانی پر مامور کر رکھا ہے تو اسے کسی قسم کا شک نہ ہو' خوش ولی کے پاس جانے سے پہلے دو تین اور رکشا والوں سے بھاؤ تاؤ کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ میں شیروانی کی ہدایات پر من و عن عمل کررہا ہوں۔ بالآخر میں خوش ولی والے رکشا کی جانب بڑھ گیا اور اس کے پاس پہنچ کر کہا۔

"ہمیں یونیورسٹی روڈ پر چلتے ہوئے گلستان جوہر کے آخری سرے پر اس علاقے میں پہنچنا ہے جہاں تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے مگر لوگوں نے باقاعدہ رہائش اختیار نہیں کی۔ میں راستے میں تمہیں گائیڈ کرتا رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے' سمجھ گیا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

خوش ولی سے یہ باتیں میں دھیمے لہجے میں کررہا تھا تاکہ دیکھنے والوں کو یہی محسوس ہو کہ میں کرایے وغیرہ کے سلسلے میں بارگیننگ کررہا ہوں۔

"راستے میں ہم زیادہ بات نہیں کریں گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا۔ ”میں نے شیروانی سے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ہم نے کس زیرِ تعمیر بنگلے میں جانا ہے۔ میں راہ نمائی کرتے ہوئے تمہیں اس بنگلے کے قریب پہنچادوں گا اور کرایہ ادا کر کے رکشا سے اتر جاؤں گا۔ تم بھی مجھے وہاں چھوڑ کر نارمل انداز میں آگے بڑھ جاؤ گے لیکن ایک چکر کاٹنے کے بعد واپس آؤ گے اور مذکورہ بنگلے کے نزدیک ہی کہیں رک کر میرے فون کا انتظار کرو گے۔ میں نہیں جانتا۔ بنگلے کے اندر کیا حالات پیش آئیں گے تمہیں میری فوری مدد کے لیے تیار رہنا ہے۔“

”یار! میں پوری تیاری کے ساتھ آیا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے ٹھوس انداز میں بولا۔ ”میرے رکشا میں کچھ ایسا سامان بھی موجود ہے جس کی کسی بھی ہنگامی صورتِ حال میں اچانک ضرورت پیش آسکتی ہے۔“

خوش ولی نے لفظ ”سامان“ پر اچھا خاصا زور ڈالا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ اس کا اشارہ آتشیں اسلحے کی جانب تھا۔ میں نے اطمینان بخش سانس خارج کی اور رکشا پر سوار ہو گیا۔

ندیم شیروانی نے مجھے جس بنگلے کا ایڈریس سمجھایا تھا اسے تلاش کرنا میرے لیے قطعی مشکل نہیں تھا۔ میں نے گلستان جوہر کا چپہ چپہ دیکھ رکھا تھا۔ اس کی چالاکی کی داد دینے کو دل چاہتا تھا کیونکہ مذکورہ بنگلہ زیرِ تعمیر ہونے کے ساتھ ساتھ الگ تھلگ بھی تھا یعنی اس کے گرد و پیش میں کئی پلاٹ خالی پڑے ہوئے تھے۔ اس لوکیشن کا شیروانی کو سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہاں بڑے محفوظ انداز سے رقم اور فرحانہ کی ڈیلیوری عمل میں لائی جاسکتی تھی۔ علاوہ ازیں اگر میں اپنے ساتھ کسی کو لے کر آتا یا کچھ دیر کے بعد کسی کو اپنی مدد کے لیے بلانے کا ارادہ رکھتا تو میرا مددگار فوراً شیروانی کی نگاہ میں آجاتا۔

خوش ولی نے دھیمی رفتار سے رکشا چلاتے ہوئے پانچ منٹ کم پانچ پر مجھے مطلوبہ بنگلے کے سامنے پہنچا دیا۔ راستے میں ایک آدھ بار اس نے مجھے اپنے پاس سامان رکھنے کا بھی مشورہ دیا تھا لیکن میں نے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا تھا۔ یہ ”سامان“ کم بخت ایسی شے ہے کہ اپنے استعمال پر خوامخواہ اُکساتی ہے۔

میں نے ہپ پاکٹ میں سے بٹوا نکال کر خوش ولی کو کرایہ ادا کیا۔ جب وہ رکشا کو آگے بڑھا لے گیا تو میں نے بنگلے کے گیٹ کی سمت قدم بڑھا دیے۔

شیروانی نے مجھے بتایا تھا کہ بنگلے کا گیٹ اندر سے بند نہیں ہوگا۔ میں گیٹ پر تھوڑا سا دباؤ ڈالوں گا تو وہ گیٹ خود بخود کھل جائے گا۔ مجھے بنگلے کے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر رقم والا ہینڈ بیگ سینٹر ٹیبل پر رکھنا ہوگا۔ شیشے کی ٹاپ والی اسی ٹیبل پر مجھے ایک چابی رکھی ملے گی۔ وہ چابی اندرونی کمرے کی ہے۔ مذکورہ کمرے کے دروازے پر چاک کی مدد سے بڑا سا کراس کا نشان بنا ہوگا۔ میں ڈرائنگ روم سے نکل کر اندر کی جانب قدم بڑھاؤں گا تو کراس والا کمرا میری نگاہ کے سامنے پڑے گا۔ اس کمرے میں فرحانہ بند ہوگی۔ میں چابی کی مدد سے وہ دروازہ کھولوں گا اور فرحانہ کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے روانہ ہو جاؤں گا یعنی اس بنگلے پر مجھے کسی سے ملنا ملانا یا بات چیت نہیں کرنا تھا۔ البتہ شیروانی نے مجھے خطرناک انداز میں وارننگ دی تھی کہ اگر میں نے کوئی مکر و فریب یا حد سے بڑھ کر کوئی کارکردگی دکھانے کی کوشش کی تو یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہوگا۔ اس احمق کو کیا پتا کہ میں وہاں کن عزائم کے ساتھ پہنچا تھا۔

شیروانی کا بیان کردہ بنگلے کا اندرونی سیٹ اپ بظاہر ذہن میں کھٹکتا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ میں

وہاں خاموشی سے جاؤں اور شرافت سے واپس آجاؤں لیکن جب میں نے گیٹ پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا اور وہ بڑی فرماں برداری سے کھلتا چلا گیا' علاوہ ازیں بنگلے کے اندر خاموشی اور سناٹے نے میرا استقبال کیا تو ایک لمحے کے لیے شیروانی کی باتوں کا یقین کرنے کو دل چاہا تھا تاہم میں نے کسی مرحلے پر احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے وسط میں گلاس ٹاپ ٹیبل پر ایک چابی رکھی نظر آرہی تھی۔ میں دبے قدموں ٹیبل کے پاس پہنچا اور چوکنا نظر سے چاروں جانب دیکھا۔ بنگلے کے سکوت سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں میرے سوا اور کوئی ذی الروح موجود نہیں۔

میں نے مطمئن ہو کر سرخ ہینڈ بیگ سینٹر ٹیبل پر رکھا اور وہاں سے چابی اٹھائی پھر ڈرائنگ روم سے نکل کر بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ خاموشی اور سناٹا اس قدر عمیق تھا کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں بڑی واضح سنائی دے رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دل میری کنپٹیوں میں دھڑک رہا ہو۔ گہرے سکوت کے باعث میرے قدموں کی چاپ بھی خاصی بلند آہنگ تھی۔

میں نے جیسے ہی ڈرائنگ روم سے باہر قدم نکالا کراس والا دروازہ میرے نگاہ میں آ گیا مذکورہ کمرا واقعی ڈرائنگ روم کے سامنے پڑتا تھا۔ کراس زدہ بند دروازے کے پیچھے میری جانِ جگر فرحانہ بند تھی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ میں چابی سے وہ دروازہ کھول کر اپنی رگِ حیات تک رسائی حاصل کرنے والا تھا۔ اس موقع پر میرے جذبات اور احساسات کی جو کیفیت تھی اسے الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

میں جیسے ہی بند دروازے کے قریب پہنچا۔ کمرے کے اندر سے دھیمی آواز ابھری۔

”سر..... جلدی دروازہ کھولیں اور مجھے ان لوگوں کی قید سے آزاد کرائیں۔ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔“

آواز چونکہ بند دروازے کے عقب سے آرہی تھی لہٰذا بلند آہنگ نہیں تھی۔ تاہم یہ ایک ایسی آواز تھی جسے میں لاکھوں' کروڑوں آوازوں میں الگ شناخت کر سکتا تھا۔ وہ میری جانِ تمنا فرحانہ کی آواز تھی۔

اس بات کا یقین ہو جانے کے بعد کہ بند دروازے کے پیچھے میری فرحانہ ہی ہے' مجھے خود پر اختیار نہ رہا۔ میں ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر بے اختیار دروازے کی جانب لپکا اور بڑی سرعت سے چابی کو کی ہول میں ڈالنے کی کوشش کی۔

چابی تالے کے سوراخ کے اندر تو چلی گئی مگر اسے گھمانے پر کھٹکا نہیں کھلا۔ میں اضطراری انداز میں زور آزمائی کرنے لگا اور اسی افراتفری میں اپنے گرد و پیش سے غافل ہو گیا۔

یہ لمحاتی غفلت مجھے بہت مہنگی پڑی۔ میں لاک کو کھولنے کی جدوجہد میں مصروف تھا کہ اچانک میرے سر کے عقبی حصے پر گویا کوئی قیامت ٹوٹ پڑی۔ کسی آہنی وزنی شے سے میری کھوپڑی کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ستارے سے جگ مگا اٹھے۔ اگلے ہی لمحے میرا ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

بے ہوش ہونے سے قبل جس آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی وہ فائرنگ کی مخصوص آواز تھی۔ اس کے بعد میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

(باقی آئندہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اقرار گناہ

محترم عمران احمد'
السّلام علیکم!
آپ کی ہدایت اور فرمائش پر ایک سچی کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ ہمارے معاشرے میں یہ وتیرہ بن گیا ہے کہ جب بھی کوئی تکلیف یا پریشانی آتی ہے ہم فوراً اس کا نمبہ دار قدرت کو قرار دے کر خود کو مظلوم سمجھنے لگتے ہیں مگر اپنے اعمال کا جائزہ نہیں لیتے۔ حالانکہ اپنی تکالیف اور پریشانیوں کے نمبہ دار ننانوے اعشاریہ ننانوے فیصد ہم خود ہوتے ہیں۔ یہ کہانی ایک ایسی خاتون کی ہے جس نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے گھرانے کو بکھرنے سے بچالیا۔ امید ہے یہ کہانی قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔

والسّلام
شہنی ارشاد
کراچی

محلے کے سارے بچے ان کے صحن میں کھیل رہے تھے۔ ان ڈھیر سارے بچوں میں خود ان کے اپنے بچے بھی شامل تھے۔ رشیدہ خالہ اور اسلم خالو بہت محبت اور پیار سے ان بچوں کے کھیل دیکھ رہے تھے۔ اگر بچوں میں کھیل کے دوران لڑائی جھگڑا ہو جاتا تو وہ فوراً ان بچوں کو پیار سے سمجھا کر ان کی آپس میں صلح کرا دیتے۔ اگر کسی بچے کو چوٹ لگ جاتی تو روتے ہوئے بچے کو پیار کرتے اور دوا لگا کر پٹی کر دیتے۔ خالہ رشیدہ کے گھر کھیلنے والے ان بچوں میں، میں بھی شامل تھی۔ ہم سارے ہی بچوں کو خالہ رشیدہ اور اسلم خالو سے بے حد محبت تھی۔ وہ تھے ہی ایسے۔ بہت نرم دل، ملن سار اور محبت کرنے والے۔ ہر بچے سے بلا امتیاز اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے تھے۔

ہم کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میں رہا کرتے تھے۔ یہ آج سے کوئی تیس پینتیس سال پرانی بات ہے میں اس وقت بچی ہی تھی۔ اللہ نے مجھے اچھی شکل وصورت اور خوب گورا رنگ دیا تھا۔ اس لیے خالہ اور خالو مجھے شہزادی کہا کرتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ خالہ کے پورے گھر والوں کا رنگ خوب پکا کالا تھا۔ شاید اسی لیے میں انہیں بہت اچھی لگا کرتی ہوں گی۔

خالہ کے کل چار بچے تھے دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ سب سے بڑی لڑکی تھی جن کے اصل نام سے ہم واقف نہیں تھے۔ وہ اپنی عرفیت کی وجہ سے پہچانی جاتی تھیں۔ وہ ہم سب سے بڑی تھیں۔ یعنی جوان تھیں اور سب انہیں منی باجی کہا کرتے تھے۔ منی باجی بھی خوب کالی تھیں۔ نین نقش بھی بھدے سے تھے، مگر ان کی زبان بہت میٹھی تھی۔ وہ سراپا محبت تھیں۔ ہم بچے تھے اس لیے ہمیں ان کی شکل وصورت سے نہیں ان کے پیار سے مطلب تھا۔ اگر کسی لڑکی کا ہاتھ منہ گندا ہوتا یا بال بکھرے ہوتے تو منی باجی جھٹ اس کا ہاتھ منہ صابن سے رگڑ رگڑ کر دھلا دیتیں۔ بالوں میں کنگھا کرتیں اور گھر سے کسی رنگین کپڑے کی کترن کو ربن بنا کر بالوں میں باندھ دیتیں۔

منی باجی سے چھوٹے دو لڑکے تھے اور آخری اولاد ایک لڑکی تھی۔ جو ہم سے ذرا سی چھوٹی تھی۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی خالہ کے گھر کھیلنے کی یہ وہ زمانہ تھا جب لوگوں میں آپس میں بہت پیار اور خلوص

ہوا کرتا تھا۔ لوگ اپنے رشتہ داروں سے زیادہ اپنے محلے والوں کو اپنا سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ، فکر اور پریشانی کو اپنا اور خوشی و مسرت کی گھڑیوں کو اپنا سمجھتے تھے۔ تقریباً سارے محلے والے ایک دوسرے کے اندرونی حالات سے بھی خوب واقف ہوتے تھے۔ کسی ایک کے گھر کوئی اچھی چیز پکتی تو جب تک وہ محلے کے ایک دو گھروں میں نہیں بھیج دیتے کھاتے نہیں تھے اور خالہ رشیدہ تو اس معاملے میں سب سے ہی آگے تھیں۔ غربت تھی مگر خلوص تھا اور آج کا دور یہ ہے کہ محلے میں کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی یہ تک پتا نہیں ہوتا کہ کس گھر میں کون بیمار ہے یا کس کی شادی ہے۔ باہر شامیانہ لگا دیکھا اور چند مرد سروں پر ٹوپیاں جمائے کھڑے دکھائی دیے تو اندازہ ہو گیا کہ یہاں کسی کی موت ہو گئی ہے جا کر معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم یا مرحومہ کتنے عرصے سے بیمار تھیں۔ یا پھر شادی کا کارڈ آ گیا تو شادی کی اطلاع ہو گئی سارے محلے والوں کی ان ہی موقعوں پر دعا سلام ہو گئی اور بس.....!

خالہ کا چھوٹا بیٹا کلیم دبلا پتلا اور کالا سا تھا۔ وہ بہت پھرتیلا اور تیز تھا۔ درختوں پر کسی بندر کی مانند تیزی سے چڑھ جاتا۔ اس زمانے میں لوگوں کے گھروں میں بڑے بڑے صحن ہوتے تھے اور ان میں کسی نہ کسی پھل کے درخت ہوتے تھے۔ خاص طور پر آم، امرود اور جامن کے درخت، املی کے درخت بھی اور بیر کے درخت بھی۔

کلیم ان کاموں میں بڑا ماہر تھا۔ بھری دوپہر میں جب سب لوگ ذرا دیر کے لیے سونے کو لیٹتے تو کلیم گندی گلی کی دیوار پر چڑھ کر درختوں پر چڑھ جاتا اور کچے پکے پھل توڑ لاتا اور ہم سب مل کر مزے سے کھاتے وہ ہم بچوں کو بار بار تنبیہ کرتا کہ امی ابا سے اس بات کی شکایت مت کرنا کہ میں ایسا کرتا ہوں اور ہمارا منہ بند رکھنے کی رشوت کے طور پر وہ ہم بچوں کو یہ پھل دے دیا کرتا تھا۔ اگر کبھی کم پھل ہاتھ لگتے تو وہ کسی کو پھل نہیں دیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے میرا حصہ نہیں دیا تو میں نے اس سے بدلہ لینے کا سوچا۔ اس روز دوپہر کو وہ حسب عادت گندی گلی کی دیوار (جو زیادہ اونچی نہیں ہوتی تھی) پر چڑھ کر درخت پر خوب اونچا چڑھ گیا تو میں نے شور مچایا اور آواز لگائی۔ ”دیکھیے ایک لڑکا آپ کے پیڑ پر چڑھ کر کیریاں توڑ رہا ہے۔“ کلیم نے میری آواز سنی اور اوپر سے ہی گندی گلی میں چھلانگ لگا دی۔ میں وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ مگر کلیم نیچے گر کر پھرتی سے اٹھا اور بھاگ کر مجھے پکڑ لیا اور میری خوب پٹائی لگائی۔ میں روتی ہوئی سیدھی کلیم کے گھر آئی اور سارا ماجرہ کہہ سنایا۔

اور ہمارے بڑوں کو ہماری حرکتوں کا پتا چل گیا کہ ہم دوپہر میں کیا کرتے ہیں۔ اس دور کے بچے بھی بچے ہی تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں ساتھ کھیلتے تھے۔ آج کے دور کے بچوں کی طرح نہیں جو نیٹ اور کیبل کی وجہ سے بچپن میں ہی جوان ہو جاتے ہیں۔

بہر حال میری امی کو بھی پتا چلا اور پھر دوپہر میں امی دروازہ لاک کر کے سو جایا کرتیں۔ یوں میرا دوپہر کو گھر سے نکلنا بند ہو گیا۔ شام کو البتہ خالہ کے گھر جا کر کھیلنے کی اجازت مل جاتی۔ کلیم سے میری بات چیت بالکل بند ہو گئی۔ کھیل کے دوران بھی وہ خالہ کی آنکھ بچا کر مجھے آنکھیں نکال کر مکا دکھا دیتا۔ کیوں کہ اس واقعے کے بعد ایک تو خالو نے اس کی پٹائی لگائی اور اس کے بھی دوپہر کو باہر نکلنے پر پابندی لگ گئی۔

وہ بچپن کا بہت خوش گوار اور سنہرا دور تھا۔ آج بھی ان دنوں کو یاد کرتی ہوں تو ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ ان ہی دنوں ایک ایسی بیڈ نیوز سننے کو ملی جس نے ہم سب بچوں کو بہت اداس کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خالہ نے بتایا کہ اسلم خالو کا تبادلہ نواب شاہ ہوگیا ہے۔ خالو پاکستان ریلوے میں ملازمت کرتے تھے۔ اس لیے سب لوگ یہاں سے جارہے تھے۔

اور میرا یہ حال تھا کہ میں آنکھیں کھولے حیرت سے ان کا منہ دیکھ رہی تھی پھر میری کھلی کھلی آنکھوں سے ڈھیروں آنسو بہہ نکلے اور میں نے بہ مشکل کہا۔

"کب آئیں گی.....؟"

"ارے میرا بچہ..... میری جان!" خالہ نے جھٹ مجھے پیار سے سینے سے لگایا اور بولیں۔

"جب تیرے خالو کے دفتر والے کہیں گے ہم تب ہی واپس آئیں گے۔ میں بھی تم سب کو بہت یاد کروں گی اور خاص طور پر تُو..... تُو تو مجھے بہت ہی یاد آئے گی۔ میری شہزادی جو ہوئی۔"

اور پھر خالہ کیا اس محلے سے گئیں ہمارے سارے کھیل ہی ختم ہوگئے گلی میں کھیلنے کی اجازت نہیں ملتی۔ بس صبح اسکول جاتے پھر گھر پہ ہی رہتے۔ کبھی کبھار ہم لڑکیاں اپنی گڑیا کی شادی کا کھیل گھر میں بیٹھ کر ہی کھیلتی رہتیں۔

وقت تیزی کے ساتھ گزرتا گیا۔ خالہ بھی ہمارے ذہنوں سے دور ہوگئیں۔ کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل..... جو دکھائی نہ دے اسے بھلا ہی دیا جاتا ہے۔ ہم چونکہ بچے تھے اس لیے بھی جلدی بھول گئے۔ خالہ کا گھر بند پڑا تھا۔ ان کے بعد اس گھر میں کوئی بھی رہنے کے لیے نہیں آیا۔

ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ ہم سب بچے کب بچپن کی حدود پھلانگ گئے۔ میری بڑی بہن کی شادی ہوگئی۔ اب گھر میں، میں ہی بڑی تھی۔ سارا گھر سنبھالتی اور پڑھائی بھی کرتی۔

ایک دن خالہ کے گھر کے برابر والے گھر میں رہنے والی شگفتہ میرے پاس آئی اور خوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔

"میں ایک بہت بڑی خوشی کی خبر لے کر آئی ہوں۔ بوجھوں تو ذرا۔"

"کیا بات ہے، بہت خوش لگ رہی ہو۔ کوئی رشتا وغیرہ تو نہیں آ گیا۔" میں نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"نہیں یار اس سے بھی بڑی خوش خبری ہے۔" اس نے بہ دستور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

"اب زیادہ سسپنس مت پھیلاؤ اور بتاؤ۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"خالہ آرہی ہیں۔" اس نے کہا۔

"خالہ! کون سی خالہ؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا کہ اس کی ایسی کون سی خالہ ہیں جن کے آنے پر یہ اتنا زیادہ خوش ہورہی ہے۔ کیوں کہ اس کی ایک ہی خالہ تھیں اور وہ عموماً آتی ہی رہتی تھیں۔

"بس بھول گئی۔ ارے پاگل برابر والی خالہ۔ کلیم کی امی..... نواب شاہ سے کراچی واپس آرہی ہیں۔ آج سلیم بھائی آئے ہیں۔ وہ گھر کھول کر ٹھیک ٹھاک کر رہے ہیں۔ بتا رہے تھے کہ ایک دو دن بعد سارے گھر والے بھی آجائیں گے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چلو یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" میں نے نارمل لہجے میں کہا۔ "مگر شگفتہ اب ہم بچے تھوڑی رہے ہیں۔ بڑے ہوگئے ہیں۔ سلیم بھائی بھی جوان ہوگئے ہوں گے اور اب ہم اس بے تکلفی اور بے باکی سے ان کے سامنے تھوڑی جاسکتے ہیں۔"

"ارے نہیں، وہ جوان تو ہوگئے ہیں مگر ان کا خلوص اور اپنائیت وہی پرانا والا ہے۔ ہمارے گھر ہی بیٹھے رہے اور اماں ابا سے باتیں کرتے رہے۔ اب دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے گھر گئے ہیں۔" شگفتہ نے کہا۔

"اچھا پہلے خالہ کو آجانے دو پھر جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"پتا ہے انہوں نے سب سے پہلے تیرے بارے میں پوچھا تھا۔ تو میں نے کہا کہ اب اگر آپ اسے دیکھیں گے تو آپ کی نگاہ اس کے اوپر سے ہٹے گی ہی نہیں۔ وہ تو بڑے غضب کی حسین ہے۔" شگفتہ نے کہا۔

"تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا تمہیں تو پتا ہے کہ میں پردہ کرتی ہوں۔ ان کے سامنے بھی نہیں جاؤں گی اور کسی بھی پردہ کرنے والی عورت یا لڑکی کے حسن کا ذکر غیر مرد کے آگے نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"چل چل زیادہ ملانی مت بن.....! بڑا کیا میں نہیں کرتی۔ مگر وہ ہمارے بچپن کے ساتھی ہیں۔" شگفتہ نے بے پروا لہجے میں کہا۔

پھر دو تین دن گزر گئے میں نے سلیم بھائی کو نہیں دیکھا۔ دو تین دن بعد گلی میں ایک ٹرک آیا اور خالہ کے گھر کے سامنے رک گیا اور اس سے سامان اترنے لگا۔ ساری گلی میں شور مچ گیا کہ اسلم صاحب نواب شاہ سے واپس آگئے۔

مزید دو دنوں کے بعد میں امی کے ساتھ خالہ سے ملنے کے لیے گئی۔ خالہ، منی باجی اسی محبت سے ملیں۔ اچانک ہی کمرے میں سلیم بھائی اور کلیم داخل ہوگئے۔ میں دو جوان لڑکوں کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی اور جھٹ دوپٹے سے چہرہ چھپانے لگی۔

"ارے پاگل یہ تو سلیم اور کلیم ہیں تو ان سے بھی پردہ کرے گی۔" خالہ نے زبردستی ہاتھ بڑھا کر میرا دوپٹا میرے چہرے سے ہٹا دیا۔ مجھے اتنی زیادہ شرم آرہی تھی کہ میری نگاہ ہی نہیں اٹھ رہی تھی۔

"ارے واہ یہ تو بڑی پیاری ہوگئی ہے۔" کلیم نے بے تکلفی سے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ تو سب ہنس پڑے۔

میری نگاہ سلیم بھائی کی جانب اٹھی تو وہ بڑی گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ پھر کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان دنوں میں بی اے فائنل میں تھی۔ مجھے گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی پر بھی دھیان دینا پڑتا تھا۔ اس لیے کہیں آنے جانے کا ٹائم نہیں ملتا تھا۔ البتہ شگفتہ کا گھر کیوں کہ ان کے برابر میں تھا۔ اس لیے وہ وہاں آتی جاتی رہتی تھی۔ ایک دن مجھ سے بولی۔

"تمہیں سلیم بھائی بہت پسند کرنے لگے ہیں.....!"

"فضول باتیں مت کرو، تمہیں پتا ہے مجھے اس قسم کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" میں نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

"لو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ مجھ سے تو سلیم بھائی نے یہ کہا تھا کہ تم سے کہہ دوں۔" اس نے کہا۔

"تو ان سے میری طرف سے کہہ دینا کہ وہ مجھے اچھے نہیں لگتے۔" میں نے کہہ کر بات ختم کردی اور شگفتہ میرا منہ دیکھتی رہ گئی۔

میں اس بات کو اچھی طرح سے سمجھتی اور جانتی تھی کہ جوان لڑکے اور لڑکی کے محبت کے یہ کھیل سوائے گناہ اور بدنامی کے کچھ نہیں، میں نے اپنی زندگی کے اتنے اہم فیصلے کا مکمل اختیار اپنے والدین کو سونپ رکھا تھا کہ وہ جس سے بھی چاہیں میرا رشتہ کردیں۔ مجھے قطعی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

اور پھر ایک سال بیت گیا۔ شگفتہ میرے پاس سلیم بھائی کے پیغام لاتی رہی اور میں مسترد کرتی رہی۔ ایک دن اتفاق سے خالہ کے گھر محفل میلاد تھی۔ میلاد کے بعد ناشتے اور چائے کا انتظام تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بھی منی باجی اور رشیدہ کے ہمراہ کچن میں ہاتھ بٹانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب میں نے وہاں سلیم بھائی کو منڈلاتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اچانک کچن میں آ کر کہا۔

"باجی آپ کو امی بلا رہی ہے۔"

منی باجی کچن سے چلی گئیں تو سلیم بھائی نے مجھ سے کہا۔

"کیا واقعی میں تمہیں بالکل بھی اچھا نہیں لگتا اگر ایسی بات ہے تو ایک بار اپنے منہ سے کہہ دو۔"

"جی ایسی ہی بات ہے۔" میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ "اور امید کرتی ہوں کہ آپ آئندہ شگفتہ سے میرے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔"

سلیم بھائی نے میری بات سنی اور تیزی سے کچن سے نکل گئے اور تب ہی منی باجی بڑبڑاتی ہوئی کچن میں آ گئیں کہ امی نے تو مجھے نہیں بلایا تھا۔ یہ سلیم بھی ناں بس ایسے ہی تنگ کرتا ہے۔

اور پھر کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ سلیم بھائی کو سعودی عرب میں جاب مل گئی ہے وہ جا رہے ہیں اور سلیم بھائی سعودی عرب چلے گئے۔ میں اس دن والے واقعے کے بعد بہت محتاط ہو گئی تھی اور خالہ کے گھر نہیں گئی۔ جب سلیم بھائی سعودی عرب چلے گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا اور ان کے گھر ملنے کے لیے گئی۔ کیوں کہ خالہ کی محبت ویسی ہی تھی۔ وہ آج بھی اسی محبت سے ملتی تھیں۔ انہیں دن رات ایک ہی ٹینشن تھی کہ منی کی عمر خاصی ہو گئی ہے اور اس کا کہیں رشتہ نہیں ہوا ہے۔ ویسے بھی زمانہ یہ آ گیا تھا کہ لوگ اپنے بیٹوں کی جانب تو دیکھتے نہیں ہیں مگر بہو کے نام پر حور پری تلاش کرتے ہیں اور منی باجی تو ویسے ہی کالے رنگ اور بھدے نقوش کی مالک تھیں۔ اوپر سے عمر بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

وقت مزید آگے سرک گیا۔ میں نے بی اے کر کے ایم اے میں ایڈمیشن لے لیا۔ میرے رشتے تو بہت آ رہے تھے مگر ابو امی نے ابھی تک کسی کے لیے ہاں نہیں کی تھی۔

سال بھر گزرنے کے بعد سلیم بھائی ایک ماہ کی چھٹی پر گھر آئے واپسی میں وہ اپنے ساتھ کافی چیزیں لے کر آئے۔ الیکٹرانک کا بہت سا ایسا سامان تھا جو ابھی تک خالہ کے گھر میں نہیں تھا۔ کلیم ابھی پڑھ رہا تھا۔ خالو ریٹائر ہو گئے تھے۔ ان کے گزشتہ حالات میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔

خالہ نے سارا سامان سارے محلے والوں کو خوشی خوشی دکھایا کہ یہ میرا سلیم لایا ہے۔ منی باجی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سلیم یہ سارا سامان میرے جہیز کے لیے لایا ہے۔"

اس ایک ماہ کے دوران جب تک سلیم بھائی یہاں رہے میں نے خالہ کے گھر جانے سے گریز کیا۔ مگر اب ایک بہت واضح تبدیلی خالہ اور ان کے گھر والوں کے رویے میں آئی اور سب نے ہی محسوس کی وہ یہ تھی کہ پہلے خالہ کے گھر کا دروازہ جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا اب بند رہنے لگا تھا اور خالہ نے بھی محلے میں آنا جانا کم کر دیا تھا۔ سلیم بھائی واپس سعودی عرب چلے گئے۔

پھر انہوں نے اپنا مکان جو دو کمروں پر مشتمل تھا تڑوا کر دوبارہ بنوانا شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں خالہ نے ڈبل منزلہ مکان بنوا لیا۔ بقول ان کے گلی میں سب سے شاندار گھر میرا ہی ہے۔

گھر میں ہر طرح کا تعیش کا سامان بھی آ گیا اور خالہ اور ان کے گھر والے سارے محلے والوں سے کٹ گئے۔ خالہ کی زبان جس پر سب کے لیے چاشنی سی گھلی رہتی تھی۔ اب بہت محتاط ہو کر رعونت بھرے لہجے میں بات کرتی تھیں۔ اس بات کو محسوس کر کے سب نے

ہی ان کے گھر جانا ختم کر دیا کہ دولت آنے کے بعد ان لوگوں کا اخلاق بھی ختم ہو گیا ہے۔

میں نے ایم اے فائنل کا اگزام دیا ہی تھا کہ میرے تایا اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آ گئے اور جھٹ پٹ میری شادی ہو گئی۔

میں اپنی لائف میں مصروف ہو گئی پھر جب بھی امی کے گھر آتی تو سارے محلے کی خبریں سنتی۔ مجھے پتا چلا کہ سلیم کی شادی ہو رہی ہے۔ خالہ نے حیدر آباد میں اپنے رشتہ داروں میں ان کا رشتہ طے کر دیا ہے۔

خالہ نے میرے گھر سلیم بھائی کی شادی کا کارڈ بھی نہیں بھیجا۔ اس لیے میں نے ان کی دلہن کو بھی نہیں دیکھا۔ سنا تھا پڑھی لکھی اور خوب صورت ہے اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔ خالہ نے بڑی دھوم دھام سے شادی کی تھی اور ولیمہ ایک بڑے ہوٹل میں کیا تھا۔

منی باجی ابھی تک گھر بیٹھی تھیں ان کا رشتہ کہیں نہیں ہوا تھا۔ میں بھی اپنے گھر اور بچوں میں مصروف ہو گئی۔ امی کے گھر بھی کم ہی آنا ہوتا تھا۔ کافی عرصہ تک مجھے خالہ کے گھر کے بارے میں بات کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

اب جو باتیں میں بتانے والی ہوں وہ رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوئیں۔ جنہیں قارئین کی دلچسپی کی خاطر میں تواتر کے ساتھ بیان کروں گی۔

سلیم بھائی سعودی عرب میں ہی تھے اور ان کی بیوی پاکستان میں اپنے سسرال میں رہتی تھیں۔ منی باجی کی کیوں کہ اچھی خاصی عمر ہو گئی تھی اور ان کی شادی نہیں ہوئی تھی شاید اسی لیے ان کے دل میں اپنی بھاوج کے لیے جیلسی پیدا ہو گئی۔ خاص طور پر جب سلیم بھائی کے ہاں پہلے بیٹے کی پیدائش ہوئی تب وہ پاکستان آئے بیوی اور بیٹے کے لیے بہت کچھ لے کر آئے۔ یہ ان لوگوں کو برداشت نہیں ہوا کہ پہلے تو سلیم کا سارا پیسا سارا پیار ساری چیزیں ہمارے لیے ہی ہوتی تھیں۔ اب اس میں سلیم کی بیوی رخسانہ بھی حصہ دار بن گئی ہے۔ وہ شوہر کی لائی ہوئی جیولری اور کپڑے روزانہ شوہر کو پہن کر دکھاتی۔ گھومنے پھرنے جاتی، پھر سلیم بھائی نے کہا کہ حیدر آباد میرے ساتھ چلو۔ کیوں کہ بچے کی پیدائش کے بعد جواب پانچ ماہ کا ہو چکا تھا رخسانہ بھابی اپنے میکے نہیں گئی تھیں۔ رخسانہ بھابی نے اپنے گھر والوں سے یہی کہا تھا کہ سلیم پاکستان آئیں گے تو ان کے ساتھ ہی آؤں گی۔

بنیادی طور پر وہ بہت شریف لوگ تھے۔ بچے کی پیدائش پر وہ لوگ کراچی آئے تھے تب بھی خالہ وغیرہ نے ان لوگوں سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی اور باتوں باتوں میں یہ بھی جتا دیا تھا کہ ہمیں وہ لوگ بالکل پسند نہیں ہیں جو کسی بھی بہانے سے بہن بیٹی کے سسرال میں آ کر رہیں۔ خالہ کے منہ سے یہ سن کر وہ لوگ فوراً ہی واپس چلے گئے۔ خالہ نے رخسانہ بھابی کو بھی میکے جانے نہیں دیا۔

خالہ اور منی باجی بچے سے کھیلتے رہتے رات کو اسے اپنے پاس ہی سلاتے اور سارا گھر رخسانہ بھابی ہی سنبھالتیں۔ حالانکہ خالہ کے پاس اتنا پیسا تھا کہ وہ ایک جز وقتی ملازمہ با آسانی رکھ سکتی تھیں، مگر ان کا کہنا یہ تھا کہ "بہو کی صورت چاٹیں یا اسے دیوی بنا کر مچان پر بٹھا دیں۔ گھر تو اسے ہی سنبھالنا ہے۔ رہی بات بیٹیوں کی تو انہیں تو دوسرے گھر جانا ہے۔ وہ تو یہاں چند دنوں کی مہمان ہیں۔"

سلیم بھائی ایک ماہ بعد واپس سعودی عرب چلے گئے اور جاتے جاتے بھابی کی کوکھ میں دوسرا بچہ دے گئے۔

ایسی حالت میں بھی بھابی سارا دن گھر کا کام کرتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہتیں۔ ان کی خوراک کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ لازمی بات ہے کہ وہ بہت کمزور ہوگئیں۔ حالانکہ جس کمائی پر خالہ اور ان کے گھر والے عیش کر رہے تھے وہ سارا پیسا سلیم بھائی ہی کا تھا اور اس پیسے پر سارا کنٹرول خالہ ہی کا تھا۔

دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو حیدرآباد سے ان کے بھائی کا فون آیا کہ وہ رخسانہ کو لینے کے لیے آرہے ہیں۔ بھابی سوا مہینہ نہا چکی تھیں خالہ نے کہا کہ اپنے بھائی کو بلالو۔ بھابی بہت خوش بھی تھیں اور حیران بھی کہ امی انہیں بھیجنے پر راضی کیسے ہوگئیں۔

اور جب ان کے بھائی آئے تو خالہ نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم رخسانہ کو لینے آئے ہو ناں تو شوق سے اسے اپنے ساتھ لے جاؤ‘ مگر میرے بچے میرے پاس ہی رہیں گے۔“ ان کا اشارہ رخسانہ بھابی کے بچوں اور اپنے پوتوں کی جانب تھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ کیا مطلب ہے آپ کی اس بات کا کہ بچے آپ کے پاس رہیں گے۔ وہ دونوں ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ رخسانہ کے بغیر کیسے رہیں گے اور خود رخسانہ ان دونوں کے بغیر کیسے رہے گی۔“ رخسانہ بھابی کے بھائی نے چونک کر کہا۔

”بھئی صاف بات ہے ہم سب ان بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میکے میں جا کر رخسانہ تو تم سب میں مگن ہو جائے گی اور اگر اس کی بے پروائی سے میرے بچوں کو کچھ ہوگیا تو؟ اس لیے میں بچوں کو رخسانہ کے ساتھ بھیجنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔“ خالہ نے صاف صاف کہہ دیا۔

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ہمارے گھر میں اور بھی بچے ہیں اور ہمیں بچوں کا خیال رکھنا آتا ہے۔“ رخسانہ بھابی کے بھائی نے کہا۔

”تم اپنے بچوں کا خیال رکھو گے ناں.....! بھئی دوسرے کی اولاد سے تمہیں کیا دلچسپی میں منع تھوڑی کر رہی ہوں رخسانہ کو۔ تمہاری بہن ہے جتنے دن چاہے میکے میں رہے مگر میرے بچے اپنی دادی دادا کے پاس رہیں گے۔“ خالہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے بھائی آپ جائیں امی بچوں کو میرے ساتھ بھیج نہیں رہیں اور میں بچوں کے بغیر جاؤں گی نہیں۔“

رخسانہ بھابی نے اپنے بھائی کو یہ سوچ کر منع کیا کہ شاید خالہ کو کوئی خیال آجائے مگر وہ تو رخسانہ بھابی کا جواب سن کر خوش ہوگئیں اور ان کے بھائی بنا بہن اور بھانجوں کو لیے حیدرآباد چلے گئے۔

سال بھر کی چھٹیوں پر سلیم بھائی پاکستان آتے ہی تھے مگر اس مرتبہ جب چھٹی ملنے کا ٹائم آیا تو خالہ اور خالو نے کہا کہ تم اس مرتبہ پاکستان مت آؤ اور ہمیں عمرے پر بلوالو۔

اور سلیم بھائی نے ایسا ہی کیا وہ پاکستان نہیں آئے اور اپنے والدین کو عمرہ ادا کرنے کے لیے بلوالیا۔ جاتے جاتے وہ رخسانہ بھابی کو تنبیہ کر کے گئیں کہ میرے بعد گھر کا خیال رکھنا یہ نہ ہو کہ میری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر بچوں کو لے کر ماں کے گھر چل دینا۔

رخسانہ بھابی نے خالہ خالو کی غیر موجودگی میں گھر کا خیال رکھا۔ ایک ماہ بعد وہ لوگ واپس آگئے۔ رخسانہ بھابی شوہر سے ملنے کی آس میں مزید ایک سال انتظار کرنے لگیں۔ سلیم بھائی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ رخسانہ بھابی اتنے عرصے سے میکے نہیں گئی ہیں۔ کیوں کہ نہ تو وہ تنہائی میں شوہر سے فون پر بات کر سکتی تھیں اور نہ ہی ان کے نام کوئی علیحدہ خط آتا تھا۔ سلیم بھائی اپنے والدین کے نام خط لکھتے تھے اور اسی خط میں سب کو مخاطب کر لیتے تھے۔

دو سال کے بعد سلیم بھائی پاکستان آئے تب ایک رات چپکے سے رخسانہ بھابی نے انہیں بتایا کہ وہ کافی عرصہ سے حیدرآباد نہیں گئیں ہیں۔ انہوں نے کہا۔ ”آپ مجھے حیدرآباد لے چلیں اور امی اور بھائیوں سے بھی مل لیجیے گا۔“ سلیم بھائی نے کہا کہ پروگرام بناتے ہیں۔ انہوں نے اپنی امی کو بتایا کہ وہ رخسانہ بھابھی کے ساتھ حیدرآباد جا رہے ہیں اس پر خالہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر جب چلنے کا وقت آیا تو خالہ نے بچوں کو ساتھ بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے سلیم بھائی سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں ان بچوں کے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی۔ اگر تم میری موت چاہتے ہو تو اپنے بچوں کو لے جاؤ۔ تمہاری اولاد ہے میرا زور تھوڑی ہے۔“

سلیم بھائی نے رخسانہ بھابی کو سمجھایا کہ چلو ہم دونوں اکیلے ہو آتے ہیں مگر رخسانہ بھابی نے صاف انکار کر دیا۔ وہ دو سالوں سے نہ تو اپنے میکے گئی تھیں اور نہ ہی وہاں سے کوئی آیا تھا۔ کبھی کبھار فون پر بات ہوتی تھی مگر سب کے درمیان میں بیٹھ کر۔

اس مرتبہ بھی جب سلیم بھائی واپس گئے تو رخسانہ بھابی تیسرے بچے کی ماں بننے والی تھیں اور پھر اسی طرح پورے چھ سال بیت گئے۔ رخسانہ بھابی کے چار بیٹے ہوگئے۔ منی باجی کی عمر خاصی ہوگئی تھی۔ ہم جو ان کے سامنے کے بچے تھے ہمارے بچے بھی بڑے ہو رہے تھے۔ کلیم بھی اپنی تعلیم مکمل کر کے جاب کر رہا تھا اور اس نے خود اپنے منہ سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ امی نے سلیم بھائی کی شادی تو کر دی ہے مگر اس کی شادی وہ اس وقت تک نہیں کریں گی جب تک منی باجی کی شادی نہیں ہوگی اور منی باجی کی شادی ہونا تقریباً ناممکن ہے۔

ادھر خالہ نے ایک ترکیب سوچی اور رشتے کروانے والی ایک عورت سے کہا ہم ادلے بدلے میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی میرے لیے ایسی بہو تلاش کرو جس کا بڑا بھائی ہو اور وہ میری بیٹی کو بیاہ لے۔

کچھ ہی دنوں میں وہ عورت ایک ایسے گھر کا رشتہ لے کر آئی جن کی لڑکی منی باجی کی طرح گھر بیٹھی تھی اور جس کی عمر بھی زیادہ تھی۔ شکل وصورت میں بھی وہ منی باجی کی طرح ہی تھی۔ البتہ اس کا بھائی کلیم کے مقابلے میں شکل وصورت میں اور تعلیم اور جاب میں اچھا تھا۔

دونوں کے بھائیوں نے اپنی اپنی بہنوں کے لیے قربانی دی اور وٹے سٹے کے رشتے کو قبول کر لیا۔ خالہ بہت زیادہ خوش تھیں کہ ان کی بیٹی کا گھر بس رہا ہے۔

شادی بخیر وخوبی انجام پائی۔ جس گھر میں منی باجی اور کلیم کا رشتہ ہوا تھا وہ ایک شریف خاندان تھا اور کلیم کی بیوی عائشہ بھی ایک نیک‘ کم گو اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔

منی باجی کے شوہر گاہے بگاہے اپنے سسرال آتے رہتے تھے۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ رخسانہ بھابی بہت خاموش اور اداس اداس رہتی ہیں۔ وہ زیادہ کسی سے بات چیت بھی نہیں کرتیں بس گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہیں۔ اتنا پیسا ہونے کے باوجود گھر میں اوپر کے کاموں کے لیے کوئی ماسی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ منی باجی کی چھوٹی بہن رعنا بھی پچیس سال کی تھی اور سارا دن گھر پر بس ٹی وی یا وی سی آر پر بھارتی فلمیں دیکھتی رہتی ہے۔ گھر کے کاموں میں بھابی کا ہاتھ نہیں بٹاتی۔ انہوں نے یہ بات منی باجی سے کی تو انہوں نے بڑے لاڈ سے کہا۔ ”رعنا ابھی چھوٹی ہے وہ کیوں کام کرے۔ رخسانہ ہے ناں کام کرنے کے لیے۔ بہو ہوتی اور کس کام کے لیے ہے۔“ منی باجی کے شوہر ریحان نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ رخسانہ بھابی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کبھی اپنے میکے نہیں جاتیں اور نہ ہی ان کے میکے سے کوئی ان سے ملنے کے لیے آتا ہے اور جب یہ بات انہوں نے منی باجی سے پوچھی تو وہ یہ کہہ کر بات کو ٹال گئیں کہ ہمیں کیا پتا کہ وہ میکے کیوں نہیں جاتیں۔ خود ان کا دل ہی نہیں چاہتا ہوگا ہم پابندی تھوڑی لگاتے ہیں۔

منی باجی کی شادی کو سال بیت گیا اور اللہ نے دونوں بہن بھائیوں کو ایک ایک بیٹی سے نوازا' خالہ منی باجی کو اسپتال سے سیدھے اپنے گھر لے گئیں اور اپنی بہو کو ان کے میکے بھجوادیا۔ منی باجی کی دن رات کی خدمت رخسانہ بھابی کے ذمے تھی۔ اس دوران بھی ریحان بھائی گھر آتے رہتے تھے۔ ان کی بیوی اور بچی جو یہاں تھی۔

ایک دن ریحان بھائی گھر آئے تو معلوم ہوا کہ خالہ منی باجی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ رعنا بھی گھر پر نہیں تھی۔ اس لیے لامحالہ رخسانہ بھابی ریحان کو چائے دے کر ان کے پاس باتیں کرنے بیٹھ گئیں۔ تب موقع سے فائدہ اٹھا کر ریحان بھائی نے رخسانہ بھابی سے بات چھیڑ دی اور کہا کہ سچ بتایئے کہ آپ اپنے میکے حیدرآباد کیوں نہیں جاتیں اور آپ کے گھر سے کوئی یہاں نہیں آتا۔ تب بھابی نے انہیں ساری بات سچ سچ بتادی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ امی ابا نے سلیم کے پاکستان ہر سال آنے پر بھی پابندی لگادی ہے کہ اس طرح کرائے میں پیسا خرچ ہوتا ہے۔ ابھی دو بہن بھائی کی شادی ہوئی ہے۔ رعنا ابھی باقی ہے اس لیے تین سال ہوگئے ہیں سلیم بھی پاکستان نہیں آئے ہیں۔ میرے میکے سے کوئی اس لیے نہیں آتا کہ امی کو برا لگتا ہے۔"

ریحان بھائی کو یہ سب باتیں سن کر بے حد افسوس اور دکھ ہوا۔ اپنی ساس کی چالاکیاں تو وہ دیکھ ہی رہے تھے کہنے لگے۔

"بھابی آپ فکر نہ کریں میرے پاس ایک ترکیب ہے میں ان لوگوں کو سیدھا کردوں گا۔"

رخسانہ بھابی یہ سن کر گھبرا گئیں اور اپنے ہاتھوں کو ریحان بھائی کے آگے جوڑتے ہوئے بولیں۔

"نہیں' نہیں ریحان بھائی آپ کو اللہ کا واسطہ آپ امی سے کچھ نہیں کہیے گا۔ اگر انہیں اس بات کا پتا چل گیا تو وہ اور بھی پتا نہیں میرا کیا حشر کریں گی۔"

"ارے بھابی آپ بالکل بھی فکر نہ کریں۔ آپ کی جانب تو ان کا دھیان ہی نہیں جائے گا۔ میں بھی ان کی ترکیب ان ہی کے اوپر آزماؤں گا۔ پھر یہ لوگ خود ہی سدھر جائیں گے۔"

عائشہ اور رخسانہ بھابھی میں بہت انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ دونوں اپنے دکھ سکھ ایک دوسرے کو سنادیا کرتی تھیں۔

ادھر گھر جا کر ریحان بھائی نے وہ ساری باتیں اپنی امی اور بہن عائشہ کو اعتماد میں لے کر بتادیں اور عائشہ سے یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں کہ میں جو کچھ کرنے والا ہوں اس کے بعد تمہاری ساس کا رویہ تمہارے ساتھ خراب ہوگا مگر تم تھوڑا برداشت سے کام لینا۔ اگر تمہاری تھوڑی سے تکلیف اٹھانے سے کسی کا بھلا ہو رہا ہے تو یہ تکلیف برداشت کرلو۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔"

عائشہ تو ویسے بھی رخسانہ بھابی کا حشر دیکھتی ہی تھی۔ اس نے بھی اپنے بھائی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا اور گھر آکر ساری بات رخسانہ بھابی کو بھی بتادی۔

سوا مہینے کے بعد منی باجی اپنے سسرال اور عائشہ اپنے سسرال آگئی۔ ریحان بھائی کے ہی کہنے پر ان کی امی نے منی باجی کی بچی کو اپنے پاس رکھ لیا اور گھر کے سارے کاموں کی ذمہ داری منی باجی کی لگادی اور

گھر میں کام کرنے والی ماسی کو بھی نکال دیا۔

منی باجی نے اس پر شور مچایا تو ان کی امی نے انہیں وہی جواب دیا جو خالہ نے رخسانہ بھابی کو دیا تھا۔ وہ کہنے لگیں۔

"بی بی! ہم نے تمہارے بہت ناز اٹھالیے۔ ایک بچہ بھی ہوگیا۔ اب کب تک رانی بنی بیٹھی رہوگی۔ بہتر یہی ہے کہ تم گھر کے کام سنبھالو اور بچی کو میں سنبھالوں گی۔"

منی باجی نے اپنے دل میں سوچا کہ کوئی بات نہیں ان کی بہن بھی تو میرے گھر میں ہے میں گھر جا کے امی کو ساری بات بتاؤں گی کہ وہ عائشہ کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں جو یہاں میرے ساتھ ہو رہا ہے۔" منی باجی جب اپنے گھر جانے لگیں تو ان کی ساس نے کہا۔ "تم اکیلی جاؤ' اپنی پوتی کو میں تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گی۔"

منی باجی ساس کی بات سن کر بری طرح چونک گئیں اور کچھ سوچنے لگیں۔ پھر بولیں۔ "میں اپنی بچی کے بغیر نہیں جاؤں گی۔"

"نہیں جاؤ گی تو مت جاؤ۔ میں نے تمہیں نہیں روکا ہے۔ مگر میں اپنی پوتی کو ایک منٹ بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔"

منی باجی اپنے گھر نہیں گئیں اور منہ پھلالیا۔ رات کو جب ریحان بھائی گھر آئے تو انہوں نے اپنی ساس کی شکایت اپنے شوہر سے کی تو وہ ہنس کر بولے۔

"ارے تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے تم بھول گئیں تمہارے گھر کا تو طریقہ ہی یہی ہے۔"

"کیا مطلب ہے اس بات کا.....! آپ سے یہ سب کس نے کہا؟ کیا رخسانہ نے.....؟" منی باجی نے شک بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے وہ بچاری اللہ میاں کی گائے ہیں۔ وہ کہاں کسی سے کچھ کہتی ہیں' مگر محترمہ ہم بھی تو دو آنکھیں اور عقل رکھتے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔"

منی باجی دوسرے دن تنہا ہی اپنی امی کے گھر گئیں۔ خالہ انہیں بچی کے بغیر دیکھ کر حیران رہ گئیں اور پوچھا کہ میری گڑیا کہاں ہے؟"

منی باجی نے رو رو کر ساری داستان ظلم سنادی۔ تو خالہ تپ کر بولیں۔

"تو کیوں فکر کرتی ہے' تیرا بدلہ لینے کے لیے عائشہ ہے ناں میرے پاس میں تو اس کا اس لیے خیال رکھتی تھی کہ تو اس کے بھائی کے گھر میں ہے۔ اگر تیرے ساتھ وہاں اچھا سلوک نہیں ہوگا تو اس کے

میرا ہاتھ

میرا ہاتھ
مجھے کہتا ہے
جب بھی
میں بھول کے
ملاتی ہوں
تیرے سوا.....
کسی اور سے
میرا ہاتھ
مجھے کہتا ہے
یاد آتا ہے
مجھے وہ تیرا ساتھ
وہ ملاقات
وہ برسات کی رات
وہ لمحہ جب تم نے
تھام کے میرا ہاتھ
چوم کے کہا تھا
جئیں گے ایک ساتھ
مریں گے ایک ساتھ
مجھے ہی کہتا ہے
میرا ہی ہاتھ

(اللہ دتہ عابد..... محمد پور سنساراں)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ بھی میں وہی کچھ کروں گی۔"

پھر جب عائشہ اپنے میکے جانے لگی تو خالہ نے اسے بھی بچی کو لے جانے نہیں دیا۔ عائشہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور گھر آ گئی۔

یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہا۔ عائشہ تو مزے سے گھر آ جاتی تھی۔ کیوں کہ رخسانہ بھابھی اس کی بچی کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ مگر منی باجی کو یہ سوچ کر قرار نہیں آتا تھا کہ میں گھر میں نہیں ہوں تو امی گھر کے کاموں میں لگ جاتی ہیں اور میری بچی رو رو کر ہلکان ہو جاتی ہے۔ اس لیے انہوں نے میکے آنا چھوڑ دیا۔

اب خالہ دن رات بے چین رہنے لگیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ عائشہ سے یہ کہہ نہیں سکتیں تھیں کہ تم اپنے ساتھ اپنی بچی کو بھی لے جاؤ' کیوں کہ رخسانہ بھابی کو ابھی تک انہوں نے روک رکھا تھا۔

ریحان بھائی نے ایک کام اور کیا اور وہ یہ کہ انہوں نے سلیم بھائی کو سعودی عرب فون کیا اور سارے حالات بتانے کے بعد گزارش کی کہ وہ پاکستان آئیں اور یہاں کے حالات سنواریں۔ کیوں کہ ابا کو تو وہ دیکھ ہی رہے تھے کہ ابا وہی کہتے اور سنتے ہیں جو امی کہتی ہیں۔

سلیم بھائی کو ساڑھے تین سال ہو چکے تھے وہ خود بھی بیوی اور بچوں کے لیے بہت بے چین تھے۔ اب جب ریحان بھائی نے یہ حالات بتائے تو ان کا ایک دن بھی دل نہیں لگا۔ انہوں نے سوچا کہ میں اب تک اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے لیے ہی سب کچھ کرتا تھا۔ بیوی کو کیا دیا' سوائے اس کے کہ ایک ماہ کے لیے اس کے پاس جاتا اور ایک بچے کا تحفہ دے کر آ جاتا۔ وہ کن حالوں میں جی رہی ہے کیا سوچتی ہے میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔

انہوں نے وہاں اتنے عرصے میں کافی پیسا جمع کر لیا تھا۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ یہاں سے جاب چھوڑ کر پاکستان میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بقیہ زندگی گزاروں گا۔ آمدنی کم بھی ہو گی تو کیا ہوا' بیوی بچے تو پاس رہیں گے۔ ان کی جاب ایسی تھی کہ وہ بیوی بچوں کو اپنے پاس سعودی عرب بلا نہیں سکتے تھے اور پھر اس طرح دو دو گھروں کا خرچ چلاتے تو بچت ایک پائی کی بھی نہیں ہوتی۔

وہ بغیر اطلاع کے جاب چھوڑ کر ایک دن اچانک پاکستان آ گئے۔ گھر میں داخل ہوئے تو رخسانہ بھابی کو میلے اور گندے حلیے میں جھاڑو سنبھالے ہوئے دیکھا ایک منٹ کو تو وہ انہیں پہچان ہی نہ سکے۔ کہاں تو وہ اتنی خوب صورت بیوی کو چھوڑ کر گئے تھے اور کہاں یہ انتہائی کمزور اور لاغر عورت' جس کا گورا رنگ جھلس کر سانولا ہو گیا تھا۔ خوب صورت آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔

"رخسانہ.....!" انہوں نے شاکڈ لہجے میں ان کا نام پکارا اور رخسانہ بھابی نے جیسے ہی انہیں دیکھا تو جیسے ان کے ضبط کے سارے بندھن ایک ساتھ ہی ٹوٹ گئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں کھڑی دیکھتی رہیں۔ پھر ان پھٹی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور جیسے ہی سلیم بھائی ان کی جانب بڑھے وہ بے ہوش ہو کر ان کے بازوؤں میں جھول گئیں۔

ڈاکٹر نے ان کے چیک اپ کے بعد بتایا کہ وہ شدید جسمانی کمزوری کا شکار ہیں۔

گھر آ کے سلیم بھائی نے اپنے امی ابا کو بٹھا کر بات کی۔ بات کیا کی شکایت کی کہ انہوں نے ان کی بیوی کا کیا حال کر دیا ہے۔

خالہ حیران تھیں کہ سلیم کو یہ ساری باتیں کس نے بتائیں۔ وہ یہی سمجھیں کہ کسی ذریعے سے رخسانہ ہی

نے یہ باتیں سلیم تک پہنچائی ہیں اس لیے بولیں۔

"بیٹا تم سے رخسانہ نے جھوٹ بولا ہے' ایسی کوئی بات نہیں۔"

"امی رخسانہ سے تو میری ابھی تک کوئی بات ہوئی ہی نہیں ہے۔ وہ تو کمرے میں سو رہی ہے۔ ڈاکٹر نے اسے نیند کا انجکشن دیا ہے۔ آپ کو ابھی تک اندازہ نہیں ہوا کہ رخسانہ کے اور اس کے ماں باپ کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ منی باجی سے پوچھیں کیا وہ اپنے گھر میں خوش ہیں۔ کیا منی باجی کے اس دکھ کو لے کر آپ اور ابا خوش ہیں نہیں ناں.....! تو پھر آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ اس کام کا کیا فائدہ جس سے دکھی ہوں۔ امی ساری خوشیاں ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہیں۔ ہم تو خود اپنے برے طرز عمل اور خراب رویے سے دوسروں کو بھی دکھ دیتے ہیں اور خود بھی خوشیوں سے محروم رہتے ہیں۔"

خالہ اور خالو بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ اسی وقت ریحان بھائی آ گئے اور انہوں نے بھی اس گفتگو میں حصہ لے لیا اور بولے۔

"سلیم کو یہاں میں نے ہی سارے حالات بتا کر بلوایا ہے۔ مجھ سے رخسانہ بھابی کی حالت نہیں دیکھی جاتی تھی اور امی کو بھی میں نے ہی منع کیا تھا کہ سائرہ (منی باجی) کے ساتھ وہی سلوک کریں تاکہ آپ کو اپنی ان زیادتیوں کا احساس ہو جو آپ رخسانہ بھابی کے ساتھ کرتی رہی ہیں۔"

داماد کے منہ سے یہ سب سن کر خالہ بہت شرمندہ ہوئیں اور رونے لگیں پھر بولیں۔

"ہاں میں اقرار کرتی ہوں کہ میں نے یہ سب کیا ہے' میرا اللہ مجھے معاف کرے اور میرے بچوں تم لوگ بھی مجھے معاف کر دو۔ میں رخسانہ اور بچوں کو لے کر خود حیدر آباد جاؤں گی اور اس کے ماں باپ سے معافی مانگوں گی۔

اور پھر ایک ہفتے کے بعد خالہ رخسانہ بھابی سلیم بھائی اور بچے حیدر آباد گئے اور دو تین دن کے بعد تو خالہ اور سلیم بھائی واپس آ گئے۔ رخسانہ بھابی پندرہ دن رہنے کے بعد واپس آئیں۔

سلیم بھائی نے یہاں اپنا بزنس شروع کر دیا۔ رعنا کی عمر بڑھتی جا رہی تھی اس لیے اتفاق سے ان ہی خاتون نے جنہوں نے منی باجی کا رشتا لگایا تھا رعنا کا رشتا لے کر آ گئیں۔ وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور دونوں بچوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ خالہ نے اس رشتے پر اعتراض کیا مگر سلیم بھائی اور کلیم نے کہا۔ "اس سے اچھا رشتا نہیں مل سکتا۔" اس لیے رعنا کی بھی شادی کر دی۔

خالو کا انتقال ہو چکا ہے' خالہ اب بہت بوڑھی ہو چکی ہیں۔ مگر اب وہ اپنی دونوں بہوؤں سے بہت خوش ہیں اس لیے کہ دونوں ان کی بہت خدمت کرتی ہیں۔ سب کے بچے جوان ہو چکے ہیں۔ سلیم بھائی نے اپنے بڑے بیٹے کی منگنی منی باجی کی بیٹی سے کر دی ہے۔

آج یہ گھرانہ ایک خوش حال اور آسودہ زندگی گزار رہا ہے۔ اس روز اگر خالہ فوراً ہی اپنی غلطی بلکہ گناہ کہنا چاہیے اس کا اعتراف کر کے اس کا مداوا نہ کرتیں تو سب کچھ تنکوں کی طرح بکھر جاتا۔ ریحان بھائی کی عقل مندی نے ایک گھرانے کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔

آج اگر ہم ناخوش ہیں تو سب سے پہلے اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے کہ کہیں ہم تو غلطی پر نہیں ہیں.....؟؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کینہ پرور

محترم عمران احمد قریشی،
السّلام علیکم!
ایک طویل وقفہ کے بعد ایک سچی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ ہمارے معاشرے میں آج کل خواتین کے حقوق اور آزادی کی باتیں بڑے زور و شور سے کی جاتی ہیں، مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو عورت ہی عورت کے حقوق غصب کرتی ہے۔ وہ خود ہی رشتوں کا تقدس پامال کرتی ہے۔ اگر وہ خود ایک دوسرے کا احترام کریں تو بہت سے مسائل از خود حل ہوجائیں۔

والسّلام
قمر جہاں
حیدر آباد

''دو پیسے کی ہانڈی پھوٹی، کتے کی ذات پہچانی گئی۔'' رضیہ بیگم تو اب شروع ہوچکی تھیں اور ان کو چپ کروانے والا اس گھر تو کیا اس روئے زمین پر کوئی نہیں تھا۔ بس اللہ ہی آ کر خاموش کراتا، تو کراتا۔ وہ مسلسل حنا اور اس کے خاندان کی شان میں رطب اللسان تھیں۔ ''کم ذات، بدذات تو نے کیا کبھی کھانا نہیں دیکھا جو اس طرح ٹوٹ کر کھانے پر پڑی ہے۔''

''مگر امی میں نے تو.....'' حنا نے فریاد کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ رضیہ بیگم پھر گرجیں اور اس کا منہ کھلے کا کھلا، داہنا ہاتھ سالن کی پلیٹ میں نوالہ پکڑے اور دوسرے ہاتھ میں روٹی دبی ہوئی، وہ بت بن گئی اور اب رضیہ بیگم نہ صرف اس کو بلکہ اس کے سارے خاندان کو رگید رہی تھیں۔ حتی المقدور آڈیو کے ساتھ ساتھ ویڈیو بھی طرح طرح کی شکلیں بنا بنا کر اور منہ بگاڑ بگاڑ کر نشر کر رہی تھیں۔ ان کی چیخ پکار سن کر دھڑا دھڑ دروازے کھلے اور عین تین بجے کے ٹائم چلچلاتی دوپہر میں گھر کے مرد اور عورتیں ان کے ارد گرد صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے کھڑے تھے۔

''ارے آخر ماجرا کیا ہے؟ اب کیا کیا ہے اس کم بخت نے جو آپ نے پورے گھر کو حیران پریشان کر کے ان کا چین سکون لوٹ لیا ہے۔'' خالد بھائی تو انگارہ بنے ہوئے تھے۔ مزید آتش فشاں بنے رضیہ بیگم سے بدتمیزی سے بولے۔ ایک وہی تو پورے گھر میں اس کا دکھ سمجھتے تھے اور گاہے بگاہے اسے حوصلہ اور تسلی بھی دیتے تھے۔

''ارے اب جبکہ میں سب کو دے دلا چکی تو فوراً دبے پاؤں کچن میں جا کر بوٹیاں ہڑپ کر رہی ہے، فقیرنی کی اولاد جبکہ صبح بھی کافی کچھ ٹھونس چکی ہے۔'' انہوں نے صریح جھوٹ بولتے ہوئے کہا اور تقریباً بھاگتے ہوئے جا کر حنا کے ہاتھ سے روٹی چھین، سالن کی پلیٹ جھٹکے سے لے کر اسے اس زور سے دھکا دیا کہ وہ کھڑے قد سے کچن سے باہر جا گری۔ گرتے ہوئے برآمدے کے ستون سے سر ٹکرایا پھر قریب پڑے رضیہ بیگم کے تخت کے کونے سے ٹکرا کر اس کی پیشانی بھی لہولہان ہوچکی تھی۔ حنا کی پُردرد چیخ سن کر لان میں کام کرتی ہوئی ماسی حاجرہ تقریباً بھاگتی ہوئی اندر آئی جبکہ قریب کھڑے افراد کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ ماسی حاجرہ حنا کو بے سدھ اور خون کو بہتے دیکھ کر متوحش ہوگئی۔ وہ دراصل حنا کے انتظار میں تھی جس کو اس کے ساتھ لان

کی صفائی میں ہاتھ بٹانے کا حکم دے کر رضیہ بیگم تخت پر لیٹ چکی تھیں۔ کام کے دوران پیٹ کی انتھن سے نڈھال ہو کر ماسی حاجرہ کے مشورہ پر اپنی بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر تھوڑا سا کھانا لے کر کھانے ہی لگی تھی کہ پتیلی کا ڈھکن گرنے کی آواز سن کر رضیہ بیگم اٹھ گئی تھیں اور انہوں نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔

درحقیقت حنا گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے بھوکی تھی۔ کل رضیہ بیگم کے کمرے میں بیڈ جھاڑتے ہوئے اس سے سائیڈ ٹیبل پر رکھا گلاس گر کر ٹوٹ گیا تھا تو اسے بھوکا رہنے کا الٹی میٹم مل گیا تھا۔ وہ جب حاجرہ کے ساتھ لان میں کام کر رہی تھی تو اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ کیونکہ کل صبح بھی اس نے صرف دو سلائس اور ایک کپ چائے پی تھی۔ اس کو پیٹ بھر کر کھانے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ جس وقت رضیہ بیگم اس کو گلاس ٹوٹنے پر صلواتیں سنا رہی تھیں تو حاجرہ بھی کمرے میں موجود تھی جو ان سے چھٹی لینے آئی تھی اور انہوں نے اس کو لان کی صفائی کا حکم دیا تھا کیونکہ کل انہوں نے اپنے کچھ مہمانوں کو بلایا تھا۔ اسی وقت رضیہ بیگم نے ماسی حاجرہ کے سامنے حنا کو بھوکا رہنے اور لان کی صفائی میں اس کی معاونت کی سزا سنائی تھی۔ یوں وہ سارے قصے سے واقف تھی۔

ماجد اور واجد بھائی کی بیویاں تو ''ہونہہ'' کہہ کر اپنے اپنے کمروں میں پلٹ گئیں جبکہ خالد بھائی وہیں کھڑے انہیں گھور رہے تھے۔ حاجرہ روتے روتے ساری بات بتاتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی اپنا دوپٹہ پھاڑ کر حنا کی پیشانی پر باندھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ نمرہ اور ثمرہ نے جو اتنا خون دیکھا تو وہ بھی پریشان ہوگئیں دونوں بہنیں بھی گو کہ اس کو پسند نہیں کرتی تھیں مگر کبھی کبھار اپنے مطلب کے لیے ہی سہی اس سے رخ ملا کر بات کر لیا کرتی تھیں۔ خون تھا کہ رُک نہیں رہا تھا اور وہ خود تھی کہ بے سدھ، بے ہوش، تب ہی خالد بھائی جیسے نیند سے جاگے۔ فوراً انہوں نے اپنے کمرے کا رخ کیا اور والٹ لے کر سیدھا باہر آئے اور نمرہ، ثمرہ کو حنا کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے کا کہا مگر دونوں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے خود ہی حاجرہ کی مدد سے اسے اٹھایا، گاڑی میں ڈال کر فوراً تیزی سے ڈاکٹر کاشف کے کلینک کی طرف چل پڑے۔ ڈاکٹر کاشف ان کا قریبی دوست تھا۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھ سکتا تھا۔ پوچھا تو صرف اتنا کہ ''یہ سب کیسے ہوا؟'' مگر ان کے جواب نہ دینے پر چپ ہوگیا کیونکہ ان سے کوئی جواب نہ بن سکا۔ ڈاکٹر کاشف نے خالد بھائی کے سامنے ہی خود زخم کی صفائی کی تو پتا چلا کہ زخم بہت گہرا ہے۔ اس سے دماغ پر گہرے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ دماغ کو بھی چوٹ لگی ہے۔ انہوں نے ٹانکے لگا کر پٹی باندھ دی۔ حنا بدستور بے ہوش تھی اور خالد بھائی پریشان۔ ڈاکٹر کاشف نے دو گھنٹے بعد دماغ کا ایکسرے بھی کیا اور فکرمند ہوگئے۔ اس وقت خالد بھائی کسی کام سے گھر جا چکے تھے۔

ادھر گھر میں حاجرہ کی جان عذاب میں آئی ہوئی تھی کہ اس نے کیسے خالد بھائی کے سامنے ساری باتیں بتائیں۔

''آخر حنا بی بی نے ایسا کیا کیا ہے جو آپ لوگ ان سے ایسا سلوک کرتے ہیں؟'' حاجرہ نے رضیہ بیگم کی صلواتوں کے جواب میں سوال کیا۔ ''ایسا سلوک تو کوئی اپنوں کے ساتھ نہیں کرتا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ آپ کے کسی دشمن کی بیٹی ہے یا پھر سوت کی جنی، مگر آپ تو اسے اپنی بھانجی، بھتیجی کہتی ہیں۔ جو کہ غلط ہے مگر آج کے.....''

''بس زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ فوراً اپنا حساب کتاب کرا کر یہاں سے دفعان ہوجا۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے پہلے کہ خالد یہاں آئے اور تجھ سے مزید پوچھ گچھ کرے۔" رضیہ بیگم زور سے دہاڑیں مگر باہر سے آتے خالد بھائی ان کی اور حاجرہ کی گفتگو کا آخری حصہ سن چکے تھے۔ رضیہ بیگم نے پیسے حاجرہ کے اوپر پھینکتے ہوئے اسے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ باہر آئی تو خالد بھائی پرسوچ انداز میں اس کو دیکھنے لگے۔ حاجرہ جلدی سے گیٹ سے باہر آ گئی۔ حاجرہ کی بات "سوت کی جنی" نے تو رضیہ بیگم کو پتنگے لگا دیئے تھے اور حقیقت بھی یہی تھی۔

☆......☆......☆

آغا جان نسلاً ایرانی تھے، ان میں لطافت، نفاست اور نزاکت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شاہی خانوادے میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے کچھ شوخ اور بذلہ سنج بھی تھے۔ پاکستان آنے سے پہلے ایران کے شہر زاہدان میں ان کا قالین کا کاروبار تھا۔ بنیادی طور پر تاجر تھے اس لیے پاکستان آ کر بھی انہوں نے تجارت کو ہی اپنایا۔ شروع میں کرائے کے مکان میں رہے بعد میں آہستہ آہستہ اپنے ذاتی مکان کا بندوبست بھی کرلیا۔ پھر صمدانی صاحب ان کے بزنس پارٹنر بن گئے پھر ان ہی کے ایما پر اپنا گھر بھی آباد کرلیا۔ اللہ نے دو بیٹے اور ایک بیٹی دی۔ دونوں بیٹے حارث اور شارق اور بیٹی ظلِ ہما تھی۔ تینوں بچے تعلیم حاصل کررہے تھے۔ اچانک چیچک کی وبا پھیلی جس میں ان کی بیٹی ظل ہما چٹ پٹ ہوگئی۔ اب آغا جان اور نسیمہ بیگم کی ساری توجہ دونوں بیٹوں پر تھی۔ کاروبار میں اللہ نے برکت ڈال دی تھی۔ میٹرک کے بعد حارث نے کامرس لے لی اور پھر ایم کام کرلیا۔ جبکہ شارق نے ایم۔ بی۔ اے کو ترجیح دی۔ حارث نے آغا جان کے ساتھ کاروبار میں شرکت کرلی اور آغا جان نے ان کی شادی اپنی مرضی سے رضیہ نامی خاتون سے کرادی جو کہ ان کے ایک جاننے والے کی بہن تھیں۔ وہ نہ صرف کم رو تھی، بلکہ بدزبانی اور بدخلقی میں بھی اپنی مثال آپ تھی مگر آغا جان نے حارث کو نیکی کے جذبے کے تحت راضی کرلیا۔ یوں جھٹ پٹ رضیہ بیگم آغا ولا میں بہو بن کر آ گئیں۔ جلد ہی اللہ نے انہیں دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نواز دیا۔ شارق کے ایم۔ بی۔ اے کے بعد ان کی شادی بھی آغا جان نے حسبِ روایت اپنی پسند سے بلقیس بانو سے کردی۔ چھوٹی بہو نیک اطوار اور بڑی رکھ رکھاؤ والی ثابت ہوئی اور آئے دن ان کی واہ واہ ہوتی۔ صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے وہ بہترین تھیں۔ ان کی آئے دن کی تعریف وتوصیف سن کر رضیہ بیگم آپوں آپ زہریلی ناگن بن گئیں اور ہر کسی کو ڈسنے کو تیار رہتیں۔

یکایک آغا جان کو دل کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ اسپتال میں چند گھنٹوں میں ہی ختم ہوگئے۔ نسیمہ بیگم کو ان کی کنڈیشن کا اندازہ نہ ہوسکا کیونکہ جس وقت آغا جان کو دورہ پڑا تو نسیمہ بیگم ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے دوائیں اور نیند کی گولی کی وجہ سے غنودگی میں تھیں۔ اس لیے کسی نے ان کو نہ اٹھایا مگر جب اسپتال سے واپسی پر انہیں اصل صورتِ حال کا علم ہوا تو پہلے تو انہیں سکتہ ہوگیا پھر انہوں نے ایسی ہائے کھینچی کہ وہ بھی آغا جان کے ساتھ ہی سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئیں۔ ہر آنکھ اشکبار تھی کیونکہ دونوں ہی بلند اخلاق اور ملنسار تھے۔ اس وقت حارث اور شارق دونوں کی بیویاں امید سے تھیں۔ اب گھر میں صرف بہویں اور بچے رہ گئے۔ کیونکہ حارث باپ کا کاروبار سنبھالتے اور شارق اپنی جاب پر چلے جاتے۔ ساس سسر کے مرنے کے چار ماہ بعد شارق کے یہاں خالد نے جنم لیا جبکہ دو ماہ بعد حارث کے ہاں دوسری بیٹی نمرہ نے جنم لیا۔ ایم بی اے کے بعد شارق ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کررہے تھے۔ ان کا

تبادلہ کراچی ہوگیا تو وہ خود کراچی چلے گئے۔ کراچی میں انہیں رہتے ہوئے پانچ سال ہوگئے تھے۔ ایک دن انہیں حارث بھائی کا خط ملا جس میں انہوں نے شارق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "گھر میں رضیہ بیگم کی چخ چخ کی وجہ سے گزشتہ کچھ ماہ پہلے میں نے ایک کرائے کا مکان لے لیا ہے۔ مالک مکان بہت بیمار اور غریب ہے اس کی ایک بیٹی ہے جو بہت حسین اور سلجھے ہوئے اخلاق کی مالک ہے۔ گزشتہ دنوں مالک مکان پر فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں مجھ سے اس کی کسی مناسب شخص سے شادی کی درخواست کررہا ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کے پاس وقت بہت کم ہے میں کہاں سے اس کے لیے رشتہ لاؤں، لہٰذا میں نے خود اس لڑکی شازیہ سے نکاح کا فیصلہ کرلیا ہے۔ تم آسکو تو فوراً آجاؤ۔" خط تھا یا کوئی گولہ جو شارق کے حواسوں پر گرا تھا۔ پھر اس نے پہلی فرصت میں حارث کے پاس جانے کا فیصلہ کرلیا اور اس کے نکاح میں بھی شریک ہوا۔ خود وہ بھی شازیہ کو دیکھ کر اس کی شرافت کا معترف ہوگیا۔ خالد کے بعد شارق کے یہاں بلقیس میں پیچیدگی کی وجہ سے اور کوئی اولاد نہ ہوئی۔ خالد تعلیمی مدارج طے کررہا تھا۔ حارث کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ انہیں اکثر سر درد کی شکایت رہتی کیونکہ گھر میں رضیہ بیگم ان کی جان عذاب میں رکھتی وہ بلقیس سے بھی ہمیشہ لڑنے مرنے پر تیار رہتیں۔ شارق نے حارث کی شادی کا ذکر بھی گھر میں نہ کیا تھا۔ تقریباً ایک سال بعد حارث کے یہاں شازیہ سے ایک بیٹی پیدا ہوئی تو انہوں نے اس کا نام حنا رکھا۔ شازیہ کے والد تو اس کی شادی کے دس دن بعد ہی گزر گئے تھے۔ اس لیے حارث زیادہ وقت شازیہ اور حنا کو دیتا۔ دو طرفہ پریشانیوں کی وجہ سے حارث کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا اور چند دن کوما میں رہنے کے بعد وہ اسپتال میں ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اسپتال ہی میں رضیہ بیگم نے شازیہ کو دیکھا۔ حقیقت کھلنے پر وہ اسپتال ہی میں شروع ہوگئیں اور شازیہ کو تدفین میں بھی شریک نہ ہونے دیا۔ بلکہ دھکے مار کر گھر سے ہی نکال دیا۔ یوں سب لوگ حنا اور شازیہ سے واقف ہوئے۔ شازیہ صبر کے گھونٹ پی کر روتی ہوئی، حنا کو لے کر واپس اپنے گھر چلی گئی پھر شارق ہی ان دونوں ماں بیٹیوں کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ شازیہ نے مکمل طور پر حنا کی تعلیم پر توجہ دینی شروع کردی۔ حنا جب انٹر میں تھی تو شازیہ بھی اللہ کے پاس چلی گئی اور حنا اکیلی رہ گئی۔ شارق نے اس کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لیا اور گھر لے آئے۔ رضیہ بیگم نے اس کو دیکھ کر قیامت مچادی تو شارق نے جتادیا کہ یہ گھر جتنا آپ کے چاروں بچوں کا ہے اتنا ہی حنا کا بھی ہے کیونکہ وہ اس کے بھی باپ تھے۔

اچانک ہی شارق اور ان کی بیوی بلقیس بانو بازار جاتے ہوئے اندھی گولیوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ مارنے والے نے پورا برسٹ مارا تھا۔ خالد تو اپنے والدین کی ناگہانی موت سے شاک میں آ گئے۔ ان دنوں ان کا ایم بی اے کا فرسٹ سمسٹر چل رہا تھا۔ دوستوں کی حوصلہ افزائی سے انہوں نے امتحان دیا۔ پھر کہیں سے اڑتی پڑتی انہوں نے سنی کہ شارق اور بلقیس کی موت کوئی حادثہ نہیں بلکہ قتل تھا، وہ بھی معاوضہ دے کر کروایا گیا اور کروانے والا بھی کوئی قریبی عزیز تھا۔ پھر وہ ثبوت حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگ گیا۔

حنا کے گھر میں آجانے کے بعد رضیہ بیگم نے آنے جانے والوں سے، کسی کو دور پرے کی بے سہارا بھتیجی، کسی کو بھانجی کہہ کر متعارف کروانا شروع کردیا۔ کچھ سے تو یہ تک کہہ دیا کہ کام کاج کے لیے ملازمہ رکھی ہے۔ اس دوران خالد نے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا پرائیویٹ بی۔اے کا امتحانی فارم بھر دیا تھا۔ یوں آج کل وہ امتحان کی تیاری کر رہی تھی جس میں خالد ہی اکثر رات میں اس کی مدد کرتا تھا۔ مگر رضیہ بیگم کو بھلا کیسے گوارا ہوتا وہ اسے دن تو دن' رات میں بھی نچلا نہ بیٹھنے دیتیں۔ نہ ہی اسے دو وقت پیٹ بھرنے کی اجازت تھی۔ اس دن بھی اس نے ایک دن پہلے ناشتے کے وقت ثمرہ اور نمرہ کے بچائے ہوئے ٹوسٹ اور ایک پیالی چائے لی تھی جبکہ دوپہر میں اس کو کچھ بھی کھانے کو نہ دیا گیا تھا۔ کیونکہ اس سے ایک گلاس جوٹوٹ گیا تھا۔ رات کو بھی وہ خالی پیٹ سوئی اور اس وقت وہ اسپتال میں تھی۔

خالد بھائی اندر آئے تو رضیہ بیگم ابھی تک گرج برس رہی تھیں۔ ''اب کس لیے واویلا مچا رہی ہیں؟ اب کون ہے جو یہ سب سن رہا ہے؟ اب تو چین آ گیا اسے اسپتال پہنچا کر۔'' وہ غصے سے دہاڑے۔

''ارے جا یہاں سے' میں سب جانتی ہوں تجھے کیوں مروڑ اٹھ رہے ہیں اس بدذات سے ہمدردی کے۔ ارے آوارہ ماں کی آوارہ بیٹی' چوٹ اور تکلیف کے نام پر ہمدردی کا ڈرامہ رچا رہی ہے۔'' رضیہ بیگم غصے اور نفرت سے گویا جلتے توے پر جا بیٹھیں۔

''ڈرامہ وہ نہیں بلکہ وہ ہے جو آپ رچا رہی ہیں۔ جب پولیس آئے گی اس گھر میں تو سب کچھ کھل کر سامنے آ جائے گا جو کچھ آپ نے کیا اور جو کچھ کر رہی ہیں۔'' خالد نے دہاڑتے ہوئے کہا' کیونکہ ڈاکٹر کاشف کے مطابق اگر زیادہ وقت حنا کوما میں رہی تو اس کے ایکسپائر ہونے کے چانسز بن سکتے ہیں اور پھر یہ قتل کا کیس بن جائے گا۔ پولیس کا نام سنتے ہی رضیہ بیگم کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔

''لو میں نے کیا کیا ہے جو پولیس یہاں آئے گی۔'' وہ مری مری آواز میں بولیں۔

''صبر کریں سب کچھ سامنے آ جائے گا۔'' خالد کی پھنکارتی آواز سن کر گھر کے دیگر افراد بھی وہاں آ گئے اور رضیہ بیگم کو مشکوک انداز سے دیکھنے لگے اور ان کی دونوں بہویں تو طنزیہ مسکرانے بھی لگیں۔ جبکہ نمرہ اور ثمرہ حیران پریشان ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

اگلے دن خالد اسپتال سے ہو کر گھر آیا تو رضیہ بیگم کو ڈرائنگ روم کے فون پر بڑی رازداری سے مصروف پایا۔ رضیہ بیگم کی دونوں بہویں کچن میں مصروف تھیں۔ اس نے آؤدیکھا نہ تاؤ لاؤنج میں رکھا ہوا فون اٹھا لیا۔ وہ کسی غفورا نامی آدمی کی بیوی سے مصروفِ گفتگو تھیں جس نے بتایا کہ غفورا تو پچھلے کئی ماہ سے بیمار ہے اور ابھی بھی وہ اسپتال میں داخل ہے۔ اس کی زبان اور دونوں پاؤں مفلوج ہو گئے ہیں۔ رضیہ بیگم کے پوچھنے پر اس کی بیوی نے جس اسپتال کا نام لیا اسے سن کر خالد چونک گیا۔ وہ ڈاکٹر کاشف کا اسپتال تھا۔ اب خالد کو تجسس نے آ گھیرا کہ غفورا جیسے بدمعاش اور قاتل سے رضیہ بیگم کو ایسا کیا کام آ پڑا تھا کہ وہ اس کو تلاش کر رہی تھیں۔ یکا یک کسی سوچ کے تحت اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے واپس چلا گیا۔ اسپتال پہنچ کر اس نے ریسپشن سے غفورا کا نمبر معلوم کیا پھر اس کے کمرے میں پہنچ کر اس کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ ایک پلمبر کی حیثیت سے ان کے گھر میں آیا تھا۔ اس وقت شارق اور بلقیس یا نو دونوں زندہ تھے۔ پھر کچھ دن بعد ہی ان دونوں کو قتل کر دیا گیا'' اس کا مطلب ہے کہ غفورا ہی.....''

اس سے آگے اس سے سوچا ہی نہ گیا۔ اپنے والدین کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں آپ کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لوں گا۔'' وہ دل ہی دل میں ان سے

مخاطب ہوا۔ اس نے کاشف کو ساری بات بتائی پھر غفورا کے پاس کاشف کے ساتھ آیا۔ ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ غفورے کی بیوی اس کا کھانا لے کر آ گئی۔ آتے ہی اس سے بولی۔ ''ارے غفورے تو کتنے دن سے اسپتال میں ہے' لیکن تجھے کوئی بھی پوچھنے تک نہیں آیا مگر آج کسی رضیہ بیگم کا فون آیا تھا' وہ تیرا پوچھ رہی تھی۔ میں نے اس کو تیری بیماری اور اسپتال میں داخلے کا بتا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اسے تیرا کچھ ادھار لوٹانا ہے۔ اچھا ہے کہ وہ پیسہ تیرے ہی کام آ جائے۔ شاید وہ تجھ سے ملنے یہاں پر آئے۔'' رضیہ بیگم کا نام سنتے ہی غفورے کی عجیب حالت ہو گئی۔ وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔ خالد کے اشارے پر کاشف نے غفورے کی بیوی کو کمرے سے باہر جانے کا کہا۔ پھر خالد نے اس سے پوچھا ''تم رضیہ کو کب سے جانتے ہو؟ اس کو تم سے کیا کام ہو سکتا ہے اور تم نے اس سے پہلے بھی اس کا کوئی کام کیا ہے؟'' غفورا حیران ہو کر خالد کو دیکھنے لگا اور غوں غوں کر کے کچھ بولنے کی کوشش میں بے ربط سی آوازیں اس کے منہ سے نکلنے لگیں۔ پھر آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ خالد کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا تب اس نے اشارے سے لکھنے کے لیے کاغذ اور قلم مانگا۔ خالد نے اس کو ذرا دیر رکنے کو کہا پھر جلدی سے ایس پی چاند کے نمبر ڈائل کیے اور اس کو فوراً اسپتال آنے کو کہا۔ ایس پی چاند اس کا انٹرویو رہ چکا تھا۔ فوراً ہی وہ کاشف کے اسپتال پہنچ گیا۔ اس نے مختصراً اس کو بات سمجھائی اور پھر کاغذ اور قلم لے کر غفورے کے پاس پہنچ گیا۔ ایس پی چاند غفورے کے سرہانے کی طرف اس کی رینج سے دور کھڑا رہا۔ خالد نے دروازہ بند کر دیا اور غفورے کو کاغذ اور قلم دے کر خود کھڑا رہا۔ غفورے نے شارق اور بلقیس کے قتل کے سلسلے میں رضیہ بیگم سے ڈیلنگ کی مختصر تفصیل لکھی۔ ساتھ ہی پچاس ہزار روپوں کی ادائیگی کا بھی انکشاف کیا جو کہ رضیہ بیگم نے اس کو چیک کی شکل میں کی تھی اس کے علاوہ نقد بیس ہزار کی ادائیگی کا وعدہ بھی کیا تھا جو اس نے آج تک پورا نہ کیا۔ غفورے کے مطابق اس نے یہ قتل اکیلے نہیں کیا بلکہ اس میں اس کا ساتھ فیکے نے دیا تھا۔ اس کی تفصیل بھی دی تھی کہ وہ کہاں مل سکتا ہے۔ آخر میں اس نے اعتراف کیا تھا کہ وہ پچاس ہزار مجھ پر بہت بھاری پڑے اور میری اکلوتی بیٹی کو میرے سامنے ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا گیا اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیا جائے۔ خالد نے اس تحریری بیان پر غفورے کے دستخط کے علاوہ انگوٹھے کے نشان بھی لیے۔ اتنا لکھنے کے بعد غفورا نہ صرف حواس باختہ تھا بلکہ اس کی سانس بھی بے ربط ہو گئی تھی۔ اس اثناء میں شام کے چار بج گئے۔ خالد نے ایس پی کو غفورے کی بیوی اور رضیہ بیگم کی فون کال کے بارے میں بتایا یکا یک خالد نے رضیہ بیگم کو دیکھا جو غفورے کے کمرے کی طرف آ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے ایس پی چاند کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لگے پردے کے پارٹیشن کے پیچھے چلا گیا۔ رضیہ بیگم نے اندر آ کر غفورے سے ڈانٹنے کے انداز میں خیریت پوچھی پھر اس کو ایک نئے کام کے بارے میں بتانے لگی مگر غفورا بے بسی سے سر ہلانے لگا۔ وہ سمجھیں کہ وہ انکار کر رہا ہے تو اسے اسپتال کے اخراجات کی ادائیگی کا لالچ دیا۔ ''ارے تو فکر نہ کر اب تیرا بہترین علاج ہو گا اور تو دو دن کے اندر یوں بھلا چنگا ہو جائے گا۔'' انہوں نے چٹکی بجانے کے انداز میں کہا پھر دوبارہ سے یوں گویا ہوئیں۔ ''اب کے تجھے ایک بالکل مریل سی لڑکی کو اڑانا ہے۔ پیسوں کی تو بالکل فکر نہ کر تیرے پچھلے بیس ہزار بھی دے دوں گی بلکہ علیحدہ سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انعام بھی ملے گا۔ تجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ ویسے بھی آج کل وہ لڑکی بیمار ہے کسی اسپتال میں ہے۔ ارے اگر اس اسپتال کا پتا چل جائے تو وہیں پر ہی کام تمام ہوسکتا ہے۔ انہیں اپنی دھن میں یہ خیال بھی نہ رہا کہ غفورا بولنے کے علاوہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہے۔ وہ تو صرف انتقام کی آگ میں جل کر بھسم ہوئی جارہی تھیں۔ ''تو چاہے تو پہلے کی طرح فیکے کو بھی ساتھ ملا لے۔ بس تو میرا یہ کام کردے تو میں تجھے خوش کردوں گی۔ یہ لڑکی تو میرے لیے عذاب بن گئی ہے۔ پتہ نہیں کب اس سے جان چھوٹے گی۔'' جواب میں غفورا کچھ بھی نہ بولا تو انہیں تشویش ہوئی۔ وہ اسے جھنجھوڑنے اور آوازیں دینے لگیں تو فوراً ہی ایس پی چاند پردے کے پیچھے سے نکل آئے ان کے ساتھ ہی خالد بھی ہاتھ میں موبائل فون پکڑے برآمد ہوا جس میں رضیہ بیگم کی ساری گفتگو ریکارڈ ہوچکی تھی۔ خالد کو دیکھ کر وہ چونک گئیں۔ ''تم یہاں پر کیا کررہے ہو؟'' جواب میں اس نے موبائل فون آن کردیا تو ان کو خود اپنی آواز سنائی دی۔ ''یہ کیا ہے؟''

''یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔'' خالد نے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے جواباً ان سے سوال کیا تو وہ بوکھلا گئیں۔

''کس کام کی ڈیلنگ کررہی تھیں آپ غفورے سے؟ آپ اس کو کیسے جانتی ہیں؟ اور اس سے پہلے آپ نے اس سے جو ڈیلنگ کی تھی وہ اس وقت تحریری بیان کی صورت میں میرے ہاتھ میں موجود ہے۔''

اب کے ایس پی چاند گرجے۔ اب تو رضیہ بیگم چاروں شانے چت گری تھیں۔ ایس پی چاند نے مقامی تھانے میں فون کرکے لیڈی کانسٹیبلز اور دو چار پولیس والوں کو بھی رضیہ بیگم کے ایڈریس پر پہنچنے کی ہدایت کی اور خود خالد کو ساتھ لے کر فیکے کو چھاپنے اور کورٹ سے رضیہ بیگم کے وارنٹ گرفتاری لینے کے لیے نکل پڑے۔ اس دوران رضیہ بیگم نے خود کو آزاد سمجھ کر گھر جانے کے لیے باہر کی راہ لی تو وہاں ڈرائیور موجود نہ تھا۔ اسے فون کرنے پر پتہ چلا کہ گاڑی میں پیٹرول ختم ہوگیا تھا اس لیے پیٹرول لے کر تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ ان دنوں پیٹرول کی بڑی قلت تھی قطار میں لگ کر لینا پڑتا تھا۔ ڈرائیور کے آنے پر انہوں نے اپنا غصہ اس پر نکالا اور جھٹ گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ سادہ لباس میں دو پولیس والے موٹر سائیکل پر ان کی گاڑی کے پیچھے چل پڑے۔ جونہی وہ گھر پہنچیں برابر کی گلی سے نکل کر پولیس وین ان کے گیٹ پر پہنچ گئی۔ اس میں سے اتر کر دو لیڈی کانسٹیبلز اور چار پولیس اہلکار ان کے پیچھے اندر پہنچ گئے جبکہ چوکیدار راموچاچا انہیں روکتے ہی رہے۔ پولیس کو دیکھ کر وہ بوکھلا گئیں جبکہ گھر کی عورتیں حیران اور مرد پریشان' رضیہ بیگم نے اندر کی طرف قدم بڑھائے تو لیڈی کانسٹیبلز نے ان کا راستہ روکا۔ واجد اور ماجد ایک دم سے چیخے۔

''یہ کیا کررہے ہیں آپ لوگ؟''

''وہی جو ہمیں کہا گیا ہے۔''

''کس نے کہا ہے تم سے؟'' واجد اور اس کی بیوی یک زبان ہوکر بولے۔

''ایس پی چاند اور آئی جی نے۔'' ترنت جواب آیا۔

''مگر.....'' اگلے سوال سے پہلے ہی ایس پی چاند' خالد اور فیکے کے ساتھ اندر آچکے تھے۔ فیکے کو دیکھ کر رضیہ بیگم کو اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لیڈی کانسٹیبلز نے رضیہ بیگم کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگادیں۔ دونوں بیٹے بیٹیاں اور بہویں یہ

سب حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔

''ان کا جرم تو بتادیں؟'' واجد اور ثمرہ نے فریادی لہجے میں پوچھا۔ ''دہرے قتل کی ذمہ دار۔ انہوں نے ہی پیسے دے کر اپنے دیور شارق اور اس کی بیوی بلقیس بانو کو قتل کروایا تھا۔'' ایس پی چاند نے دہاڑ کر کہا۔

''یعنی چچا جان اور چچی جان کا قتل امی نے کروایا تھا؟'' سب کے سب حیرانی سے گویا تھے۔

''ہاں' ہاں میرے ماں باپ کا قتل اسی ظالم عورت نے کروایا تھا اور اب یہ حنا کو مارنے کے لیے غفورے کے پاس ڈیلنگ کرنے گئی تھیں۔'' خالد نے آبدیدہ ہوکر کہا۔ ''مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے آپ لوگوں کے پاس؟ اور دوسری بات کیا آپ کے پاس ان کی گرفتاری کا وارنٹ ہے؟''

''میاں ہمارے پاس ثبوت بھی ہیں اور وارنٹ بھی ہے۔ یہ دیکھیے وارنٹ۔'' ایس پی چاند نے اپنی جیب سے ایک کاغذ کی فوٹو کاپی ماجد اور واجد کی طرف بڑھائی۔

فیکے کو گرفتاری کے وقت چونکہ جوتے پڑ چکے تھے اس لیے اس نے بھی تمام گھر والوں کے سامنے گواہی دی۔ ''مگر تم رضیہ بیگم کو کیسے جانتے ہو؟'' ایس پی چاند نے فیکے سے ڈپٹ کر پوچھا۔

''رضیہ بیگم کو میں تو نہیں جانتا تھا' مگر مجھے تو راموچاچا نے ان سے ملوایا تھا۔ جب انہیں باتھ روم اور انیکسی میں پانی کی لائنوں میں لیک کا مسئلہ تھا۔''

''راموچاچا تمہارے کون ہیں؟'' اب کے خالد نے سوال کیا۔

''وہ میرے کوئی نہیں ہیں مگر پہلے یہ مستری تھے تو میں ان کے ساتھ بلڈنگوں اور گھروں میں پلمبری کا کام کرتا تھا۔ غفورا بھی میرے ساتھ ہوتا تھا۔ ہم ان کو مستری چاچا کہتے تھے۔ ایک بار مستری چاچا کام کرتے ہوئے گر گئے جس کی وجہ سے ان کا داہنا ہاتھ فریکچر ہوگیا بعد میں انہوں نے ہاتھ کی وجہ سے کام چھوڑ دیا پھر یہاں پر چوکیداری کرنے لگے۔ ہم دونوں چھوٹی موٹی چوریاں اور بدمعاشیاں کرنے لگے۔ ایک مرتبہ چوری کے دوران مالک مکان کا لڑکا جاگ گیا۔ ہم نے اپنے بچاؤ میں اس پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں تو صاف بچ نکلا' مگر غفورے نے اس پر گولی چلادی۔ گولی اس لڑکے کو لگی اور اس کی چیخ سے گھر والے جاگ گئے۔ غفورا پستول سمیت سڑک پر بھاگ رہا تھا۔ قریب سے گزرتی ہوئی ایک کار میں سے دو آدمیوں نے اس کو بہت قریب سے دیکھ لیا۔ خود وہ دونوں آدمی ایئرپورٹ جارہے تھے۔ اس لیے فوراً کوئی عینی شاہد نہ مل سکا اور غفورا فی الحال تھانے سے باہر ضمانت پر تھا۔ کیونکہ تھانہ انچارج بھی اس کا یار تھا۔ خالد کو یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے گھر کے دونوں باتھ رومز اور واش روم میں پانی کی لیک کا مسئلہ ہوگیا تھا جس کی وجہ سے ایک مرتبہ وہ خود پھسلتے ہوئے بچا تھا۔ مگر دوسری مرتبہ اس کے پاؤں میں موچ آگئی تھی۔ انیکسی میں پھسلنے کی وجہ سے رضیہ بیگم نہ صرف گری تھیں بلکہ ان کے ہاتھ پاؤں میں چوٹیں بھی لگی تھیں جس کی وجہ سے وہ کافی دنوں صاحبِ فراش رہیں اور اس تمام کی ذمے دار بھی وہ حنا کی نحوست کو ٹھہراتی تھیں۔

''مگر رضیہ بیگم کو تمہارے قتل وغارتگری کے فن کی خبر کیسے ہوئی؟'' ایس پی چاند نے پھر سوال کیا۔

''دراصل کام زیادہ ہونے کی وجہ سے میں اپنے ساتھ غفورے کو بھی لے آیا تھا۔ وہ بھی ان دنوں چونکہ بے روزگار تھا اور اس کیس کی وجہ سے ضمانت پر بھی تھا۔ ایک دن ہم دونوں کام کے دوران اسی کیس کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔ کیونکہ اگلی پیشی پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غفورے کو نئے گواہوں کا سامنا تھا جنہوں نے اس کو موقع واردات سے معہ ہتھیار بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اخبار میں تصویر چھپنے کی وجہ سے وہ اس کو پہچان پائے اور اب وہ لندن سے یہاں گواہی دینے اور ملزم کو شناخت کرنے کے لیے آرہے تھے۔ پتا نہیں کب رضیہ بیگم وہاں آ گئیں اور انہوں نے وہ ساری گفتگو سن لی۔ انہوں نے ہمیں دھمکی دی کہ ”تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ اگر تم انکار کرو گے تو میں پولیس کو تمہارے بارے میں بتادوں گی۔ دوسری صورت میں تمہیں نہ صرف معاوضہ بلکہ انعام بھی ملے گا۔“ ہمارے پوچھنے پر کہ شارق اور اس کی بیوی سے تمہیں کیا پرخاش ہے؟ انہوں نے بتایا کہ شارق دراصل میرا سوتیلا دیور ہے اور وہ میرے شوہر کے محنت سے بنائے کاروبار کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک غیر لڑکی کو میری سوتیلی بیٹی کی حیثیت سے گھر میں لے آیا ہے، وہی تو ہے اس نئی مصیبت حنا کو لانے والا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہمارے آگے شارق اور اس کی بیوی کے اپنے اوپر ظلم کی ایسی تصویر کھینچی کہ ہم بے اختیار ان کا کام کرنے پر راضی ہوگئے۔“

سب دم بخود، حیران کھڑے فیکے کی داستان سن رہے تھے اور رضیہ بیگم کی وہ حالت کہ ”کاٹو تو بدن میں لہو نہیں“ والا محاورہ فٹ آرہا تھا۔

پھر رضیہ بیگم کو تو پولیس گرفتار کر کے لے گئی مگر ساتھ ہی اس تاجر خاندان کی ساکھ بھی مٹی میں مل گئی۔ شارق نے اپنے قتل سے دو ماہ پہلے ایک ویل ڈیکوریٹڈ، فرنشڈ فلیٹ خالد کے نام پر خریدا تھا۔ شاید انہیں اپنے انجام سے آگہی ہو چکی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ آغا جان کی حویلی میں ہی رہ رہے تھے۔ ان کا ارادہ خالد کو یہ فلیٹ ایم بی اے کے رزلٹ پر گفٹ کرنے کا تھا۔ اس کے علاوہ حارث نے اپنی بیماری کے دوران حنا کے نام پچاس لاکھ روپے اور ایک لاکھ کے سیونگ سرٹیفکیٹ کر دیئے تھے جس کا علم خالد کو بھی تھا مگر حنا بے خبر تھی۔

رضیہ بیگم کی گرفتاری کے بعد خالد بھی اس گھر سے کنارہ کش ہو کر اپنے باپ کے فلیٹ میں رہ رہا ہے۔ شارق کے سوئم کے بعد اس کے وکیل نے خالد کو مکان کے کاغذات کے علاوہ ان کی تمام جائیداد کی دستاویزات دے دی تھیں۔ غفورا تو رضیہ بیگم کی گرفتاری کے چند دن بعد ہی مر گیا تھا۔ اس کے ضمیر کی چبھن نے اسے جینے ہی نہ دیا تھا۔ مرنے سے دو گھنٹے قبل اس کی زبان حیرت انگیز طور پر کافی حد تک بولنے کے قابل ہوگئی تھی۔

رضیہ بیگم کا کیس ابھی کورٹ میں چل رہا ہے۔ ان کی اولادوں میں سے کوئی بھی ان کی پیشی پر عدالت میں نہیں جاتا۔ شاید بدنامی کے ڈر سے نہ ہی ان کے لیے کوئی وکیل کیا گیا ہے۔ حنا آج بھی کوما میں ہے۔ خالد کا خیال ہے کہ حنا کے ہوش میں آنے کے بعد وہ اس کی مرضی سے اگر وہ راضی ہوئی تو اس سے شادی کرلے گا۔ اور حارث نے جو کچھ اس کے نام کیا ہے۔ اسے دلا کر رہے گا۔

یہ دنیا صرف چند روزہ ہے اور ان چند روز میں بھی کون جانے نیکی کمائے گا یا بدی۔ دعائیں سمیٹے گا یا بددعائیں۔ سکھ پائے گا یا دکھ میری قارئین سے التماس ہے کہ جتنا ہو سکے اپنے وقت کو نیک کاموں میں صرف کریں اور اپنے ہاتھ اور زبان سے دوسروں کو سکھ پہنچا کر ایک اچھے مسلمان ہونے کا ثبوت دیں اور دوسروں کی دعائیں سمیٹیں۔ تاکہ حشر میں کام آسکیں۔ اللہ ہم سب اور تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کو نیکی کی ہدایت اور توفیق دے۔ (آمین)

نیا سورج

جناب ایڈیٹر نئے افق ڈائجسٹ'
تسلیمات!

سن عیسوی' عیسائیوں کا سال ہے جب کہ ہم مسلمانوں کے سال کا آغاز ماہ محرم سے ہوتا ہے لیکن ہم ذہنی طور پر مغرب کے غلام ہو چکے ہیں۔ یہ غلامی بعض اوقات کیا گل کھلاتی ہے اس کا اظہار اس سچی کہانی میں ہوتا ہے مجھے امید ہے یہ کہانی بہت سے لوگوں کے لیے سبق آموز ثابت ہوگی۔

نزہت حسین ضیاء
کراچی

نیوائر کا فنکشن عروج پر تھا۔ بڑے سے ڈرائنگ روم میں گویا طوفانِ بدتمیزی عروج پر تھا۔ فل آواز میں انڈین اور انگلش گانے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ میں نوجوان پارٹی کا شور ہنگامہ عروج پر تھا۔ دوسرے کمرے میں ہاتھوں میں قرآنِ پاک تھامے سلمٰی بیگم جائے نماز پر بیٹھی بہتی آنکھوں اور کپکپاتے لبوں سے اپنے ملک کی اور گھر کی سلامتی کے لیے دعا گو تھیں۔ گزشتہ چند سالوں سے ملکی حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ آپس میں مسلمان بھائی ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے تھے۔ فسادات' رہزنی' قتل اور اغواء جیسے گھناؤنے جرائم عروج پر تھے۔ سلمٰی بیگم خضوع و خشوع کے ساتھ مصروفِ دعا تھیں' ساتھ ساتھ اپنی اولاد کے لیے بھی دعا گو تھیں۔

”یا اللہ! میرے بچوں کو سیدھا اور نیکی کا راستہ دکھا۔ ان کو صراطِ مستقیم پر چلا۔ میرے مولا! یہ بگڑ گئے ہیں' ان کو راہِ راست پر لا کر ان کی آخرت سنوار دے مولا!“ وہ ایک جذب کے عالم میں اپنے خدا سے طلب کی بھیک مانگ رہی تھیں۔

اور دوسری طرف ان کے بچے' بیٹا' بہو اور پوتا' پوتی داہیات انداز میں نئے سال کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ شوہر کے مرنے کے بعد سلمٰی بیگم نے بہت محنت اور لگن سے احد کی پرورش کی اور اسے ایم بی اے کروایا۔ پڑھائی کے دوران ہی احد کو ارسلہ پسند آ گئی۔ اس نے پڑھائی مکمل کر کے کاروبار شروع کیا تو تھوڑے عرصے میں کاروبار خوب ترقی کر گیا۔ ارسلہ بہت پیسے والے والدین کی اکلوتی اور قدرے بگڑی ہوئی بیٹی تھی۔ سلمٰی بیگم نے بیٹے کی پسند دیکھ کر ارسلہ کو بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

ارسلہ کو احد کا گھر' رہن سہن اور معیارِ زندگی پسند نہ آیا اور وہ تھوڑے دنوں میں ہی اپنے ذاتی بنگلو میں شفٹ ہوگئی لیکن اتنا تو تھا کہ سلمٰی بیگم کو ساتھ ہی رکھا تھا۔ ہاں! اگر سلمٰی بیگم اس کو ٹوکتیں تو وہ ارسلہ کو برا لگتا تھا۔ سلمٰی بیگم بچپن سے ہی نماز روزے کی پابند عبادت گزار تھیں جب کہ ارسلہ ان چیزوں سے دور تھی۔ عین نماز کے وقت وہ کبھی کوئی مووی دیکھتی یا کبھی گانے سنتی رہتی' سلمٰی بیگم نے سمجھانا چاہا تو اس نے کھری کھری سنادی۔

شادی کے ابتدائی دن تھے سلمٰی بیگم حسبِ عادت فجر کی نماز کے بعد کوریڈور میں بیٹھ کر زور زور سے قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں کچھ ماحول کا اثر تھا کچھ ان کی خوش الحانی کہ آواز جیسے گونجنے لگی تھی اور ارسلہ نیند سے جاگ گئی تھی۔

”اماں پلیز!“ ارسلہ کی آواز پر انہوں نے چونک کر دیکھا۔ ”صبح صبح کتنا شور کر رہی ہیں' اپنے کمرے میں جائیں ناں!“ نیند میں ڈوبی خمار آلود آنکھیں بہ مشکل کھول کر قدرے بدتمیزی سے بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بیٹی! یہ شور نہیں باعث رحمت ہے' باعثِ برکت ہے۔'' چشمے کے اوپر سے دیکھ کر نرم لہجے میں کہا۔

''اماں پلیز! ہم ڈسٹرب ہو رہے ہیں' آپ اندر چلی جائیں روم میں۔'' ارسلہ کے پیچھے ہی آنکھیں ملتا احد کھڑا تھا۔

''اچھا بیٹا!'' انہوں نے دکھی لہجے میں کہا۔ یہی بیٹا تو برسوں سے یہ آواز سن رہا تھا' آج اسے یہ شور لگ رہا تھا۔ خاموشی سے وہ قرآنِ پاک اور رحل اٹھائے کمرے میں آ گئیں' ان لوگوں کو کچھ کہنا یا سمجھانا فضول تھا۔ صرف دعا ہی کی جا سکتی تھی ان کی بہتری کے لیے۔ بیٹا بھی مکمل طور پر بیوی کو پیارا ہو چکا تھا۔

خیر سلمٰی بیگم کو ویسے بظاہر کسی چیز کی کمی نہ تھی ہاں بیٹا اور بہو ان سے بہت دور تھے۔ کتنے کتنے دن وہ احد سے بات کر نہیں پاتیں ان کے لیے ایک نوکرانی رکھ دی گئی تھی ارسلہ اور احد اپنے فنکشنز اور پارٹیز میں مصروف رہتے۔

پھر ان کی زندگی میں باسم اور اریشہ یکے بعد دیگرے آ گئے۔ سلمٰی بیگم بہت خوش تھیں کہ پوتا اور پوتی بھی آ گئے تھے لیکن جوں جوں بچے بڑے ہوتے گئے' ارسلہ انہیں دادو سے دور رکھتی تھی۔ سلمٰی بیگم چاہتی تھیں کہ بچے قرآن و سنت اور اللہ کے احکامات سے ہر ممکن معلومات رکھیں لیکن بہ مشکل ہی بچے قرآنِ پاک ختم کر پائے۔ نماز' روزے اور دیگر دینی امور سے بالکل بے بہرہ تھے۔ پتا نہیں احد بھی ایسا کیوں ہو گیا تھا بس پیسہ کمانے کی دھن سوار تھی زیادہ سے زیادہ کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ بیوی اور بچوں کو بھی ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا' وہ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ بچوں کو بہترین اسکول میں ڈال دیا گیا اور وہ تعلیمی مدارج طے کرتے گئے۔ اب باسم فرسٹ ایئر' اور اریشہ میٹرک میں تھی۔ اریشہ بالکل ارسلہ کی کاپی تھی' ویسی ہی حسین اور نازک مگر اٹھان ایسی تھی کہ عمر سے بڑی لگتی تھی۔ اس پر وہ کپڑے ایسے پہنتی کہ فیشن ختم ہوتا۔ سلمٰی بیگم چپکے چپکے اس پر دم کرتی رہتیں تاکہ بُری نظر سے بچی رہے۔ وہ باہر جا رہی ہوتی تو آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کر دیتیں۔ بے تکے اور نیم عریاں لباس میں وہ اور جاذبِ نظر لگتی۔ اسی طرح باسم جب اپنی گاڑی لے کر نکلتا تو سلمٰی بیگم اس کو بھی پڑھ کر دم کرتیں۔ آج کل کے حالات آئے دن گاڑیاں' موبائل اور پیسے چھیننے کے بعد قتل کے واقعات انہیں دہلا دیتے اور جوان بچوں کو بُری صحبت سے بچنے کی دعائیں کرتی رہتیں۔

بچوں کو بھی دادو سے خاص لگاؤ نہ تھا۔ بقول ان لوگوں کے دادو تو بیک ورڈ ہیں' بہت پرانے زمانے والی' جو ہر وقت بس نصیحتیں کرنے کے موڈ میں رہتی ہیں۔

اس روز سلمٰی بیگم نہا کر نکلیں تو ہال سکھانے لان میں آ گئیں۔ تب ہی اریشہ وہاں آ گئی۔

''ہاؤ سویٹ دادو! آپ کے ہیئر کتنے بیوٹی فل ہیں' گھنے سلکی۔'' لمبے بالوں کو پیٹھ پر پھیلا دیکھ کر وہ حیران تھی۔ ہمیشہ جوڑے کی قید میں رہنے والے آج آزاد تھے جو اٹریکٹ کر رہے تھے۔ ''دادو! آپ اتنے اچھے بالوں کو کھلا رہنے دیا کریں ناں! کتنے اچھے ہیں۔''

''اس عمر میں؟'' سلمٰی بیگم مسکرائیں۔

''وہائی ناٹ دادو! میری فرینڈ کی گرینڈ ماہیں ناں آپ کی طرح ہی ہیں' انہوں نے اتنی اچھی کٹنگ کروائی ہے اور کپڑے بھی اتنے ڈیسنٹ پہنتی ہیں بالکل فیشن ایبل اور ان ماڈلز والے۔'' وہ بڑے فخر سے بتا رہی تھی۔ ''آپ بھی اتنی کیوٹ لگیں گی ذرا سا چینج ہو کر..... رئیلی!'' وہ معصومیت سے بولی۔ سلمٰی بیگم اس کی معصومیت پر زیرِ لب مسکرا دیں پھر آہستگی سے کہا۔

''بیٹا! یہ خوب صورتی اللہ کی دی ہوئی ہے' ہمیں اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے نا کہ ان کی نمائش کریں۔ اس نے ہمیں اچھی شکل و صورت سے نوازا ہے۔ ہمیں مکمل صحت و سلامتی اور بغیر معذوری کے بھرپور زندگی عطا کی ہے' ہمیں دنیاوی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے تو ہم ناچیز بندے اپنے ربّ کے احسانات کا

بدل تو نہیں دے سکتے' ہاں! ہم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کر سکتے ہیں ناں! اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی پابندی کر کے' نماز اور قرآنِ پاک سے مستفید ہو کے' ہمیں خود کو نمائش میں پیش کرنے کا حکم نہیں میری بچی! ہم عورتوں کو تو خود کو چھپا کر رکھنے کا حکم ہے۔ اپنے بالوں کو' اپنے جسم کو' پردے میں رکھنے کا حکم ہے نا کہ اسے لوگوں کے سامنے پیش کر کے داد وصول کرنا ہے۔''

''پلیز دادو!'' وہ یک دم کھڑی ہو گئی اور قدرے تلخی سے کہا۔ ''آپ سے اسی لیے بات نہیں کرتی کہ آپ نان اسٹاپ لیکچر دینا شروع کر دیتی ہیں۔'' کہہ کر وہ دھم دھم کرتی اندر کی طرف لوٹ گئی اور سلمٰی بیگم گم صم سی اپنی پندرہ سالہ پوتی کی پیٹھ تکنے لگیں کہ یا اللہ! ہماری نسل کو نیکی اور بھلائی کا راستہ دکھا' میرے اللہ! انہیں اچھے اور برے کی تمیز کرنا سکھا دے' مزید دلدل میں گرنے سے بچا لے میرے مولا! وہ آبدیدہ ہو گئیں۔

عید' بکرہ عید سے زیادہ یہاں نیوائر کی تیاریاں ہوتی تھیں۔ اس سال باسم اور اریشہ کے سب دوست آنے والے تھے۔ نیوائر گھر پر منانے کا پروگرام تھا۔ پورے گھر کو خوب سجایا گیا تھا' برقی قمقموں سے سارا گھر جگمگا رہا تھا۔ شام سے ہی خوب رونق تھی۔ نئے سال کی آمد پر کسی نے دعا کے دو لفظ بھی یاد نہ کیے بس ہڑبونگ اور ہنگامہ تھا۔ خوب زور و شور سے وہ آنے والے کا سال استقبال کر رہے تھے۔

سلمٰی بیگم کسی کام سے کمرے سے نکلیں تو سامنے سے باسم آتا دکھائی دیا ایک خوب صورت لڑکی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے' اس قدر قریب تھا کہ سلمٰی بیگم کی نگاہیں شرم سے جھک گئیں۔ لڑکی کے کپڑوں کو دیکھ کر انہیں جھرجھری آ گئی اس قدر تنگ اور چھوٹی سی جرسی اس پر نائٹی پہنے عجیب لگ رہی تھی۔

''باسم!'' انہوں نے آواز دی۔

''یس گرینڈ ما!''

''یہ کیا ہے بیٹا؟'' انہوں نے واہیات لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''وہاٹ! مائی فرینڈ گرینڈ ما! پلیز اپنے کمرے میں جائیں۔'' وہ بدتمیزی سے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا' پیچھے ہی احد تھا۔

''احد بیٹا!'' انہوں نے بیٹے کی جانب دیکھا۔

''جی اماں!'' وہ ایک لمحے کو رکا۔

''یہ کیا اُدھم بازی' کیسی بے باکی ہے بیٹا!'' دبتی زبان سے کہا۔

''اوہو اماں! پلیز آپ ٹینس نہ ہوں۔ یہ نئی جنریشن ہے جو اسی طرح سیلیبریٹ کرتی ہے نیوائر کو..... آپ جائیں اپنے کمرے میں اور سو جائیں' کیوں جاگ رہی ہیں خوامخواہ!'' ٹکا سا جواب دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔ سلمٰی بیگم منہ تکتی رہ گئیں۔ وہ کمرے میں آ گئیں اور دروازہ بند کر کے وضو کیا اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے' بارہ بجنے کے ساتھ ہی پورا علاقہ فائرنگ اور پٹاخوں کی آواز سے گونج اٹھا اور طوفانِ بدتمیزی میں مزید اضافہ ہو گیا' بے ہنگم آوازیں بے تکی چیخیں اور بلند قہقہوں سے ماحول آباد ہونے لگا۔ سلمٰی بیگم جائے نماز پر بیٹھی رو رو کر دعا گو تھیں ربّ سے اپنی اولاد کی بھلائی کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ ان سے کہاں غلطی ہوئی جو ایسی اولاد کی صورت میں سزا مل رہی ہے۔

نہ جانے کتنی دیر یہ ہنگامے جاری رہے اور وہ اپنے ربّ کے آگے سربسجود ہو کر دعائیں اور خیر کی بھیک مانگتی رہیں شاید رات بہت بیت گئی تھی کہ اب سارے لوگ جا چکے تھے فجر میں کچھ وقت ہی ہوگا طوفانِ بدتمیزی بھی تھم چکا تھا۔ سلمٰی بیگم قرآن پاک کی تلاوت میں مگن تھیں کہ اچانک کوریڈور میں بہت سارے قدموں کی آواز آئی ساتھ ہی ایک فائر ہوا ارسلہ اور اریشہ کی چیخ بھی سنائی دی۔

''یا الٰہی خیر!'' وہ اسی طرح ہاتھوں میں قرآن پاک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے کمرے سے باہر بھاگیں۔ ڈرائنگ روم کا منظر دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے' چار لڑکے ہاتھوں میں پستول لیے کھڑے تھے' ان میں سے دو نے احد اور باسم کے سروں کو نشانے پر لے رکھا تھا۔ دوسری جانب ریشہ اور ارسلہ تھر تھر کانپتی ہوئی زار و قطار رو رہی تھیں۔ ایک پل میں سلمٰی بیگم سمجھ گئیں کہ یہ چاروں ڈاکو ہیں مگر ان کی نظریں اریشہ پر تھیں سرخ جرسی اور بلو جینز میں نظروں میں اترتی جا رہی تھی۔ ان لڑکوں کی نظروں میں عجیب وحشت تھی۔

''ارے یار! جلدی کر'' ایک بولا۔

''خدا کے لیے جو لینا ہے لے لو انہیں چھوڑ دو۔'' ارسلہ گڑگڑائی۔

''ٹھیک ہے میڈم! دونوں کے بدلے ایک یہ حسینہ دے دو۔'' سامنے والا نوجوان خباثت سے بولا۔ ساتھ ہی سب نے قہقہہ لگایا۔

''دادو!'' اریشہ نے روتے ہوئے سلمٰی بیگم کی جانب دیکھا۔

''افوہ! ان کے ارادے تو ٹھیک نہیں لگتے۔'' سلمٰی بیگم لرز گئیں۔ ارسلہ تھر تھر کانپ رہی تھی' احد اور باسم اس وقت خود کو بہت کم تر اور بے بس محسوس کر رہے تھے۔ اریشہ کا خون خشک ہونے لگا تھا اسے لگا جیسے موت سر پر آ کر کھڑی ہو۔ کس قدر بے بس اور لاچار تھے سب اس وقت اور دل سے اپنے رب کو پکار رہے تھے۔ کون تھا جو اس وقت ان کی مدد کو آتا۔ انہیں اس قیامت سے نجات دلاتا۔ سب لوگ ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھ ہی سکتے تھے۔ سامنے والا نوجوان آہستہ آہستہ اریشہ کی جانب بڑھنے لگا۔

''خدا کے لیے پلیز! جو چاہے لے لو..... یہ لو!'' ارسلہ نے جلدی جلدی سونے کی چوڑیاں' نیکلس اور انگوٹھیاں اتاریں۔ ''اور جو کچھ بھی ہے گھر میں سب لے لو۔ خدارا آگے مت بڑھو۔ یا اللہ! رحم فرما ہم سب پر کرم کر..... ہم گناہ گاروں پر اپنا کرم کر دے میرے مولا!'' ارسلہ سسکتے ہوئے رب سے رحم کی طالب تھی۔ کرم کی بھیک مانگ رہی تھی' یکلخت سلمٰی بیگم چونکیں ہاتھوں میں قرآن پاک لیے وہ اریشہ اور نوجوان ڈاکو کے درمیان آ گئیں اور ساتھ ہی سورۃ یٰسین کی زور زور سے تلاوت شروع کر دی۔

''دیکھو! تم لوگوں کو خدا اور رسول کا واسطہ آگے مت بڑھنا۔'' انہوں نے کہا۔ ''میرے ہاتھوں میں پاک کتاب ہے' جس کا تقدس ہر مسلمان پر فرض ہے اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو اس کتاب کی بے حرمتی کا بہت بھیانک عذاب نازل ہوگا تم پر۔''

''ہٹ اماں! بیچ سے۔'' نوجوان بدتمیزی سے کہتا ہوا آگے بڑھا۔ ''مرے گی کیا؟''

''ارے کیا سوچ رہا ہے یار! مار بڑھیا کو۔'' پیچھے والے نے لقمہ دیا۔

''ہاں ہاں! چلاؤ گولی مجھ پر' تمہارے سامنے یہ مقدس کتاب ہے' ارے تم کیا جانو کیسا عذاب اترے گا تم پر..... تم سب کھڑے کھڑے جل جاؤ گے آج بھی تم جیسے درندوں کی درندگی اور بربریت کے باوجود یہ پاک کتاب معجزات دکھاتی ہے اندھو! چلاؤ گولی مارو مجھے' کر لو اپنی من مانی۔'' سلمٰی بیگم کا انداز انتہائی جارحانہ تھا کہ آگے بڑھتے بڑھتے اچانک نوجوان رک گیا' اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

''ارے یار! بکواس کرتی ہے بڑھیا..... تو آگے بڑھ۔'' پیچھے والے نے پھر آواز لگائی' آگے بڑھتا ہوا نوجوان یک لخت پلٹا اور اپنے ساتھی کو تھپڑ لگا دیا۔

''پاگل ہو گیا ہے کیا؟'' ساتھی حیرت اور غصے سے بولا۔

''ہاں..... ہاں..... میں پاگل ہو گیا ہوں..... پاگل کر دیا ہے مجھے اس پاک کتاب کی حرمت نے..... آنکھیں کھول دی ہیں میری۔'' وہ نوجوان پلٹا عجیب سی نظریں سب پر ڈالیں ان نظروں میں ندامت' پشیمانی اور جانے کیا کچھ تھا ہاتھ میں ٹکا پستول زمین پر پھینک کر

وہ تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف چلا گیا اس کی دیکھا دیکھی باقی نوجوان بھی باہر کی جانب بھاگے' اریشہ اور ارسلہ' دوڑ کر احد اور باسم سے لپٹ گئیں۔ سلمٰی بیگم جیسے خواب سے جاگیں وہ وہیں سوفے پر ڈھے سی گئیں اور ہاتھوں میں پکڑا قرآن پاک ٹیبل پر رکھ دیا اور اس پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگیں' سب لوگ جیسے بھیانک خواب سے جاگے ہوں۔ سلمٰی بیگم نے سر اٹھایا تو چاروں ان کے قدموں میں بیٹھے تھے۔

''دادو! آپ گریٹ ہو۔''

''سوری اماں..... پلیز اماں ہمیں معاف کر دیں۔'' چاروں بول رہے تھے' سب کے لہجے ٹوٹ رہے تھے۔ شرمندگی اور ندامت کا احساس نمایاں تھا۔

''اماں اگر آپ اس وقت قرآن پاک نہ پڑھ رہی ہوتیں تو.....'' اس سے آگے سوچ کر ہی ارسلہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اریشہ بھی بُری طرح رو رہی تھی۔

''سچ میں دادو! آج تو ہمیں اللہ یاد آ گیا۔'' باسم بھی دادو سے لپٹا بچے کی طرح بلک رہا تھا۔

''آپ بہت عظیم ہیں اماں!'' احد بھی شرمندگی سے بولا۔

''اگر آج ڈیڈی یا باسم کو خدانخواستہ کچھ ہو جاتا۔''

''اللہ نہ کرے اریشہ..... توبہ..... توبہ..... کیا نیوائر؟ کہاں کا فنکشن؟'' ارسلہ نے جھرجھری لے کر کہا۔

''یا اللہ! تیرا کرم ہے کہ ہم سب صحیح سلامت ہیں۔''

''اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرما!'' آج سے ہم نئی زندگی کی ابتداء کریں گے' ہم اس اللہ کو بھولنے لگے تھے جو ہمارا والی وارث ہے۔'' سب لوگ یک زبان ہو کر بولے تب ہی اذانِ فجر ہوئی تو سلمٰی بیگم نماز کے لیے اٹھنے لگیں۔

''اماں! ہم بھی آ رہے ہیں۔ میں اور اریشہ آپ کے ساتھ نماز فجر ادا کریں گے۔'' انہیں اٹھتا دیکھ کر ارسلہ نے دھیرے سے کہا۔

''اور دادو! میں آپ کے ساتھ قرآن پاک بھی پڑھوں گی فجر کے بعد۔'' ریشہ نے بھی کہا۔

''کیا؟'' سلمٰی بیگم نے بہو اور پھر پوتی کی جانب دیکھا۔

''جی اماں.....!'' ارسلہ نگاہیں جھکا کر آہستگی سے بولی۔

''چلو بیٹا! ہم بھی مسجد چلیں۔'' احد نے کہا تو باسم بھی کھڑا ہو گیا۔ سلمٰی بیگم نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا وہ بھی سر جھکائے نادم سا کھڑا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے اپنے رب سے وہ کس قدر گڑگڑا کر اپنی اولاد کی بھلائی کی بھیک مانگ رہی تھیں ایک خوف ناک واقعہ کی بدولت ہی سہی ان کی دعا کو شرفِ قبولیت عطا ہو گئی تھی۔

''یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تُو نے میری دعاؤں کی لاج رکھ لی۔ میرے آنسوؤں کا بھرم رکھا میرے ربّ تُو نے' آج میرے بچوں کو بھی سیدھی راہ دکھا دی۔'' یوں تو گزشتہ کئی سالوں سے نیوائر منایا جا رہا تھا لیکن اس بار آنے والے سال نے گویا ان کے گھر میں خوب صورت اجالے بکھیر دیئے تھے۔ جس کی چاہت گزشتہ کئی برسوں سے سلمٰی بیگم نے کی تھی' آج وہ ماحول مل گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی دائیں بائیں بہو اور پوتی کو لیے وہ خدا کے حضور سربسجود تھیں۔ جب کہ احد اور باسم نمازِ فجر ادا کرنے مسجد جا چکے تھے۔

نئے سال کا نیا سورج بہت ساری خوشیاں اور بہاریں لے کر ان کے آنگن میں اترا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

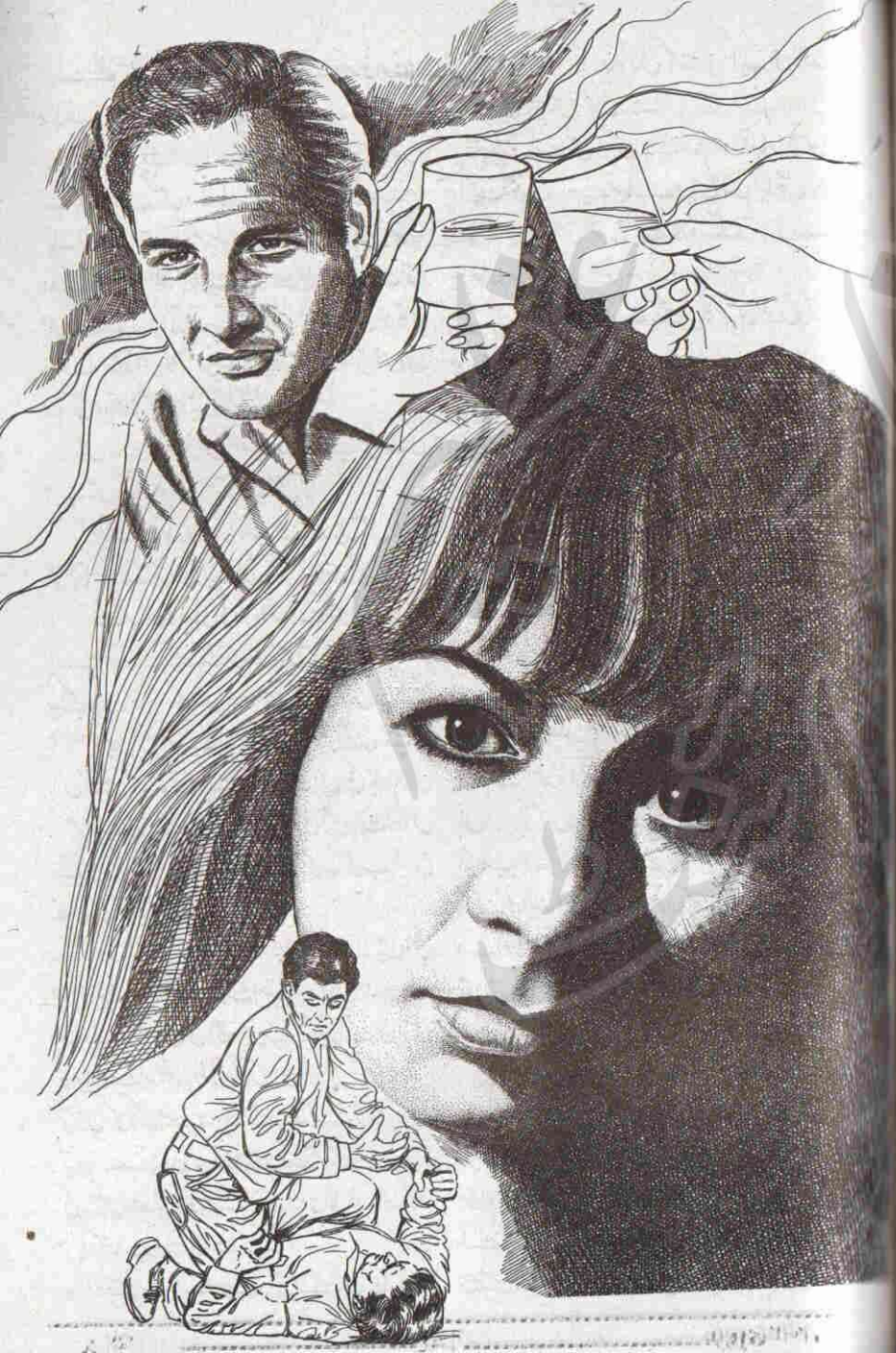

قسط نمبر 6

گردش

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

محبت کی روایتی تکون سے شروع ہونے والی یہ خونی داستان جوں جوں آگے بڑھتی ہے کہانی سے جڑے کرداروں کو کسی عفریت کی طرح نگلتی جاتی ہے۔ اس میں کرپٹ سیاست دانوں کی نقاب کشائی نہایت مہارت کے ساتھ کی گئی ہے کہ کیسے وہ وطن عزیز کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کہلانے والے مجبور و مقہور طبقے کے بنیادی حقوق کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔ گفتار کے یہ غازی کیسے عوام کو سبز باغ دکھا کر ان کی عزت و جان اور مال و متاع کے سودے وطن دشمنوں سے کرتے ہیں۔ اپنے مفادات کی خاطر کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ ان کے وعدے پانی پر کھینچی گئی لکیر کی طرح نا پائیدار ہوتے ہیں۔

اس طویل داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی دلکش و دلچسپ سلسلے وار کہانی

کمرے کے ماحول میں گمبھیر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

باس کے حکم پر مجھے ایک شخص کو قتل کرنا تھا' میں نے جذباتی ہو کر اپنی رضامندی کا اظہار کردیا تھا' جہاں میرا جواب سن کر باس کے چہرے پر مجھے فتح مندی دکھائی دی وہیں کنیز کے چہرے پر میں نے زلزلے کے آثار دیکھے تھے' باس اور دوسرے ساتھیوں کی موجودگی میں وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے خاموش رہی' مگر اس کے دل و دماغ میں کسی قسم کی ہلچل مچی ہوئی ہے' میں واضح طور پر محسوس کرسکتا تھا' جب کہ کوئی دوسرا اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔

باس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکال لیا اور اس میں سے ایک کاغذ اور ایک پاسپورٹ سائز تصویر نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس پر ساری تفصیلات لکھی ہیں اور یہ اس شخص کی تصویر ہے' جسے تمہیں اگلے جہاں روانہ کرنا ہے' بس یوں سمجھ لو کہ یہ بھی تمہارا ایک طرح کا ٹیسٹ ہے' ایک ٹیسٹ آج تمہارا ہوا' یہ دوسرا ٹیسٹ ہے اور مجھے تمہاری ذہانت اور تمہاری بہادری سے امید ہے کہ تم اپنے اس ٹیسٹ میں بھی شاندار طریقے سے کامیاب لوٹو گے۔''

میں نے اٹھ کر باس کے ہاتھ سے وہ پرچہ اور اس شخص کی تصویر لے لی' یہ ایک چالیس بیالیس سالہ صحت مند شخص کی تصویر تھی' اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں اور داڑھی تھی آنکھیں موٹی اور ابرو گھنے اور آپس میں جڑے ہوئے تھے' سر کے بال گھنے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑے تھے‘ شکل سے ہی وہ شخص خطرناک دکھائی دے رہا تھا۔

تصویر کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد میں نے کاغذ پر اس شخص کے بارے میں درج تفصیلات پر ایک نگاہ ڈالی‘ اس کا نام سلمان احمد عرف سلو بھائی تھا۔ وہ ایک ٹرانسپورٹر تھا اور ایک ٹرک کے اڈے کا مالک تھا‘ اس کے دس بارہ ٹرک پاکستان بھر میں ترسیل کا کام کرتے تھے‘ اس کا آفس ماری پور میں تھا لیکن اس کی رہائش نارتھ ناظم آباد میں تھی۔

میں نے سلو بھائی کی تصویر اور کاغذ اپنے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا اور خود اعتماد لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے باس.....! آپ بے فکر رہیں‘ میں اس کا کام تمام کر کے جلد ہی آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔“

”مجھے تم سے کامیابی کی ہی امید ہے لیکن ایک بات یاد رہے شہروز کہ مجھے ایک ہی دن میں یہ کام چاہیے اور تم یہ بھی جان لو..... کہ میں دوسرا موقع کبھی نہیں دیا کرتا‘ ناکام لوگوں کی میرے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ باس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی بار بار کی مسکراہٹ چڑانے والی لگتی تھی‘ خواہ کوئی بھی بات ہو‘ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ عجیب طرح کا انسان تھا یہ باس بھی۔

”اور ہاں.....!“ اس نے تنبیہہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔ ”یہ تمام کام نہایت احتیاط اور ہوش مندی سے ہونا چاہیے‘ تم کسی کی نگاہ میں نہ آؤ‘ یہی تمہاری اصل کامیابی ہے اور اگر بالفرض تم کسی کی نگاہ میں آ بھی جاؤ تو تمہیں کسی بھی صورت مجھ سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری کارکردگی میرے علم میں آ ہی جائے گی۔ میں بعد میں خود تم سے رابطہ کروں گا..... سمجھ گئے یا مزید سمجھانے کی ضرورت ہے۔“

”نہیں.....!“ میں نے قطعی لہجے میں جواب دیا‘ میں بھی بار بار کسی بات کو نہیں سمجھتا..... ایک ہی دفعہ بات میری سمجھ میں آ جاتی ہے۔“

”یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے اور تمہارا پلس پوائنٹ بھی..... ویسے تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے‘ تم اس کو کس طرح سے مارو گے۔“ باس نے پوچھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے مجھے یہ کام کس طرح کرنا چاہیے۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ فیصلہ تو تمہیں کرنا ہے‘ میں کیا بتاؤں؟“ باس نے دلچسپ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ میرے پاس کوئی ہتھیار تو ہے نہیں اس لیے سوچ رہا ہوں کہ اسے ایکسیڈنٹ میں مار دیتا ہوں۔“ میں نے کہا تو باس نے میری بات سن کر ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بولا۔

”میں تمہاری ذہانت سے کی گئی ڈیمانڈ سے متاثر ہوا ہوں۔ اسلحہ کی تم فکر نہ کرو تم جابر کے ساتھ چلے جاؤ‘ یہ تمہیں تمہارا مطلوبہ ہتھیار فراہم کر دے گا‘ ہمارے پاس ہر قسم کے اسلحہ کا ذخیرہ ہے‘ جو تم پسند کرو‘ لے لو..... اور ہاں.....!“ اس نے جابر کی جانب دیکھا اور اس سے مخاطب ہوا۔

”تم ایک دو ریوالور یا پستول جو یہ پسند کرے‘ اس کو دے دو..... تم اس کی بیک پر رہو گے‘ لیکن اس کے کام میں اس کی کسی بھی قسم کی مدد نہیں کرنا ہے۔“

”او کے باس.....!“ جابر نے مستعدی سے کہا۔

”ٹھیک ہے اب تم لوگ جاؤ‘ تم نے کراچی کا یہ علاقہ دیکھا ہوا ہے یا نہیں اگر نہیں تو جابر تمہاری رہنمائی کرے گا‘ یہ تمہیں سلو کا آفس اور رہائش گاہ‘ دونوں مقامات کو دکھا دے گا‘ پھر تمہیں خود فیصلہ کرنا ہے کہ اسے کہاں اور کس جگہ مارنا ہے‘ چوبیس گھنٹے..... صرف چوبیس گھنٹے.....!“ باس نے کہا۔

”او کے باس.....!“ اس مرتبہ میں نے بھی جابر کے انداز میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا‘ چلتے چلتے میں نے کنیز کی جانب ایک نگاہ ڈالی‘ اس کے چہرے پر ابھی بھی مجھے پریشانی دکھائی دے رہی تھی اس کے علاوہ دوسرے لوگ نارمل تھے‘ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کنیز اس بات کو لے کر پریشان کیوں ہے‘ کیا وہ مجھے اس فعل سے روکنا چاہتی ہے‘ مجھے کسی بات سے خبردار کرنا چاہتی ہے‘ یا پھر کوئی اور بات ہے‘ اگر میں گلشن اقبال والے فلیٹ پر واپس جاتا تو کنیز سے میری بات ہو جاتی اور میں اس سے اس کا سبب معلوم کرتا لیکن میرے پاس بہت کم ٹائم تھا‘ اور مجھے اپنا یہ ٹاسک مکمل کرنا تھا۔

سب کو اس جگہ بیٹھا چھوڑ کر میں جابر کے ساتھ اس کمرے سے نکل آیا‘ جابر مجھے لے کر دوبارہ بنگلے کے زمین دوز حصے کی جانب آیا‘ پہلے میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا‘ مگر اب اس کمرے کے علاوہ جہاں سلطان اور سنی باس کے شکاری کتوں کی خوراک بنے تھے‘ ایک اور کمرہ تھا‘ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک اور بنگلہ زمین دوز بنا ہوا تھا۔

یہاں آ کر چند گھنٹے پہلے کے وہ سارے دردناک مناظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے‘ کمرہ بالکل پہلے کی طرح صاف ستھرا تھا اور چند گھنٹے پہلے ہونے والی اس واردات کا کوئی نشان بھی یہاں باقی نہیں تھا‘ بلکہ ایک عجیب طرح کی بو یہاں پھیلی ہوئی تھی‘ شاید اس جگہ کو دھو کر یہاں جراثیم کش دوا کا اسپرے کیا گیا تھا۔

اندر مجھے چند لوگ اور دکھائی دیئے مگر کسی نے بھی میری اور جابر کی جانب کوئی توجہ نہیں دی ورنہ کسی اجنبی کو دیکھ کر انسان کی نگاہیں بے ساختہ اٹھ ہی جاتی ہیں‘ لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے ہماری جانب دیکھا تو ان سے کوئی بڑا جرم سرزد ہو جائے گا۔

یہیں ایک جانب میں نے شکاری کتوں کا وہ بڑا سا لوہے کا پنجرہ بھی دیکھا اس وقت وہاں شانتی چھائی ہوئی تھی‘ تینوں کتے پیٹ بھرنے کے بعد آنکھیں موندے مزے سے پنجرے میں لیٹے ہوئے تھے۔

جابر مجھے لے کر ایک اور کمرے میں آیا‘ یہاں قد آور الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ جابر نے ایک الماری کھولی تو میں نے دیکھا کہ یہاں ہر قسم کا اسلحہ موجود ہے‘ جابر نے ایک ریوالور نکال کر میرے حوالے کیا‘ جس پر مجھے سائلنسر نظر آ رہا تھا۔

”یہ لو..... تم یہ ریوالور رکھ لو‘ اس میں سائیلنسر لگا ہوا ہے‘ تم اس سے آرام سے اپنا کام کر سکتے ہو۔“ اس نے ریوالور میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا اور الٹ پلٹ کر اچھی طرح سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کا چیمبر کھول کر دیکھا وہ لوڈ تھا۔

”اسے اپنی شرٹ کے اندر لگا لو۔“ جابر نے کہا۔

میں نے جابر کی ہدایت پر ریوالور اپنی شرٹ کے اندر ایڈجسٹ کر لیا۔

”تم پریشان تو نہیں ہو۔“ جابر نے پوچھا۔

”قطعی نہیں!“ میں نے کہا۔

”ایک بات یاد رکھنا‘ باس بڑے دریا دل انسان ہیں‘ اگر تم اچھی طرح سے کام کرتے رہو گے تو وہ تمہارے کام سے خوش ہو کر ایک بہتر زندگی تمہیں عطا کریں گے‘ لڑکیاں‘ شراب‘ سب کچھ ملے گا اور پھر تم اپنے دشمنوں سے بھی بدلہ لے سکو گے۔“ جابر نے کہا۔

”مجھے نہ خوب صورت زندگی کی خواہش ہے اور نہ لڑکیوں اور شراب کی..... تم لوگوں کے ساتھ شامل ہونے کا میرا واحد مقصد صرف اور صرف اپنے دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”فرض کرو اگر تمہیں فوراً ہی اپنے دشمنوں کو ٹھکانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگانے کا موقع مل جاتا ہے تو پھر تم اس کے بعد کیا کرو گے' باس کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔'' جابر نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''ظاہر ہے پھر مجھے تم لوگوں کے ساتھ مل کر قتل وغارت گری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے احمقانہ انداز میں سچ بول دیا۔

میرا جواب سن کر جابر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا' وہ دیر تک ہنستا رہا اور وہ اس طرح سے ہنس رہا تھا جیسے میں نے اسے کوئی مزیدار لطیفہ سنایا ہو۔

''کیا ہوا..... اس طرح سے کیوں ہنس رہے ہو' میں نے کیا کوئی جوک سنایا ہے تمہیں۔'' میں نے حیرت سے کہا تو اس کی ہنسی کو ایک دم بریک لگ گیا اور وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''تم باس کی بات بھول گئے۔ یہاں آنے کے کئی راستے ہیں مگر واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے' کیا تم سلطان اور سنی کا انجام بھول گئے۔''

''کیا مطلب.....!'' میں نے بوکھلا کر کہا۔

''تم اتنے ہی معصوم اور بھولے ہو یا بننے کی اداکاری کر رہے ہو..... تم باس سے مل لیے' یہاں تک آ گئے..... بہت کچھ جان لیا..... اور اب واپسی کی بات کر رہے ہو.....'' اس نے اپنی آنکھوں کو میری آنکھوں میں گاڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں..... وہ میں.....!'' میں ہکلا کر رہ گیا۔

''تمہیں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے' سب ٹھیک ہو جائے گا' بس باس سے کبھی غداری اور یہاں سے واپسی کا کبھی مت سوچنا..... تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہے گا..... آؤ چلیں۔'' میرے پریشان ہو جانے پر جابر نے نرم لہجے میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا اور میں جابر کے ساتھ اس بنگلے سے ہی باہر آ گیا۔

واپس آتے ہوئے میرا ذہن مسلسل جابر کی باتوں میں الجھا ہوا تھا' بلکہ میں پریشان بھی ہو رہا تھا کہ میں اپنا انتقام لینے کے چکر میں کن لوگوں کے درمیان آ کر پھنس گیا ہوں' کیا ان لوگوں کا ساتھ حاصل کرنے کے لیے مجھے وہ سارے کرائمز کرنے پڑیں گے جو یہ لوگ کرتے ہیں اور پھر اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے بعد میں کیا بن کر دنیا کے سامنے آؤں گا' پھر مجھے جابر کی ڈھکی چھپی دھمکی یاد آنے لگی' یہ لوگ مجھے کسی حال میں بھی نہیں چھوڑیں گے' اگر انہیں ذرا بھی شک ہو گیا کہ میں صرف اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ان کے ساتھ ہوں' تو یہ لوگ ابھی میرا کام تمام کر دیں گے' چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے مجھے باس کا اعتماد جیتنا ہی ہو گا' بعد میں جیسا موقع ملے گا' دیکھوں گا۔

''کن سوچوں میں گم ہو۔'' جابر جو کار ڈرائیو کر رہا تھا' بہت دیر سے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا' بالآخر پوچھ ہی بیٹھا۔

''کچھ نہیں!'' میں نے ایک گہری سانس اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔ ''میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور خود کو پوری طرح تم لوگوں کے حوالے کر دیا ہے' میرے پاس کوئی چوائس ہی نہیں ہے کہ میں ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کروں یا باس کی کوئی بات ماننے سے انکار کروں۔ اگر میں ایسا کروں گا تو یہ بہت بڑی بے وقوفی ہو گی اور پھر مجھے اپنی اس بے وقوفی کی کڑی سزا بھی بھگتنا پڑے گی۔

''تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے' لیکن بس ایک بات یاد رکھنا باس صرف زبانی باتوں پر یقین نہیں رکھتے بلکہ قدم قدم پر تمہیں یہ بات عملی طور پر ثابت کرنا ہو گی۔'' جابر نے نرم لہجے میں کہا۔

اور پھر راستے میں ہم مزید ایسی ہی باتیں کرتے رہے' جابر کراچی کی تمام بڑی شاہراؤں کے بارے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے بتا رہا تھا' مختلف علاقوں میں کون کون سی شاہراؤں سے گزرنا پڑتا ہے' کچھ شارٹ کٹ رستے بھی اس نے مجھے بتائے' ویسے تو جعفر اور کلیم مجھے کافی کچھ دکھا اور بتا چکے تھے اور اب میں کراچی کے علاقوں اور سڑکوں سے اتنا انجان نہیں رہا تھا۔

جابر نے مجھے نارتھ ناظم آباد میں سلو بھائی کی رہائش گاہ دکھائی' پھر ماری پور میں اس کا آفس دکھایا۔

"تم فلیٹ چل کر کچھ دیر آرام کرنا چاہو تو واپس چلو' ریسٹ کرنے کے بعد آ جانا۔" جابر نے کہا۔

"ہاں چلئے' میں نہانا چاہتا ہوں تاکہ پوری طرح سے فریش ہو سکوں' پھر مجھے تنہا ہی تو سارے کام کرنے ہیں۔" میں نے کہا تو جابر نے کار کو گلشن اقبال کی جانب جانے والے روڈ پر موڑ لیا۔

فلیٹ پر میں اور جابر آئے تو معلوم ہوا کہ ابھی تک وہ لوگ واپس نہیں آئے ہیں۔ میں نے اس کا سبب جابر سے پوچھا تو وہ بولا۔ "ہو سکتا ہے باس نے انہیں بھی کوئی کام بتا دیا ہو' ویسے تم دوسروں کی کھوج میں زیادہ مت رہا کرو' کہ کون کہاں ہے' کیوں ہے' کیا کر رہا ہے' کہاں جا رہا ہے یہاں سب کو صرف اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے سے مطلب ہوتا ہے' تمہیں بھی یہی کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے' آئندہ تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" میں نے جواب دیا' پھر میں نے نیم گرم پانی سے اچھی طرح سے غسل کیا اور بلیک کافی پی کر پوری طرح چاق و چوبند ہو گیا' اب نہ تو مجھے کچھ کھانے کی حاجت تھی اور نہ ہی نیند کی' میں نان اسٹاپ چوبیس گھنٹے کام کر سکتا تھا۔

میں وہاں سے گاڑی لے کر نکلا اور سیدھا سلو بھائی کے آفس کی جانب آ گیا۔ میں نے اس جگہ سے قدرے فاصلے پر گاڑی روک دی۔ یہاں ادھر ادھر بہت سے ٹرک اور گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سلو بھائی کے دفتر کے علاوہ یہاں دوسرے ٹرانسپورٹرز کے دفاتر بھی موجود تھے اور دکانیں تھیں۔ لوگوں کا بھی کافی رش تھا۔

میں کار سے اتر آیا اور اسے لاک کر کے ٹرانسپورٹرز کے دفاتر اور دکانوں پر آویزاں بورڈ پر نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ مجھے دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ مجھے کسی خاص دکان یا دفتر کی تلاش ہے۔

تب ہی نہ جانے کیوں میں نے یوں ہی گردن گھما کر دیکھ لیا' حالانکہ اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی' غالباً میری چھٹی حس نے مجھے اس بات کا احساس دلایا تھا' میں نے ایک جھلک جابر کی دیکھی تھی' وہ تیزی کے ساتھ وہاں کھڑی ایک گاڑی کے پیچھے ہو گیا' لیکن میں اسے دیکھ چکا تھا' اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا' جس کی شکل میری نا آشنا تھی۔ مجھے باس کی بات یاد آئی' اس نے جابر کو ہدایت کی تھی کہ شہروز کی بیک پر رہنا لیکن مدد مت کرنا' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ میرے کام کی نگرانی کر رہا ہو کہ میں کس طرح کام انجام دیتا ہوں۔

میں دکانوں اور دفتروں کے بورڈ پر نگاہ ڈالتا ہوا سلو بھائی کے دفتر کے سامنے رک گیا۔ میں نے شیشے کی دیوار کے پار دیکھا اندر کرسیوں پر کئی لوگ بیٹھے تھے' لیکن میری نگاہ اپنے شکار کو تلاش کر رہی تھی' پھر میں نے اسے دیکھ بھی لیا اور پہچان بھی لیا' بڑی سی میز کے پیچھے ایک کرسی پر وہی بیٹھا تھا' اس کا حلیہ ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ اسے پہچاننا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

میں بس چند لمحے ہی اس کے دفتر کے سامنے رکا تھا اور ان چند لمحوں میں' میں نے سلو بھائی کی موجودگی کا یقین کر لیا تھا کہ وہ اس وقت اپنے آفس میں موجود ہے' مجھے اسے کہیں اور تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر میں اس طرح سے اس کے آفس کے سامنے سے ہٹ گیا کہ جیسے مجھے کسی اور کی تلاش ہے' سلو بھائی

کے آفس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک چائے کا ہوٹل تھا' میں بے پروائی سے چلتا ہوا' ہوٹل کے باہر بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ میرے علاوہ دوسری کرسیوں پر اور بھی بہت سے لوگ بیٹھے تھے' ہوٹل کے بیرے نے جیسے ہی مجھے دیکھا وہ لپک کر آرڈر لینے میرے پاس آیا تو میں نے اس سے ایک چائے لانے کا کہہ دیا۔

یہاں بیٹھ کر میں غیر محسوس انداز میں ادھر ادھر گردن گھما کر لوگوں کو دیکھنے لگا' لیکن دراصل میں جابر کو دیکھ رہا تھا کہ وہ اب کس جگہ موجود ہے' لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا' اس نے یقیناً مجھے گردن موڑتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا' اس لیے اس نے اپنے آپ کو میری نگاہوں سے چھپا لیا' یہ لوگ ابھی تک مجھے ایک احمق اور بودا آدمی تصور کر رہے تھے جو میں نہیں تھا' وہ کسی محفوظ جگہ سے مسلسل میرا جائزہ لے رہا ہوگا' میں اس کی موجودگی سے واقف ہو گیا تھا۔

پانچ منٹ سے بھی کم عرصہ میں بیرا میرے لیے گرم گرم چائے لے کر آ گیا۔ میں نے چائے پی کر بل ادا کیا اور اٹھ کھڑا ہوا' میں ایک بار پھر سلو بھائی کے آفس کے سامنے پہنچ گیا۔ میں نے شیشے کی دیوار کے پار سلو بھائی کو دیکھ لیا تھا' وہ میز کی دوسری جانب کرسی پر بیٹھے شخص سے باتوں میں مصروف تھا۔ میں ذرا نمایاں ہو کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا' کیونکہ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ لے' اور پھر ایسا ہی ہوا' بات کرتے کرتے اس کی نگاہ میرے اوپر پڑی تو میں نے اسے آنکھ سے اشارہ کیا۔

مجھے ایسا کرتے دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے اور وہ چونک پڑا' پھر اس کے چہرے پر الجھن کے آثار دکھائی دینے لگے' وہ مجھ سے واقف نہیں تھا' میری ذات اس کے لیے بالکل اجنبی تھی' ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی تھے' وہ یہ سوچ رہا ہوگا کہ میں کون ہوں اور میں نے اسے آنکھ سے کیوں اشارہ کیا ہے' اس سے پہلے کہ سلو بھائی کے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے تاثرات دیکھ کر سامنے بیٹھا ہوا شخص پیچھے مڑ کر دیکھتا' میں نے باہر بورڈ پر لکھا ہوا سلو بھائی کے آفس کا نمبر ذہن نشین کیا اور تیزی کے ساتھ چلتا ہوا اپنی کار میں آ کر بیٹھ گیا۔

کار میں بیٹھ کر میں نے عقبی آئینے پر نگاہ ڈالی تو سلو بھائی کسی شخص کے ساتھ آفس کے باہر کھڑا ہوا دکھائی دیا' وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔

میں نے تیزی کے ساتھ اپنی کار وہاں سے نکالی اور بھگانے لگا' میں دراصل جابر کو چکمہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

کار کو تیزی سے دوڑاتے ہوئے میں بار بار بیک مرر میں دیکھ رہا تھا کہ جابر کی کار تو میرے پیچھے نہیں آ رہی لیکن جابر مجھے اپنے تعاقب میں آتا ہوا دکھائی نہیں دیا' میں مطمئن ہو گیا اور اپنی کار ایک پبلک کال آفس کے سامنے روک دی' میں کار سے اتر کر اندر آیا' اس طرف زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے' میں نے اندر جا کر ایک بار پھر باہر کا جائزہ لیا کہ شاید جابر کہیں سے نکل کر آ گیا ہو' مگر مجھے جابر دکھائی نہیں دیا' البتہ ایک بائیک والا آ کر وہاں رک گیا' شاید اسے بھی کسی کو کال کرنی تھی' وہ بائیک سے اتر کر میرے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا' میں نے اس شخص پر نگاہ ڈالی' اس کے کندھے سے ایک کیمرہ لٹکا ہوا تھا' وہ بے پروا انداز میں سگریٹ نکال کے سلگا کے کش لینے لگا' اس کی نگاہیں روڈ پر آتی جاتی گاڑیوں پر تھیں۔

اس جانب سے مطمئن ہو کر میں نے سلو بھائی کے آفس کا نمبر ذہن میں دہرایا پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ملا دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نمبر ملتے ہی گھنٹی بجنے لگی' تین چار گھنٹیاں بجنے کے بعد کسی نے فون ریسیو کیا اور ایک بھاری سی آواز سنائی دی۔

"ہالو..... کون بولتا اے!"

میں سمجھ گیا کہ یہ سلو بھائی ہی کی آواز ہے' اس لیے میں نے اپنی آواز اور لہجے میں بے چینی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"سلو بھائی بول رہے ہیں!"

"ہا..... ام بولتی اے..... تم کون.....؟"

"سلو بھائی ابھی آپ کے آفس سے باہر ایک لڑکے نے آپ کو آنکھ ماری تھی' میں وہی لڑکا ہوں۔" میں نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔

"ہا..... یاد آیا..... تم نے ام کو آنکھ کیوں مارا..... کیا چاہتی ہے اے تم.....؟" اس نے کچھ اور سمجھتے ہوئے ترنگ میں آتے ہوئے کہا۔

"سلو بھائی آپ کی جان کو خطرہ ہے..... کسی نے آپ کو جان سے مارنے کی سپاری لی ہے۔ میں آپ کو اس شخص کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ یہ بات کسی کو بھی بتائے بغیر فوراً وہاں سے نکلیں.....!" میں نے اس سے بھی زیادہ تیزی سے کہا۔

"کیا بکتی اے تم..... کون اے وہ.....!" اس نے ناقابل بیان گالی دیتے ہوئے غصے سے کہا۔

"وہ سب میں آپ کو ملنے پر بتاؤں گا' بلکہ بہت کچھ بتانا ہے۔ بس آپ دیر مت کریں اور فوراً چلے آئیں۔" میں نے بے قرار لہجے میں کہا۔

"اوئے تم ام کو ابی بتاؤ یار ام خود اس کا سپاری دے گی..... سلو بھائی کو مارنا اتنا آسان بات نہیں اے۔"

"میں اس وقت ہی تو نہیں بتا سکتا۔ میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے' اگر آپ کو اپنی جان پیاری ہے تو فوراً وہاں سے نکلیں۔ وہ شخص تمہارے آفس کے آس پاس ہے۔" میں نے کہا۔

"یار تم ام کو پریشان مریشان مت کرو..... اس کا نام بتاؤ' ام پھر سوچے گا....." اس نے گومگو کی کیفیت میں پریشان کن لہجے میں کہا۔

"میرے ذہن میں ایک اور ٹرانسپورٹر کے آفس کے باہر بورڈ پر لکھا نام آ گیا اور میں نے بلا سوچے سمجھے وہ لے دیا۔

"دیکھیں سلو بھائی ابھی آپ خاموش رہنا' کوئی کارروائی مت کرنا' میں اس شرط پر اس کا نام آپ کو بتاؤں گا۔"

"ہاہاام وعدہ کرتی اے ابی کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ تم اس خبیث کا بچہ کا نام بولو.....!" اس نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اس کا نام حاجی غلام حسین ہے۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوئے خدائی خوار..... اوخبیث امارے کو مارنا چاتی اے..... ام سمجھ گئی اے وہ ایسا کیو کر رہی اے..... ابی ام تم سے آ کر ملتی ہے' ساری بات سنتی اے پر اس سے بات کرے گی..... لیکن تم امارہ پاس کیوں نہیں آتی..... ادھر آ جاؤ آرام سے بیٹھ کر بات کرے گی۔" وہ اب بھی آنے میں ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

"نہیں سلو بھائی میں ادھر نہیں آ سکتا' ادھر وہ میرا ساتھی گھوم رہا ہے' اگر اس نے مجھے تم سے بات کرتے ہوئے دیکھ لیا تو میں مارا جاؤں گا' بچو گے تم پھر بھی نہیں۔" میں نے زچ ہونے والے انداز میں کہا۔

"آ چا تم ام کو اک بات بولو..... تم ام کو کیوں بچانا چاہتی اے!" اس نے آخری بار اپنا اطمینان کرنا چاہا۔

"بات یہ ہے سلو بھائی کہ تم میرے کچھ نہیں لگتے

اور نہ ہی یہ کام میں تمہاری محبت اور ہمدردی میں کر رہا ہوں۔ میں حاجی غلام حسین کا پالتو کتا ہوں اور وہ اتنا کمینہ آدمی ہے کہ جانوروں کی طرح کام لینے کے بعد پیسہ بھی نہیں دیتا' بلکہ الٹی سیدھی دھمکیاں دیتا ہے' میں نے اتفاق سے چھپ کر اس کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ اس نے کچھ ایسا چکر چلایا ہے کہ تمہیں مارنے کے بعد وہ تمہارا سارا کاروبار اپنے قبضے میں کر لے گا' بس تم فوراً آ جاؤ تاکہ میں تمہیں تفصیل سے ساری بات بتا دوں۔"

"لیکن ام باہر نکلے گی تو وہ ام کو مارے گی۔" اس نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے سلو بھائی' میں تو صرف تمہارے لیے اتنا ہی کر سکتا تھا' اب تم مرنا ہی چاہتے ہو تو خوشی سے مر جاؤ' مجھے کیا..... وہ ایک ہینڈ گرینڈ تمہارے آفس میں مارے گا اور تمہارا کام تمام ہو جائے گا۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"او خانہ خراب کا بچہ ام کیا کرے کدر جائے..... ام آتی ہوں..... تم ام کو جگہ بتاؤ..... ام پچھلے دروازے سے باہر نکلے گی۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"یہ ٹھیک رہے گا اور ہاں یاد رہے سلو بھائی ابھی یہ بات کسی کو نہیں بتانی ہے' میں تمہیں ساری بات بتا دوں پھر تم بعد میں فیصلہ کرنا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ابی بتاؤ ام کدر آوے.....!" اس نے پوچھا تو میں نے سرجانی ٹاؤن میں بننے والی ایک ادھوری عمارت کے بارے میں بتا دیا' یہ ایک چھ منزلہ عمارت بن رہی تھی' اس کا اسٹرکچر کھڑا تھا اور کام بند ہو گیا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچ رہا ہے۔

اس سے بات کرنے کے بعد میں سیدھا سرجانی ٹاؤن کی جانب تیزی سے گاڑی بھگاتا ہوا جا رہا تھا۔

وہاں پہنچ کر میں نے کار باہر پارک کی اور اوپر ایک محفوظ جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا' میری نگاہیں عمارت کے گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔

میرے پہنچنے کے دس منٹ بعد ہی مجھے دور سے ایک بلیک کرولا آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ میری گاڑی کے برابر میں رک گئی' چند لمحوں بعد اس میں سے سلو بھائی باہر نکلا' اس نے میری گاڑی کے اندر جھانک کر دیکھا..... وہ سمجھ رہا ہو گا کہ شاید میں اپنی گاڑی کے اندر بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہا ہوں لیکن مجھے اندر نہ پا کر اس کے چہرے پر الجھن کے آثار دکھائی دیئے' وہ چند لمحوں تک کھڑا کچھ سوچتا رہا۔

میں سمجھ گیا کہ سلو بھائی خاصا سمجھدار آدمی ہے' وہ مشکل سے ہی کسی پہ بھروسہ کرتا ہے۔

وہ اس ویران اور سنسان جگہ پر تنہا آ تو گیا تھا لیکن اب اندر آتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ ٹائم برباد کر رہا ہے' میں اپنا کام مکمل کر کے جلد از جلد یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا' اس لیے میں نے اسے آواز دی۔

"سلو بھائی اندر آ جائیں۔"

اس نے آواز کی سمت تیزی سے گھوم کر دیکھا تو میں نے سامنے آ کر ہاتھ ہلایا اور اسے اوپر بلایا۔

میرے اوپر اس کی نگاہ پڑی تو وہ اندر آنے لگا' جتنی دیر میں وہ اوپر آیا میں پوری طرح الرٹ ہو کر کھڑا ہو گیا اور دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔

سلو بھائی سیڑھیاں چڑھتا ہوا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا اوپر آ رہا تھا' پھر قدموں کی آہٹ بالکل نزدیک آ گئی اور سلو بھائی اندر داخل ہو گیا۔ میرے لیے بس اتنا ہی کافی تھا' سلو بھائی میرے نشانے پر مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا' اس کی پشت میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانب تھی۔

"کدرائے تم.....!" اس نے اندر داخل ہو کر کہا اور جواب میں میرے ریوالور سے شعلے نکلے اور سلو بھائی اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔

میں نے اپنی تسلی کے لیے مزید دو فائر اس کی پشت پر اور ایک کھوپڑی پر کیا اگلے ہی لمحے میں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے جا رہا تھا' نیچے اتر کر میں نے ریوالور اندر اپنی شرٹ میں سیٹ کر لیا اور اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

راستے میں میں نارمل رفتار میں ڈرائیونگ کرنے لگا کہ کہیں تیز رفتاری دیکھ کر ٹریفک پولیس مجھے روک نہ لے۔

راستے میں ٹریفک جام ضرور ملا' مگر اس کے علاوہ اور کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں باآسانی اپنے فلیٹ پر پہنچ گیا۔

میں جیسا چھوڑ کر گیا تھا' فلیٹ ویسا ہی تھا' ابھی تک کوئی بھی واپس نہیں آیا تھا۔ البتہ جابر مجھے فلیٹ میں مل گیا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرانے لگا۔ "کیا ہوا تمہیں پتہ چل گیا۔" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"کس بات کا؟" اس نے سوال کیا۔

"یہی کہ میں نے اپنا کام کامیابی کے ساتھ مکمل کر لیا ہے۔" میں نے سابقہ لہجے میں کہا۔

"ہوں.....!" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور باس کو بھی تمہارے اس کارنامے کی اطلاع مل چکی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ان کی کال تمہارے پاس آ جائے گی۔"

میں نے جابر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور سیدھا اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر یوں لیٹ گیا جیسے طویل سفر کر کے آیا ہوں۔

"تو تم ایک مسیحا سے قاتل بن گئے..... اور بھی نہ جانے تمہارے ہاتھوں کتنے بے گناہ مارے جانے والے ہیں.....!" میرے اندر سے کوئی چیخ چیخ کر نفرت انگیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"کوئی بے گناہ نہیں ہے اس نے یقیناً کوئی نہ کوئی گناہ ضرور کیا ہوگا۔ اسے اس کی سزا ملی ہے۔" میں نے اپنے اندر سے چیخنے والے انسان سے کہا۔

میری یہ جنگ اور بھی نہ جانے کتنی دیر جاری رہتی کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی' میں نے نمبر دیکھا تو وہ ان نون نمبر تھا' میں نے محتاط ہو کر فون رسیو کرنے کا بٹن دبا دیا اور کان سے لگا کر دھیمی آواز میں کہا۔

"یس.....!"

"ویل ڈن شہروز..... تم نے انتہائی عقل مندی اور مہارت سے پلان کیا اور اس پر عمل بھی کر ڈالا۔" میرے کانوں میں باس کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"لیکن آپ کو میری پلاننگ کا کیسے پتہ چلا' ابھی تو میں نے کسی کو کچھ بتایا بھی نہیں۔" میں نے حیرت سے کہا۔ میری بات سن کر اس نے ایک اونچا قہقہہ لگایا اور بولا۔

"میری کئی آنکھیں اور کان ہیں۔ جنہیں میں سوتے وقت بھی کھلا رکھتا ہوں۔ ویل تمہارا انعام ابھی تھوڑی دیر میں تم تک پہنچ جائے گا' جو چاہو عیاشی کرو..... پھر ملاقات ہوگی۔"

یہ کہہ کر باس نے فون بند کر دیا اور میں نے فون بند کر کے بیڈ پر پٹخ دیا' نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اتر آیا۔

میں تیزی سے اٹھا اور باتھ روم میں جا کر صابن سے رگڑ رگڑ کر اپنے ہاتھوں کو دھونے لگا۔ میں لاشعوری

طور پر سلو بھائی کا بے گناہ خون اپنے ہاتھوں سے دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر غیر ارادی طور پر میں نے وضو کیا اور میں باہر نکل آیا۔

میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ یہ گناہ کبیرہ کیا تھا' اس لیے دل پر بہت بوجھ محسوس کر رہا تھا' یہ صحیح ہے کہ اپنوں کی جدائی نے میرے دل میں انگارے بھر دیئے تھے' لیکن میں صرف ان لوگوں کو مارنا چاہتا تھا جو میرے گناہ گار تھے۔ دوسروں سے میرا کیا لینا دینا تھا لیکن اس جوش انتقام میں' میں بہت بڑے کرمنل گروہ کے ہتھے چڑھ گیا تھا' آگے اب یہ لوگ مجھ سے اور بھی نہ جانے کیا کیا کام کروانے والے تھے۔

میں لاؤنج میں آ کر صوفے پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ میرا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دوسرے صوفے پر مجھ سے قدرے فاصلے پر جابر اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف تھا۔

"جب پہلی دفعہ اپنے ہاتھوں سے کوئی انسانی جان لیتا ہے تو اس کی ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔ انسان اپنے اندر اپنے فعل پر بڑی ندامت محسوس کرتا ہے' لیکن پھر بعد میں وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور اس دنیا کا یہی دستور ہے پیارے۔ یہاں ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو اپنی خوراک اپنا حق سمجھ کر نگل جاتی ہے۔ دنیا کا کاروبار اسی طرح چل رہا ہے تم بھی اب کچھ مت سوچو' جو ہو گیا سو ہو گیا۔ سمجھو رات گئی بات گئی۔ ویسے باس تمہاری کارکردگی سے بہت زیادہ خوش ہیں۔" جابر نے مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر کہا۔ میں خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگا اور اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"کچھ کھالو' تم نے کب سے کھانا نہیں کھایا ہے' اب تو رات کے کھانے کا بھی ٹائم ہو گیا ہے۔" جابر دوبارہ بولا۔

"مجھے بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ریلیکس ہو جاؤ یار..... بس ابھی وہ سب یہاں پہنچنے والے ہیں۔ پھر سب مل کر ساتھ کھانا کھائیں گے۔" جابر نے میرے قریب آ کر کہا اور کچن کی جانب چلا گیا۔ جہاں ہمارا کک کھانا تیار کر رہا تھا۔

اور تب ہی وہ سب بھی آ گئے' سب سے پہلے مینا نے میری تعریف کی اور بولی۔

"واہ! شہروز تم نے تو باس کا دل ہی جیت لیا' وہ تم سے بہت زیادہ خوش ہیں اور یہ انہوں نے تمہارا انعام پہنچایا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک براؤن لفافہ نکال کر میری جانب بڑھا دیا' میں نے نیم دلی سے لفافہ تھام لیا اور ٹیبل پر رکھ دیا۔

"دیکھو گے نہیں کہ باس نے کتنا بڑا انعام دیا ہے۔" مینا نے کہا۔

"بعد میں دیکھوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہاری مرضی' لگتا ہے تم خوش نہیں ہو۔" وہ بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"جو کام میں کر کے آیا ہوں' وہ بھی کوئی خوش ہونے والا کام ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"میں کام کی نہیں' معاوضے کی بات کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔

"میرا خیال ہے کہ فی الحال ہمیں شہروز کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔" کنیز نے مینا سے کہا تو اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ کندھے اچکا کر اندر جانے لگی' اتنے میں جابر آ گیا اور اس نے مینا کو آواز دی تو وہ رک گئی۔

"یار مینا ہم لوگ ڈنر کر کے نکلتے ہیں۔ ورنہ کل صبح بھی تو جانا ہے۔" جابر نے کہا۔

"آج رات رک جاتے ہیں' کل صبح چلیں گے۔" مینا نے جواب دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”نہیں باس نے ایک دو کام بتائے ہیں۔ ابھی نکلیں گے تو تین چار گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے پھر ساری رات کا آرام بھی مل جائے گا‘ کل صبح فریش ہوں گے۔“ جابر نے قطعی لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔“ مینا نے نیم دلی سے رضامندی ظاہر کردی۔

”یار شاکر جلدی سے کھانا لگاؤ‘ ہمیں ابھی نکلنا ہے۔“ جابر نے ملازم کو آواز دے کر کہا۔

ڈنر سے فارغ ہو کر مینا اور جابر نکلنے لگے تو مینا میرے پاس آئی اور دھیمے لہجے میں بولی۔

”میں نے تو سوچا تھا کہ آج تمہاری کامیابی کو سب مل کر منائیں گے‘ لیکن یہ جابر کا بچہ ہمیشہ میرے پیچھے پڑ جاتا ہے‘ عاجز آچکی ہوں میں اس سے......!“

”اچھا!“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”میں تو سمجھتا ہوں کہ جابر تمہارا بہت اچھا دوست ہے اور شاید تم دونوں ایک دوسرے کو دل سے پسند بھی کرتے ہو۔“

”میں نہیں‘ صرف جابر...... یہ معاملہ یک طرفہ ہے۔ میری بہت بڑی مجبوری ہے کہ میں اس کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوں۔“ اس نے دور کھڑے جابر پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا جو فون پر کسی سے باتیں کررہا تھا۔

”مجھے تو آج یہ بات پتا چلی ہے۔“ میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”جابر فون پر بات کرچکا تو اس نے فون جیب میں رکھتے ہوئے مینا کو آواز دی اور سب کو بائے کہتا ہوا فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے کنیز‘ جعفر یا کلیم میں سے کسی نے بھی مجھ سے اس قتل کے بارے میں نہیں پوچھا کہ میں نے کس طرح وہ کام کیا‘ اس کی دو ہی وجوہ میری سمجھ میں آئیں کہ یا تو انہیں ساری بات معلوم ہوچکی ہے‘ کیونکہ جابر مجھے واچ کررہا تھا‘ اسی نے باس کو اور ان سب کو بتایا ہوگا‘ یا پھر کسی کو ایک دوسرے سے اس طرح کی بات کرنے یا کھوج لگانے کی اجازت نہیں ہے۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے وضو کیا اور عشاء کی نماز ادا کی اور اللہ سے رو رو کر اپنے گناہ کی معافی مانگی تو میرے دل کا کچھ بوجھ کم ہوا‘ کسی بات کو گناہ جانتے ہوئے بھی جب آپ اس گناہ پر عمل کر بیٹھتے ہیں تو آپ کے اندر بیٹھا اچھا انسان‘ جو ہر شخص میں موجود ہوتا ہے‘ آپ پر لعنت ملامت کرتا رہتا ہے۔

نماز سے فارغ ہو کر میں بیڈ پر لیٹ گیا‘ میری آنکھوں میں دور دور تک نیند کا شائبہ تک نہیں تھا‘ آج کا دن میری زندگی کا نہایت ہنگامہ پرور دن تھا‘ پہلے باس کے گلشن معمار والے بنگلے میں سلطان اور سنی کی دردناک موت کا منظر اور پھر سلو بھائی کا میرے ہاتھوں قتل......

یہ سارے مناظر کسی فلم کی ریل کی مانند بار بار میری آنکھوں کے سامنے گردش کررہے تھے۔

اچانک ہی میرے کمرے کا دروازہ بڑی آہستگی کے ساتھ کھلا اور کوئی اندر آیا۔

”کون ہے؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”میں ہوں کنیز......! جاگ رہے ہو؟“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

”ہاں! آجاؤ‘ مگر پہلے لائٹ آن کردو۔“ میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا تو کنیز نے لائٹ آن کردی۔

”مجھے یقین تھا کہ تم سوئے نہیں ہوگے جاگ رہے ہوگے۔“ اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں تھوڑی دیر قبل بھی آئی تھی لیکن تم نماز پڑھ رہے تھے اس لیے میں واپس لوٹ گئی‘ تم نماز بھی پڑھتے ہو......“ اس نے حیرت اور مسرت سے کہا۔

”ہاں پڑھ ہی لیتا ہوں۔“ میں نے ندامت بھرے

لہجے میں کہا۔

”تم جیسا انسان یہاں کیسے پھنس گیا۔ تم وہ سارے کام کس طرح سے کرسکو گے جو باس تم سے لیں گے۔“ کنیز نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

”بعض اوقات انسان جذبات میں اندھا ہو کر بہت زیادہ غلط فیصلے کرجاتا ہے اور ساری عمر اپنے غلط فیصلوں کا خمیازہ بھگتتا رہتا ہے۔ جب ہی اللہ تعالیٰ نے ”صبر“ کی جزا جنت رکھی ہے۔ کیونکہ یہ ایک بہت مشکل کام ہے‘ ہم اللہ پر کچھ نہیں چھوڑتے‘ سب کچھ خود ہی کرلینا چاہتے ہیں۔ تو پھر ایسے گڑھوں میں بھی گرجاتے ہیں۔“ میں نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”پچھتا رہے ہو؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا تو میں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلادیا۔

”یہاں ایسا ہی ہوتا ہے‘ کوئی خوشی سے اس جانب آتا ہے تو کوئی مجبوری میں‘ لیکن خوش کوئی بھی نہیں ہوتا۔“ اس نے اپنی ہتھیلی کھول کر اپنی نگاہیں اپنی خالی ہتھیلی پر جماتے ہوئے کہا۔

”ایک بات بتاؤ کنیز!“ میں نے کہا تو وہ چونک کر میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”آج صبح جب باس نے مجھ سے سلو بھائی کے قتل کی بات کی تو میں نے تمہیں ایک دم پریشان ہوتے ہوئے دیکھا تھا‘ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا‘ جیسے تم ایسا نہیں چاہتیں‘ جیسے تم مجھے یہ کام کرنے سے روکنا چاہتی ہو مگر تم کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں‘ ایسا کیوں تھا کنیز‘ اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔“ میں نے پوچھا تو وہ چند لمحوں تک میری جانب تکتی رہی‘ پھر تیزی سے اٹھی اور دروازے کی جانب بڑھی‘ میں اس کے اس طرح اچانک اٹھ کر جانے پر عجیب سا ہوگیا‘ کہ میں نے ایسی بھی کیا بات پوچھ لی کہ کنیز اٹھ کر جارہی ہے۔

مگر کنیز نے ایک قدم دروازے سے باہر جھانکا پھر اندر آ کر دروازہ بند کرکے لاک کردیا اور لائٹ آف کرکے نائٹ بلب آن کردیا‘ اور دوبارہ بیڈ پر آ بیٹھی‘ میں اسے ایسا کرتے دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ میں اس قماش کا انسان نہیں تھا‘ آج تک میں نے ایک چھت کے تلے کسی بھی عورت کے ساتھ رات نہیں گزاری تھی۔ آخر یہ کیا چاہتی ہے مجھ سے......!

”یہ تم کیا کررہی ہو کنیز...... دروازہ کھولو......اور پلیز لائٹ آن کرو۔“ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا تو وہ بولی۔

”تم جو کچھ سمجھ رہے ہو‘ ایسا کچھ نہیں ہے‘ تم نے مجھ سے جو سوال کیا ہے‘ میں اس کا جواب دینا چاہتی ہوں۔“ اس نے خجالت آمیز دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”تم جواب پہلے بھی دے سکتی تھیں‘ اس کے لیے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

”ضرورت ہے۔“ اس نے زور دے کر کہا۔

”کیونکہ تم ابھی تک بہت سی باتوں سے ناواقف ہو۔ تمہیں یاد ہے‘ باس نے کہا تھا کہ میری کئی آنکھیں اور کان ہیں۔ میں ان آنکھوں اور کانوں کو بند کررہی ہوں۔ یہاں کمرے بند کرکے ساتھ سونے پر پابندی نہیں ہے‘ سوائے ہر بات کے‘ آؤ تم بھی لیٹ جاؤ۔ مجھے تمہیں بہت ضروری باتیں بتانی ہیں۔“ اس نے میرے بالکل قریب آ کر سرگوشی میں مجھ سے کہا اور میرا ہاتھ تھام کر خود لیٹ کر مجھے اپنے قریب لٹادیا۔

کسی بھی عورت کا اتنا قرب میں پہلی مرتبہ محسوس کررہا تھا‘ اس لیے مجھے پسینا آنے لگا اور میں غیر محسوس طریقے سے اس سے ذرا دور کھسک گیا۔

”دور جانے کی حماقت مت کرو‘ اس کمرے میں خفیہ کیمرہ اور اسپیکر مائیک لگا ہوا ہے۔ میں تمہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہارے قریب ہو کر ہی وہ باتیں بتا سکتی ہوں۔" اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ کر لیا۔

میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا' کنیز نے سختی کے ساتھ میرا بازو تھام رکھا تھا۔

"بس..... پلیز کنیز..... مجھ سے دور ہٹ جاؤ۔" میں نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ کنیز کے ہاتھ پر رکھ کر اس سے اپنا بازو چھڑانا چاہا۔

"میں جو بات تمہیں بتانے والی ہوں' اسے سن کر تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔ اور تم یہ بات بھول جاؤ گے کہ ایک جوان لڑکی تمہارے پاس تمہارے بیڈ پر لیٹی ہے۔" کنیز نے دانتوں کو بھینچ کر سرگوشی میں کہا تو میں چونک پڑا' اور کہا۔

"کک..... کیسی بات.....؟"

"تم کہہ رہے تھے ناں کہ میں کیوں پریشان ہو رہی تھی اور کیوں نہیں چاہ رہی تھی کہ تم ایسا کرو' اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں' میں نہیں چاہتی تھی کہ تم یہ کام کرو..... کیونکہ میں جانتی تھی کہ سلو بھائی کا قتل تمہیں پوری طرح پھانسنے کی پلاننگ تھا' باس ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے' وہ تمہارا ٹیسٹ لینے کے بہانے تمہارے جرم کو کیمرے میں منتقل کر کے تمہیں ہمیشہ بلیک میل کرتا رہے گا' دلبر سے تمہاری فائٹنگ کی فوٹو گراف بھی اس کے پاس محفوظ ہیں' جنہیں کیمرہ ٹرک کے ذریعے' کسی بھی دوسرے ہلاک ہونے والے شخص کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے گا' اور سلو بھائی کی ڈیڈ باڈی کی تصویر اور تمہاری تصویر بھی اس کے پاس پہنچ گئی ہے' جس میں تم اسے فائر کر کے مار رہے ہو۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے' وہاں تو میں تنہا تھا.....!" یہ کہتے ہوئے میں بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر فوراً ہی کنیز نے عجیب سی حرکت کی اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سینے پر رکھتے ہوئے مجھے دھکا دے کر بیڈ پر گرا یا اور میرے اوپر اوندھی لیٹ گئی' اور بولی۔

"پلیز شہروز چند لمحے خاموشی سے میری بات سنو..... ہمیں یہ سب دکھانا ضروری ہے' ہمیں کیمرے سے دیکھا جا رہا ہے' بس میں ابھی اٹھ کر یہاں سے اس کا بٹن آف کر دوں گی' ہمیں واچ کرنے والے سمجھ جائیں گے کہ آگے کا سین ہم انہیں دکھانا نہیں چاہتے۔"

کنیز کی بات سن کر ساری بات میری سمجھ میں آ گئی' اور میں نے اپنے بازو کنیز کی کمر کے گرد کس کر کروٹ لی اور کنیز میرے نیچے دب گئی' وہ فوراً ہی تڑپ کر میرے نیچے سے نکلی اور دیوار پر لگی فینسی کی جانب بڑھی اور ہاتھ بڑھا کر وہاں لگا کیمرے کا خفیہ بٹن آف کر دیا' پھر بیڈ پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میں بھی اٹھ کر تیزی سے واش روم کی جانب بھاگا اور واش بیسن کا نل کھول کر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اپنے منہ پر مارنے لگا' میں اس وقت ایک بہت بڑے امتحان سے گزرا تھا' اللہ کا شکر ہوا کہ میں اپنے حواس کنٹرول کرنے میں کامیاب رہا۔

میں تولیہ سے چہرہ خشک کر کے باہر آیا تو کنیز نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم سوری شہروز مجھے یہ ڈرامہ کرنا پڑا' اب وہ لوگ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ اب ہم آرام سے گفتگو کر سکتے ہیں۔"

"جاؤ تم بھی ہاتھ منہ دھو کر آ جاؤ۔" میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خجالت سے مسکراتی ہوئی واش روم چلی گئی' ہاتھ منہ دھو کر آئی اور بولی۔

"باس نے تمہارے پیچھے جابر اور دوسرے بندے کو بھیجا تھا' وہ ایک ماہر فوٹو گرافر ہے' اس نے غیر محسوس

طریقے سے تمہارا پیچھا کیا اور اس خالی عمارت میں پہنچ گیا۔ جس وقت تم نے سلو بھائی پر گولیاں چلائیں اس نے خفیہ طریقے سے تمہاری ویڈیو بنالی ہے۔ تمہارے جانے کے بعد وہ اس عمارت سے نکلا اور سیدھا باس کے بنگلے پر پہنچا اور تمہاری ویڈیو باس کے حوالے کر دی۔ اب اگر آئندہ تم نے باس کے کسی بھی کام سے انکار کیا تو باس تمہاری یہ ویڈیو تمہیں دکھا کر بلیک میل کرے گا۔ ہم سب کی بہت سی کمزوریاں اس کے پاس ہیں۔" کنیز نے بتایا تو میرے منہ سے بے ساختہ باس کے لیے گالی نکل گئی۔ میں اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا' جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا' میں نے سوچا کہ آج موقع ملا ہے تو باس کے دوسرے رازوں کے بارے میں بھی کنیز سے معلوم کر سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے پوچھا۔

"کیا میں تم سے دوستانہ انداز میں کچھ پوچھ سکتا ہوں۔"

"پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم مجھے اپنا دوست تسلیم بھی کرتے ہو یا نہیں۔" اس نے پوچھا۔

"یہ تو تم بتاؤ گی' میں تو ابھی تم لوگوں میں شامل ہوا ہوں۔ یہاں بہت سے سربستہ راز ہیں جن کے بارے میں میں جاننا چاہتا ہوں لیکن کوئی ایسا نہیں جو مجھے ان کے بارے میں بتائے۔" میں نے کہا۔

"میں نے ابھی جو بات تمہیں بتائی ہے کیا وہ بات یہ سمجھانے کے لیے کافی نہیں کہ میں دل سے تمہیں اپنا دوست مانتی ہوں اور تمہیں پسند کرتی ہوں۔" اس نے عجیب سی نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں اس بات کے لیے تمہارا بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے خبردار کیا' اب تھوڑی مہربانی اور کر دو اور مجھے یہ بتاؤ کہ باس کے دھندے کیا کیا ہیں' اس کے کتنے کارندے ہیں' کہاں کہاں ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ارے باپ رے باپ کہیں تم خفیہ پولیس کے آدمی تو نہیں ہو۔ جو اس طرح کی انفارمیشن مانگ رہے ہو۔" اس نے دھیرے سے ہنستے ہوئے خوف زدہ ہونے کی ایکٹنگ کی۔

"اگر خفیہ پولیس کا بندہ ہوتا تو باس کے کہنے پر ایک جرم اپنے کھاتے میں کم از کم نہیں ڈالتا' میں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہی حقیقت ہے' باقی کچھ نہیں' شاید میرا کبھی ایسے لوگوں سے دور دور تک واسطہ نہیں پڑا شاید اسی لیے میں ان لوگوں میں شامل ہونے کی سنگین غلطی کر بیٹھا۔" میں نے کہا تو کنیز میری بات پر یقین کرتے ہوئے سر ہلانے لگی۔ پھر بولی۔

"باس کے ایک نہیں بہت سے بڑے دھندے ہیں۔ اور میں بھی اتنا ہی جانتی ہوں جتنا آج تک میرے علم میں آ سکا ہے' ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو۔"

"پھر بھی مجھے بھی تو کچھ پتا چلے' میں اب تم لوگوں کا ساتھی ہوں پھر مجھ سے کیوں چھپایا جا رہا ہے۔" میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

"ناراض کیوں ہو رہے ہو' تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے یہ سارا ڈرامہ کس لیے کیا ہے' صرف اس لیے کہ میں تم سے ڈھیر ساری باتیں کر سکوں' وہ سب باتیں جو میں دوسروں کے سامنے نہیں کر سکتی' میں چاہتی ہوں کہ تمہیں بھی ساری باتیں پتا چل جائیں اور تم اندھیرے میں نہ رہو' تم سے جب کسی بھی کام کے کرنے کے لیے کہا جائے تو تم اس کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار رہو۔" اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے غیر محسوس طریقے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے کھینچ لیا۔ اور اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا' کنیز نے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات کو محسوس کرلیا کہ میں نے فوراً ہی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا ہے' اس کے چہرے پر خجالت آمیز مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے اپنی نگاہیں جھکالیں' اور اس طرح مسکراتی ہوئی نمکین حسن سے مزین کنیز بہت پیاری لگی' مگر اس پیاری لگنے میں میرے دل کا کوئی جذبہ شامل نہیں تھا۔

''اب بتاؤ بھی۔'' میں نے کہا تو وہ بولی۔

''باس کا سب سے خطرناک کام انسانی اعضاء کی اسمگلنگ ہے۔.....'' اتنا کہہ کر وہ رک گئی اور مجھے دیکھنے لگی۔

''واٹ!'' میرے منہ سے تیز آواز میں نکل گیا۔

''ہش.....!'' اس نے منہ پر انگلی رکھ کر مجھے دھیمی آواز میں بولنے کے لیے کہا وہ بھی مجھ سے سرگوشی میں بات کررہی تھی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو کنیز.....! انسانی اعضاء کی اسمگلنگ..... تمہارا مطلب ہے کہ یہ شخص گردے اسمگل کرتا ہے۔'' میں نے شدید حیرت سے سرگوشی میں کہا تو کنیز نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلادیا۔

''تمہیں مینا سے اپنی پہلی ملاقات تو اچھی طرح سے یاد ہوگی۔ تمہاری ملاقات ہاسپٹل میں ہی ہوئی تھی ناں..... مینا نے نرسنگ کا کورس کیا ہوا ہے' بعض ہاسپٹلز میں یہ لوگ بے ضمیر اور دولت کے پجاری ڈاکٹرز کو اپنے ساتھ ملا کر یہ گھناؤنا جرم کرتے ہیں۔ اس وقت بھی مینا اسی سلسلے میں اس ہاسپٹل میں موجود تھی۔ سلطان کے بہنوئی کے ساتھ جب زیادتی ہوئی اور اس کے اپنڈکس کا آپریشن کرنے کے بجائے اس کے دونوں گردے نکال لیے گئے اور بعد میں میڈیکل سرٹیفکیٹ میں لکھ دیا گیا کہ اپینڈکس پھٹ گیا' جس کی وجہ سے موت واقع ہوگئی۔ تب ہی تو وہ باغی ہوا تھا' اس نے اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دے دی۔ مینا تو فوراً ہی غائب ہوگئی' مگر ڈاکٹر گرفتار ہوگیا بعد میں اس ڈاکٹر کو بے قصور ثابت کرکے رہائی دلوانے میں باس کا خاصا پیسہ خرچ ہوا تھا۔

اس کے علاوہ ایکسیڈنٹ میں مرنے والے لوگ جن کے وارث نہیں ہوتے' ان کی آنکھیں نکال لی جاتی ہیں۔ یہ قبیح فعل خفیہ طریقے سے بہت عرصے سے جاری ہے۔''

''اوہ میرے اللہ!'' میں نے اپنا سر تھام لیا۔

''تم نے ابھی سے اپنا سر تھام لیا' ابھی آگے سنو..... ابھی تو بہت کچھ ہے۔'' کنیز نے کہا۔

''ہاں بتاؤ!'' میں نے اپنے ماتھے پر تیزی سے نمودار ہونے والے پسینے کے ننھے منے قطروں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''منشیات اور اسلحہ کی اسمگلنگ کے علاوہ یہ لوگ جوان لڑکیوں کو بھی بیرون ملک بھیجتے ہیں۔ جن میں متحدہ عرب امارات کے علاوہ امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں بھی لڑکیاں بھیجی جاتی ہیں' تھائی لینڈ اور بنکاک میں بھی پاکستانی لڑکیاں ہی بدکار لوگوں کی تسکین کا باعث بنتی ہیں۔ راجا سے تم ملے ہی ہو۔ وہ اسی سلسلے میں آیا ہوا ہے' اسے مزید لڑکیاں چاہئیں' ان لڑکیوں کو ملازمت کا جھانسا دے کر بھیجا جاتا ہے۔

باس کا ایک اور دھندہ اغوا برائے تاوان کا ہے' لیکن یہاں اس طرح سے اغواء کیا جاتا ہے کہ اغواء ہونے والا بڑی خوشی سے اغواء ہوجاتا ہے اور اسے پتا بھی نہیں چلتا' بعض اوقات یہ بندہ بھی مار دیتے ہیں اور تاوان بھی وصول لیتے ہیں۔'' کنیز بتا رہی تھی اور میں دم بخود سن رہا تھا۔

''اغواء کیسے کرتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ کام بھی نوجوان اور خوب صورت لڑکیوں سے ہی لیا جاتا ہے۔ یہ لڑکیاں امیر گھرانوں کے کم عمر

لڑکوں کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا لیتی ہیں' بعض اوقات یہ فون پر دوستی کرتی ہیں' پھر جب لڑکے کی آتش شوق بھڑک جاتی ہے تو اسے کہیں ملنے کے لیے بلاتی ہیں اور لڑکا اغواء ہوجاتا ہے اور اگر لڑکی پہلے لڑکے سے ملاقاتیں کرتی رہتی ہے تو ایک روز اسے بھڑکا کر ''محبت کی تکمیل'' کے عمل سے گزرنے کے لیے کسی جگہ بلاتی ہے پھر اسے اغواء کرلیا جاتا ہے لیکن چونکہ لڑکا اس لڑکی کی پہچان کا ہوتا ہے' اس لیے تاوان وصول کرنے کے بعد لڑکے کو قتل کرکے پھینک دیا جاتا ہے۔''

''تم کیا کام کرتی ہو۔'' میں نے پوچھا تو کنیز خاموش ہوگئی۔

''بتاؤ ناں تم خاموش کیوں ہوگئیں۔'' میں نے کہا۔

''میں بہت سے کام کرتی ہوں' میں شروع میں اغواء برائے تاوان کے لیے کام کرتی تھی' اب بقول باس کے کہ میں نوعمر لڑکوں کے لیے کشش کا باعث نہیں رہی' لیکن ہوس زدہ بوڑھے کھوسٹوں کی تو اب بھی مجھے دیکھ کر رال ٹپک پڑتی ہے' باس کو اپنے بہت سے کام نکلوانے ہوتے ہیں تو باس انہیں میرے جسم کی تگڑی رشوت دیتے ہیں۔ خاص طور پر پولیس کے اعلیٰ افسران کو..... گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدیداران کو بیورو کریٹس کو..... اس کے علاوہ میں کبھی کبھی اسمگلروں کے گروپ میں بھی شامل ہوتی ہوں۔'' کنیز نے کہا اور گردن جھکالی' اس نے جس طرح اپنے برے اعمال کا میرے سامنے اعتراف کیا تھا تو نگاہیں تو جھکنا ہی تھیں۔

میں نے بھی اپنی نگاہیں جھکالیں' میری ہمت بھی نہیں تھی کہ اس سے نگاہ ملاسکوں۔

جب بہت دیر تک اس کا جھکا ہوا سر اوپر نہیں اٹھا تو میں نے اس کا سر اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''ارے..... تم رو رہی ہو.....!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''میری تقدیر میں اب اپنی آخری سانس تک رونا ہی لکھا ہے' جس طرح آج تم نے ایک گناہ کرکے اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوکر نماز پڑھ کر اپنے رب سے اپنے گناہ کی معافی مانگی' اسی طرح میں بھی ہر رات روتی ہوں' لیکن دل کا بوجھ ہلکا ہی نہیں ہوتا۔''

''اگر یہ سب کرنا تمہیں اچھا نہیں لگتا تو یہ کام شروع ہی کیوں کیا تھا۔ آئی مین تم ان کے چکر میں کیسے پھنس گئیں۔'' میں نے پوچھا۔

''لوگ سارا الزام اپنے نصیبوں کو دے دیتے ہیں کہ ہمارا نصیب ہی خراب تھا کہ ہمارے ساتھ برا ہوا ہے' مگر میں کہتی ہوں کہ ہمارا دماغ ہی خراب تھا' ہماری سوچ اور ہمارا رویہ ہی خراب تھا تو ہمارے ساتھ برا ہوا' اپنے لیے میں یہی کہوں گی کہ نصیب خراب نہیں تھا' میں نے خود اپنا نصیب بگاڑا ہے۔ اور ان برے لوگوں میں پھنس گئی' برائی کی اس دلدل میں پھنس کر اگر میں نکلنا بھی چاہوں تو کبھی نہیں نکل پاؤں گی۔'' اس نے کہا اور وہ پھر رونے لگی۔

''اچھا چلو آج تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ..... اپنے گھر اور گھر والوں کے بارے میں بتاؤ اور یہاں تک تم کیسے اور کن ذریعوں سے پہنچی' میں تمہارے بارے میں اس لیے بھی جاننا چاہتا ہوں کہ تم بنیادی طور پر مجھے ایک اچھی لڑکی لگی ہو۔ تم میں اور مینا میں بہت فرق ہے' لگتا ہے' اس نے دل سے ان حالات اور ان لوگوں کو قبول کرلیا ہے' وہ مجھے مطمئن دکھائی دیتی ہے۔'' میں نے کہا تو وہ افسردگی سے نفی میں سر ہلانے لگی پھر غمگین لہجے میں بولی۔

''عورت چاہے جو بھی ہو' بے غیرتی کی زندگی گزارنا اپنی مرضی سے قبول نہیں کرتی' کچھ وقت اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حالات اور معاشرتی مجبوریاں ہوتی ہیں اور بہت دفعہ عورت اپنی کسی غلطی کے خمیازے کے طور پر ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔"

"ہوسکتا ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو ویسے اللہ کا شکر ہے کہ میری اٹھائیس سالہ زندگی میں ایسی عورتوں سے واسطہ پہلی مرتبہ پڑا ہے ورنہ آج تک تو میں نے اپنی ماں جس نے اپنے گاؤں سے باہر کی زندگی دیکھی ہی نہیں اور اس جیسی بہت سی عورتوں کو دیکھا ہے جن کے لیے حالات خواہ کیسے بھی بدتر کیوں نہ ہوں اپنے شوہر یا باپ اور بھائیوں کی دہلیز سے مر کر ہی نکلتی ہیں۔" میں نے کہا تو اس نے شاکی نگاہوں سے میری جانب دیکھا میں سمجھ گیا کہ اس کی نگاہوں میں یہ شکوہ کیوں ہے اس لیے جلدی سے کہا۔

"تم اپنے بارے میں کچھ بتانے والی تھیں۔ چلو اپنے والدین کے گھر سے شروع کرو۔"

اس نے ایک طویل سانس لے کر بہت سی ہوا اپنے اندر اتاری پھر وہ بولنا شروع ہوئی اور بولتی رہی میں نے درمیان میں اسے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی وہ جیسے پوری طرح اپنے ماضی میں ڈوب چکی تھی ایک خواب کی سی کیفیت میں مسلسل بولتی جا رہی تھی اور پھر تمام رات ہی گزر گئی ہم یوں ہی آمنے سامنے بیٹھے رہے۔ اس نے اپنی کہانی ختم کی اور بولی۔ "اب تم میرے بارے میں کیا کہتے ہو.....؟"

"میں کیا کہوں..... ابھی تک تو میں خود کو تمہاری کہانی کے سحر سے آزاد نہیں کر پایا ہوں اس بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے فی الحال تو مجھے نیند آ رہی ہے۔" میں نے نیند کے خمار سے آنے والی جمائی کو منہ پر ہاتھ رکھ کر روکتے ہوئے کہا۔

"اچھا.....!" اس نے ایک بار پھر گہری سانس لی اور اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

"میں کیمرے کا بٹن آن کر کے اپنے کمرے میں جا رہی ہوں اب تم سو جاؤ..... بس یاد رکھنا کہ یہ ہمیشہ آن ہی رہتا ہے۔"

"ہاں میں اس بات کو یاد رکھوں گا۔" میں نے کہا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ بیڈ پر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب میرے روم سے گئی۔

میں دوپہر تک سوتا رہا اور کسی نے بھی مجھے ڈسٹرب نہیں کیا۔ دوپہر ایک بجے میری آنکھ کھلی تو میں غسل کرنے گیا۔ باہر آیا تو میں تولیہ سے اپنے بال خشک کرنے لگا پہلے میرے بال چھوٹے تھے مگر اب میں نے اپنے بال بڑھا لیے تھے۔ میرے بال کندھوں پر آتے تھے اور میں درمیان سے مانگ نکال کر انہیں دو حصوں میں تقسیم کر لیا کرتا تھا بالکل لڑکیوں کی طرح۔ میں نے چہرے پر گھنی داڑھی اور مونچھیں رکھی ہوئی تھیں جن سے میرا اصلی چہرہ کافی حد تک چھپ گیا تھا لیکن جب میں سلو بھائی کے قتل کے ارادے سے گیا تھا تب جابر نے مجھے ایک عدد وگ فراہم کر دی تھی جو مکرانیوں کی طرح گھنگریالے چھوٹے بالوں کی تھی آنکھوں پر باریک کمانی کا فریم تھا کیونکہ بڑے بالوں کی وجہ سے میری شناخت میں آسانی ہو سکتی تھی۔

میں انہی سوچوں میں دوسری جانب نکل گیا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں غسل کر کے بالوں کو تولیہ سے خشک کر رہا تھا تب ہی اکرم چائے کا کپ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اور میری جانب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے بولا۔

"آج تو آپ بڑی دیر تک سوتے رہے.....!"

"ہاں رات کو دیر سے نیند آئی تھی۔" میں نے اس کے لبوں میں دبی مسکراہٹ کی معنی خیزی کو اہمیت دیئے بغیر کہا۔

"کیوں نیند کیوں نہیں آئی خیریت۔" اس نے سابقہ انداز میں کہا۔

"تم سے مطلب!" میں نے ناگوار لہجے میں کہا۔

"نہیں میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا وہ اپنی کنیز بی بی بھی ابھی سو کر اٹھی ہے۔" اس نے سر کھجاتے ہوئے اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔

"اکرم تم صرف اپنے کام سے کام رکھا کرو..... تمہیں دوسروں کی ٹوہ لینے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"مجھے اپنی ساری ڈیوٹیز کے بارے میں اچھی طرح سے علم ہے اور میں وہی پوری کر رہا ہوں۔" اس نے کہا اور چھپاک سے کمرے سے نکل گیا۔

میں اس کا جملہ سن کر چونک پڑا..... اور سمجھ گیا کہ اکرم یہاں محض کام کرنے والا ایک ملازم ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ڈیوٹی میں ہم سب کی نگرانی بھی شامل ہے ورنہ محض ایک ملازم اتنی جرات کبھی نہیں کرتا جو بات اس نے معنی خیز انداز میں مجھ سے کہی تھی۔

میں باہر آیا تو جعفر اور کلیم دونوں موجود نہیں تھے کنیز بھی تیار ہو کر کہیں جا رہی تھی مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ "میں اپنی ڈیوٹی پہ جا رہی ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ کہاں اور کس کام سے جا رہی ہے میں نے مزید اس سے کچھ بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ میں بالکل فارغ تھا۔ فی الحال میرے ذمہ کوئی اور کام نہیں لگایا گیا تھا میں نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کر کے نیوز چینل لگا دیا اس خبر کے لیے مجھے تھوڑا انتظار کرنا پڑا جو خبر میں دیکھنا چاہتا تھا۔

سلو بھائی کے قتل کی خبر آ گئی تھی نیوز کاسٹر نے یہ بھی بتایا کہ ٹرانسپورٹر سلو بھائی کے قتل کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں اور انہوں نے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ اگلے تین روز میں اگر قاتل کا سراغ نہ لگایا گیا تو صوبے بھر میں پہیہ جام ہڑتال کی جائے گی۔ مقامی پولیس قاتل کی تلاش میں سرگرداں ہے امید ہے بہت جلد اہم شواہد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

میں نے مسکراتے ہوئے ٹی وی آف کر دیا میں اپنے ملک کی پولیس سے اچھی طرح سے واقف تھا یہاں روز کا یہی معمول ہے آئے دن لوگ مرتے ہیں جگہ جگہ سے لاشیں ملتی ہیں مگر نامعلوم قاتل کے خلاف مقدمہ درج کیا جاتا ہے اور چند روز بعد فائل بند کر دی جاتی ہے البتہ اگر قاتل سامنے بھی ہو اور پولیس کی جیب گرم کر دی جائے تب بھی پولیس اس کی جانب سے اپنی آنکھیں بند ہی رکھتی ہے اور باس قزلباش آغا کے بقول پولیس میں بہت سے پالتو کتے شامل ہیں جنہیں اپنے ملک اور عوام کے مفاد سے زیادہ اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔

اس ملک میں جرائم کے پنپنے کی ایک بڑی وجہ ہمارا پولیس ڈیپارٹمنٹ بھی ہے یہ مجرموں کی بیخ کنی کے بجائے انہیں تحفظ فراہم کرتی ہے عام شہری ان سے ڈرتے ہیں اور مجرم دندناتے ہوئے دھڑلے سے جرم کرتے پھرتے ہیں۔

کنیز نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ آغا قزلباش کے تعلقات بہت ہائی لیول تک ہیں۔ سیاسی لیڈر تک اس کے دوستوں میں شامل ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے کاروبار میں کوئی سیاسی لیڈر کوئی وزیر بھی در پردہ شامل ہو۔

اب اس کے بارے میں اتنی ساری باتیں سننے کے بعد میں اس بات سے بالکل بے فکر تھا کہ پولیس سلو بھائی کے قاتل تک پہنچ پائے گی۔

ساری باتیں سوچتے سوچتے میرا دماغ کنیز کی اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہانی کی جانب چلا گیا اور میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا تھا۔

"میں ملتان کی رہنے والی ہوں' وہیں میری پیدائش ہوئی' ہم چار بہنیں اور دو بھائی تھے' والد کی ٹمبر مارکیٹ میں ذاتی دکان تھی۔ حالات بہت اچھے نہیں تو خراب بھی نہیں تھے۔ بس اچھا گزارہ ہو جاتا تھا' ہم چاروں بہنیں بڑی اور دونوں بھائی چھوٹے تھے۔

اتفاق کی بات ہے کہ میری والدہ اور تینوں بہنیں خوب گوری چٹی تھیں۔ بھائی بھی گورے تھے لیکن چونکہ ابا کا رنگ سانولا تھا اس لیے بدقسمتی سے میرا رنگ بھی سانولا رہا۔

لوگ جب ہم سب بہن بھائیوں کو دیکھتے تو میں انہیں الگ ہی نظر آتی اور بچپن ہی سے میں ایک ہی بات سنتی آئی تھی کہ ربیعہ (میرا اصلی نام) تو اس گھر کی لگتی ہی نہیں' اس کا رنگ کالا کیوں ہے' یہ تو تم سب کے درمیان نظر کا ٹیکا لگتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی باتیں سنتے سنتے میں جوان ہوگئی اور میرے اندر شدید کمپلیس پیدا ہوگیا۔ میں لوگوں کے سامنے آنے سے گھبرانے لگی۔ باہر والے تو الگ خود میری بہنیں اور امی بھی مجھ سے مذاق میں بار بار یہی بات کہتیں کہ "ربیعہ تو ہمارے گھر پیدا ہی نہیں ہوئی' کسی اور کی اولاد ہے۔" بس ایک ابا ہی تھے کہ اگر ان کے سامنے یہ لوگ بات کرتے تو وہ مجھے پیار سے گلے لگا کر کہتے "ربیعہ تو ابا کے جگر کا ٹکڑا ہے۔"

میں زیادہ تر خاموش رہنے لگی' ساری بہنیں شوخ رنگ کے لباس پہنتیں اور میرے لیے ہلکے رنگوں کا انتخاب کیا جاتا تھا' ایک مرتبہ مجھے ایک اورنج کلر کا لباس پسند آیا اور میں نے اسے لینا چاہا تو بہنوں نے یہ کہہ کر میرا مذاق اڑایا کہ "اگر تم یہ رنگ پہنو گی تو سب تمہیں بن بتوڑی کہیں گے۔"

اس دن میں بہت روئی اور کھانا بھی نہیں کھایا' ابا جب شام کو گھر آئے تو میں کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ ابا نے وجہ پوچھی تو امی نے بتایا کہ بہنوں نے کس وجہ سے میرا مذاق اڑایا ہے تو ابا اندر کمرے میں آئے اور کہا۔

"میں اپنی بیٹی کے لیے اسی کلر کا سوٹ لاؤں گا' میری بیٹی اسے پہن کر پری لگے گی۔ ذرا اس کے نین نقش دیکھو تم سب سے زیادہ اچھے ہیں۔ تم لوگوں کے پاس تو صرف گورا رنگ ہے۔ میری ربیعہ کی آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں۔"

پھر ابا میرے لیے ہلکے اورنج کلر کا کامدار سوٹ لے آئے اور ان ہی کی ضد پر میں نے اسے سلوا بھی لیا۔ اتفاق سے میری کالج فیلو کی بہن کی شادی آ گئی' تو ابا کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں وہی سوٹ پہن کر چلی گئی' میں دل میں تھوڑا تھوڑا ڈر بھی رہی تھی اور چور نگاہوں سے دوسروں کی جانب دیکھ رہی تھی کہ کہیں کسی کی آنکھوں میں میرے لیے تمسخرانہ ہنسی تو نہیں ہے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا' بلکہ میری دوست نے میری تعریف کی اور مجھے سراہا کہ شکر ہے تم نے آسمانی اور پنک کلر کا پیچھا تو چھوڑا۔

وہیں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ دو آنکھیں مسلسل مجھے اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا وہ ایک ہینڈسم اور اسمارٹ لڑکا تھا اور مجھے گھورے جا رہا تھا۔ میں کنفیوز ہو رہی تھی کہ آخر اتنا ہینڈسم لڑکا مجھے کیوں گھورے جا رہا ہے۔

کھانا شروع ہوا تو میں اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا کھانا نکال کر ایک طرف کھڑے ہو کر کھانے لگی' تب میں نے اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔

اسے اپنی جانب آتا ہوا دیکھ کر میرے ہاتھ کپکپانے لگے اور اتنے کپکپائے کہ جیسے ہی وہ میرے

نزدیک آیا میرے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر گر پڑی' نیچے گرتے ہی کانچ کی پلیٹ ٹوٹ گئی۔ اب تو میرا گھبراہٹ سے برا حال ہوگیا۔ وہ میرے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا' پھر نرم لہجے میں بولا۔

"کیا ہوا.....؟ آپ اتنی پریشان کیوں ہیں' ایک پلیٹ ہی تو ٹوٹی ہے شادیوں میں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"وہ میں..... وہ میں.....!" مارے گھبراہٹ کے میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ پائی اور اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر پسینہ صاف کرنے لگی تو اس نے اپنی جیب سے ٹشو کا منی پیکٹ نکال کر اس میں سے ٹشو پیپر نکال کر میری جانب بڑھا دیا' جو میں نے جھجکتے ہوئے لے لیا۔

فوراً ہی وہ دوسری پلیٹ میں بریانی ڈال کر لے آیا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا میں آپ کا تعارف حاصل کر سکتا ہوں۔" پھر خود ہی بولا۔ "میں دولہن کے بھائی زمان کا دوست راحیل ہوں۔ آپ کے اوپر نگاہ پڑی تو جیسے ہٹنا ہی بھول گئی۔ معاف کیجیے گا میں بہت صاف گو اور جھٹ بات کو کہہ دینے والا ہوں' مجھے آج تک کوئی لڑکی اتنی اچھی نہیں لگی کہ اسے دیکھتے رہنے کو دل چاہے۔ آج کل کے ماڈرن زمانے میں آپ جیسی شرمیلی اور حیا دار لڑکیاں اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔" اس نے مجھے نثار ہونے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی.....!" میں نے شدید حیرت سے کہا۔ "ان کپڑوں میں بھی..... میرا مطلب ہے اس کلر کے لباس میں بھی۔" مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس کلر کو پہننے پر میری بہنوں نے مجھے بن بتوڑی کا خطاب دیا تھا' اسی لباس میں ایک اسمارٹ اور ہینڈسم لڑکا مجھے سراہا بھی سکتا ہے۔

"جی ہاں آپ کو لباس پہننے کا سلیقہ بھی ہے اور آپ کی کلر چوائس بھی بہت اعلیٰ ہے' یقین کیجیے یہ کلر آپ پر بہت سوٹ کر رہا ہے۔" اس نے ایک نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لیکن میں تو سانولی ہوں..... پھر آپ کو کیسے اچھی لگی؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"آپ کا سارا حسن ہی آپ کا سانولا پن ہے' بہت نمکین ہیں آپ..... اور نمکین سے انسان کا دل کبھی نہیں بھرتا۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں بری طرح شرما گئی' میرے ہاتھ ایک بار پھر کانپنے لگے۔

"شاید آپ کو میری باتیں بری لگی ہیں۔" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"نن..... نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا پھر جھینپ گئی' مجھ سے زندگی میں کبھی کسی نے اس طرح سے بات نہیں کی تھی' میری تعریف نہیں کی تھی' اس اجنبی لڑکے نے میری اتنی تعریف کی تو میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

"میں آپ سے دوبارہ ملنا چاہوں گا۔ کیا آپ مجھ سے بات کرنا پسند کریں گی۔" اس نے پوچھا تو میں نے سر جھکا لیا۔

اتنے میں میں نے حمیدہ کے بھائی زمان کو اس طرف آتے دیکھا تو اس نے جلدی سے ایک کارڈ نکالا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"زمان اسی طرف آ رہا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اسے یہ بات پتا چلے کہ میں نے آپ سے بات کی ہے۔ آپ میرا کارڈ رکھ لیں۔ اگر دل چاہے تو فون کر لیجیے گا۔ میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا اور ہاں مجھے یقین ہے آپ حمیدہ سے میرا ذکر نہیں کریں گی۔" اس نے میرے ہاتھ میں کارڈ تھمایا اور تیزی سے دوسری جانب بڑھ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شادی سے آنے کے بعد اس رات میں سو نہیں سکی' ساری رات راحیل کی باتیں میرے دماغ میں گونجتی رہیں' میں جو آج تک اپنے آپ کو دنیا کی بدصورت ترین لڑکی سمجھتی رہی تھی' آج خوش قسمت تصور کر رہی تھی مجھے یہ سوچ کر بہت اچھا لگ رہا تھا کہ کوئی مجھے بھی پسند کر سکتا ہے' ورنہ راحیل جیسے اسمارٹ لڑکے پر تو کوئی بھی حسین لڑکی فدا ہو سکتی ہے۔ پھر وہ میری جانب ہی کیوں آیا' اس نے وہ سب مجھ سے کیوں کہا.....!

دو تین دن گزر گئے..... میں اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ اب مجھے اپنی بہنوں کا چھیڑنا بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔

وہ ہفتے کی رات تھی' صبح سب کی چھٹی تھی' سب ہی رات دیر تک جاگتے رہے تھے' تینوں بہنیں ٹی وی لاؤنج میں کوئی انڈین مووی دیکھ رہی تھیں۔ امی اور ابا اپنے کمرے میں تھے۔

میں نے راحیل کا دیا ہوا کارڈ نکالا اور دیر تک سوچتی رہی کہ اسے فون کروں یا نہ کروں۔ دماغ روک رہا تھا لیکن دل ضد کر رہا تھا' میرے کان پھر اس کی خوب صورت آواز اور گمبھیر لہجے کو سننا چاہ رہے تھے' یا یوں سمجھ لیں کہ محبت بھری باتیں سننا چاہ رہے تھے۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کارڈ میں لکھا ہوا موبائل فون کا نمبر دیکھا اور اپنے موبائل سے نمبر پنچ کیا۔

دوسری جانب تیسری بیل پر اس نے فون ریسیو کر لیا اور بہت خوب صورت لہجے میں بولا۔

"یس..... راحیل اسپیکنگ.....!"

اس کی آواز سن کر مجھے پسینہ آ گیا۔ وہ دوبارہ میٹھے لہجے میں بولا۔

"بولیں..... ہو آر یو.....؟"

جواب میں میں صرف گہری گہری سانسیں لے رہی تھی' میرے منہ سے الفاظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔

"اچھا میں سمجھ گیا۔ میری آنکھیں ہلکے اورنج کلر میں ملبوس سانولی سلونی جھیل جیسی آنکھوں والی ربیعہ کو دیکھ رہی ہیں..... مے آئی رائٹ.....؟" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"جی!" میں بہ مشکل کہہ پائی۔

"زہے نصیب ربیعہ' جو آپ نے اس قابل سمجھا' یقین کیجیے جب سے آپ کو دیکھا ہے' آنکھوں سے نیند غائب ہے' میں نہ جانے کیوں پل پل آپ کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔" اس نے میٹھے لہجے میں کہا اور مارے خوشی کے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"پہلے ایک بات بتائیے کہ آپ نے حمیدہ سے میری اور اپنی ملاقات کا ذکر تو نہیں کیا ہے ناں۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں تو....." میں نے آہستہ سے کہا۔

"بتائیے گا بھی مت..... دراصل زمان میرا بہت اچھا دوست ہے اور اس کی خواہش ہے کہ میں اس کی بہن حمیدہ سے شادی کروں..... وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اس بات کا اظہار کئی بار کر چکا ہے' ہو سکتا ہے کہ حمیدہ کو بھی اس بات کا علم ہو..... لیکن میں حمیدہ کو بالکل بھی پسند نہیں کرتا' میرے دل کو پہلی مرتبہ کوئی صورت بھائی ہے تو وہ آپ کی ہے۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو ایک دم سے ہی مجھے حمیدہ زہر لگنے لگی اور میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں نہیں آپ بے فکر رہیں میں حمیدہ تو کیا کسی سے یہ بات نہیں کہہ سکتی۔ ویسے بھی حمیدہ سے میری کوئی خاص دوستی نہیں ہے۔"

"گڈ!" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "ایسی باتیں کسی کو بتانے والی تھوڑی ہوتی ہیں' ہم ایک دوسرے سے اچھی

طرح سے واقف ہو جائیں تب میں اپنے والدین کو آپ کے گھر آپ کا ہاتھ مانگنے کے لیے بھیجوں گا۔"

اور پھر اس نے مجھے محبت کا انمول سبق پڑھانا شروع کر دیا اور میں احمق اور بے وقوف لڑکی اس کی لچھے دار باتوں کے سحر میں گم ہوتی رہی۔

بہنوں میں میرا تیسرا نمبر تھا' مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں' مجھ سے پہلے تو دونوں بڑی بہنوں کی شادیاں ہونی تھیں' پھر میرا نمبر آتا۔

آدھی رات کو جب سب گھر والے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوتے تو میں ٹھٹھر کر چپکے سے ٹیرس میں آ جاتی اور فجر کے وقت تک راحیل سے محبت بھری باتیں کرتی رہتی۔

اب راحیل مجھ سے ضد کرنے لگا کہ میں باہر کہیں اس سے ملوں۔ وہ مجھے دیکھنا چاہتا ہے' اس کی آنکھیں میرے حسن کا دیدار کرنے کے لیے ترس رہی ہیں۔

لیکن میں اس طرح کیسے اس سے مل سکتی تھی۔ اس میں رسوائی تھی' ابھی تک تو کسی کو کانوں کان اس بات کی خبر نہیں تھی کہ میں کسی کی محبت میں سرتاپا غرق ہو چکی ہوں۔ اگر باہر کسی نے مجھے راحیل کے ساتھ دیکھ لیا تو یہ بات میری رسوائی بن کر زمانے کی زبان پر آ جائے گی۔

میں اسے روزانہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتی مگر وہ مسلسل ضد کر رہا تھا' اس دن وہ مجھ سے ناراض ہو گیا اور غصے میں فون بند کر دیا' اور میرے بار بار ملانے پر بھی فون ریسیو نہیں کیا۔ گھبرا کر میں رونے لگی' میں راحیل کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی ناراضگی میری موت تھی۔ میں ساری رات روتی رہی۔

دوسری رات بھی میں مسلسل راحیل کو فون کرتی رہی مگر اس نے فون نہیں اٹھایا' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے مناؤں۔

اتفاق سے اسی شام کچھ لوگ آپی کو دیکھنے کے لیے آئے انہیں گوری چٹی آپی فوری پسند آ گئیں' مگر جب انہوں نے مجھے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کون ہے' کیونکہ میں ان سب سے الگ دکھائی دے رہی تھی۔

سب لوگ ہنسنے لگے اور آپی نے جھٹ کہا۔ "بھئی اسے تو ہماری امی کہیں سے اٹھا لائی ہیں یہ ہماری بہن تھوڑی ہے۔"

آپی کی ہونے والی ساس بولیں۔ "لیکن شکل تو آپ لوگوں سے مل رہی ہے۔"

تو آپی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہمارے ساتھ رہتے رہتے ہماری شکلوں میں ملنے لگی ہے۔"

آپی کی بات پر سب زور سے ہنسنے لگے اور مجھ پر مارے شرمندگی کے گھڑوں پانی پڑ گیا' میں بھاگ کر اندر جانے لگی' تو آپی کی آواز سنائی دی۔

"یہ ایسی ہی ہے۔ کمپلیس زدہ..... یہ کالی ہے ناں اس لیے اسے اپنے کالے رنگ کا کمپلیس ہے۔" مجھے بہت رونا آیا..... آپی نے اپنے سسرال والوں کے سامنے بھی میرا مذاق اڑایا۔ مجھ سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا..... میں بہت بری ہوں..... یہ احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا۔ میری ویران اور اجاڑ زندگی میں راحیل بہار کے ایک خوشگوار جھونکے کی مانند آیا تھا' میں کتنی خوش رہنے لگی تھی' لیکن میں نے ان ہی لوگوں کی عزت کا خیال کرتے ہوئے اپنے پیار کو ناراض کر دیا' جب یہ لوگ دوسروں کے سامنے میری عزت نہیں کر سکتیں تو میں کیوں کسی کی عزت کا خیال کر کے اپنی خوشیوں کو آگ لگاؤں۔

میں راحیل سے ملوں گی..... میں نے فیصلہ کر لیا.....!

پھر میں نے راحیل کو میسج کیا کہ میں تم سے ملنے کے لیے تیار ہوں۔ بتاؤ کہاں اور کب ملنا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میسج پڑھ کر راحیل خوش ہوگیا اور جب میں نے اسے کال کی تو اس نے فون ریسیو کرلیا۔ اور میرے ہیلو کہتے ہی اس نے ''مائی ڈارلنگ' مائی سوئٹ ہارٹ کہہ کر ریسیور کو چوم لیا۔ اور میرے دل کی دھڑکن کئی گنا بڑھ گئی۔

اس نے مجھے ایک پارک میں ملنے کے لیے بلایا اور میں کالج جانے کے بجائے پارک پہنچ گئی۔

راحیل مجھ سے بہت بے تابی سے ملا' صبح دس بجے کا وقت تھا۔ پارک میں کوئی نہیں تھا۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے' میں نے اسے کل والا واقعہ بھی سنایا کہ کس طرح میری بہن نے مجھے اپنے سسرال والوں کے سامنے بے عزت کیا تھا۔

یہ سن کر راحیل کو آپی پر بہت غصہ آیا اور اس نے ادھر ادھر دیکھ کر جھٹ مجھے سینے سے لگالیا' اور میرا گال چوم کر مجھے چھوڑ دیا۔

مجھے راحیل کی یہ حرکت بری نہیں لگی بلکہ یہ مجھے اس کی محبت کا ایک انداز لگا۔

اور پھر میں جب بھی موقع ملتا راحیل سے ملنے لگی' اس روز کے بعد راحیل نے کبھی میرے ساتھ کوئی بری حرکت نہیں کی۔ میں خوش بھی تھی اور مطمئن بھی۔

ایک روز راحیل نے مجھ سے کہا کہ کل تم ضرور آنا۔ مجھے تمہیں ایک سرپرائز دینا ہے۔ میں وعدے کے مطابق پارک پہنچ گئی۔

وہ دن میری زندگی کا بھیانک ترین دن تھا' باتوں کے دوران مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب راحیل نے میرے منہ پر کلوروفام سے بھیگا ہوا رومال رکھ دیا اور میں فوراً ہی ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی۔

ہوش آیا تو اپنے آپ کو ایک چلتی ہوئی گاڑی میں پایا' میں نے محسوس کیا کہ میں ایمبولینس میں لیٹی ہوں۔ راحیل میری سامنے والی سیٹ پر بیٹھا ہے' اس کے ساتھ ایک دوسرا لڑکا بھی موجود ہے۔

اچانک ہی ایک روح فرسا خیال ذہن میں آیا اور میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ راحیل نے مجھے جیسے ہی اٹھتے ہوئے دیکھا' اس نے تیزی سے مجھے پکڑ لیا اور سختی کے ساتھ میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔

میں راحیل کی گرفت میں بری طرح مچل رہی تھی۔ تب راحیل زور سے چیخا۔

''جلدی کرا سے انجکشن دے..... سالی وقت سے پہلے ہی ہوش میں آ گئی۔''

اس کے ساتھی نے لمحہ بھر کی دیر کیے بغیر سرنج بھری اور میرے بازو میں انجکشن انجیکٹ کردیا۔ میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے اور ذہن ماؤف ہونے لگا اور میں ایک بار پھر بے ہوش ہوگئی۔

دوبارہ ہوش آیا تو اپنے آپ کو ایک بند کمرے میں پایا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کمرے میں صرف ایک بیڈ پڑا تھا' باقی سارا کمرہ خالی تھا' کمرے میں اٹیچ باتھ بھی موجود تھا۔

میں سمجھ گئی کہ راحیل نے میرے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے' وہ ایک خوب صورت ناگ ہے اور مجھ جیسی احمق اور کمپلیس زدہ جوان لڑکیاں اس کا آسانی سے شکار بن جاتی ہیں۔

میں سمجھ چکی تھی کہ میں اپنے گھر سے بہت دور آ چکی ہوں لڑکیوں کے اغواء کے بہت قصے سنے تھے اور یہ بھی سنا تھا کہ انہیں طوائفوں کے کوٹھوں پر بیچ دیا جاتا ہے' تو کیا میں کسی طوائف کے کوٹھے پر موجود ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی جیسے میرے جسم سے جان ہی نکل گئی۔ اپنا انجام مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرے والدین بہت خاندانی اور شریف تھے۔ وہ میرے باپ کا گھر تھا جہاں عزت کی چادر اور چھت مجھے میسر تھی لیکن اپنی ذرا سی نادانی کے سبب آج میں کہاں پہنچ گئی

ہوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر میری بہنیں ہر وقت میرا مذاق نہ اڑاتیں تو آج میں یہ احمقانہ قدم نہ اٹھاتی۔

راحیل بڑا ماہر اور گھاگ کھلاڑی تھا' اس نے بہت جلد ہی مجھے تاڑ لیا کہ میں کیسی لڑکی ہوں۔ باقی اسے مجھ سے ذرا سی گفتگو کر کے اندازہ ہوگیا اور اس نے میری حماقت اور بے وقوفی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

پہلے تو میں دیر تک بیٹھی روتی رہی۔ پھر باہر سے کوئی آواز سننے کی کوشش کی مگر باہر بالکل سناٹا تھا' کسی کی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی' البتہ کبھی کبھار کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔

میں نے گھبرا کر بری طرح دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ ''کھولو..... کوئی ہے..... مجھے باہر نکالو.....!''

میری آواز کے جواب میں مجھے کئی قدموں کی چاپیں سنائی دیں اور پھر دروازہ کھل گیا۔ میں وحشت زدہ سی کھڑی تھی۔

دروازہ کھلا اور اندر تین افراد آئے..... جن میں باس' دلبر..... اور گلزار شامل تھے۔

میرے پاس دوپٹہ نہیں تھا' تین اجنبی مردوں کو یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر میں نے جلدی سے بیڈ کی چادر اتار کر اوڑھ لی۔ میں کسی چڑیا کے بچے کی مانند کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

مجھے چادر اوڑھتے ہوئے دیکھ کر وہ تینوں ہنسنے لگے۔ ان تینوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات کی اور باس مجھ سے بولے۔

''پریشان مت ہو بے بی..... یہاں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ چادر اتار کر بیڈ پر رکھ دو' یہ اوڑھنے کی نہیں بچھانے کی چادر ہے۔'' باس نے مسکراتے ہوئے بہت ہی نرم لہجے میں کہا۔

''مم..... میں کہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ آپ کون لوگ ہیں.....؟'' میں نے چادر کو مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

''تم کراچی میں ہو' اب تم یہیں رہو گی..... تم راحیل سے محبت کرتی تھیں اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں ناں..... میں راحیل سے تمہاری شادی کراؤں گا..... چلو شاباش اس چادر کو اتار دو.....'' باس نے سابقہ لہجے میں کہا۔

''نہیں میں چادر نہیں اتاروں گی۔ تم راحیل کا نام مت لو' وہ ایک کمینہ انسان ہے' اس نے مجھے دھوکا دیا ہے اور بے ہوش کر کے یہاں لے آیا ہے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے اگر تم کہہ رہی ہو کہ راحیل ایک کمینہ انسان ہے' تو یقیناً ہوگا۔ اس نے تمہیں دھوکا دے کر واقعی اپنے کمینے ہونے کا ثبوت دیا ہے' دھوکا دینا تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اب چادر اتار دو۔'' اس نے مجھے چمکارتے ہوئے بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے کہا پھر آخر میں اپنے مطلب کی بات کہی۔

''آپ مجھ سے بار بار چادر اتارنے کے لیے کیوں کہہ رہے ہیں۔ میں ایک شریف لڑکی ہوں آپ مجھے ایک اچھے اور ہمدرد انسان دکھائی دے رہے ہیں۔ پلیز مجھے میرے گھر پہنچا دیں۔'' میں نے احمقانہ معصومیت سے کہا تو وہ تینوں پھر ہنسنے لگے' لیکن فوراً ہی باس نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا اور دہاڑتے ہوئے کہا۔

''سنا نہیں تم نے..... چادر اتار دو۔''

باس کی بات سن کر میں بری طرح ڈر گئی اور میرے کانپتے ہوئے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور چادر میرے کندھوں سے پھسل کر نیچے گر پڑی۔

''گڈ.....! ویری سیکسی اینڈ بیوٹی فل..... راحیل کو اس کا معاوضہ دے کر چلتا کرو۔''

میرے کانوں میں باس کی آواز آئی تو میں تیزی سے نیچے جھکی کہ چادر اٹھالوں تو دلبر تیزی سے میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانب بڑھا اور میں نے غصے سے اس کا منہ نوچ لیا' وہ ایک تیز سسکی لے کر پیچھے ہٹ گیا۔

''اس کے کپڑے اتار دو.....!'' باس کے حلق سے کسی درندے کی سی غراہٹ ابھری اور پھر میں نے اپنی حد تک جدوجہد کی..... مگر میں ہار گئی..... اور تھوڑی دیر بعد انتہائی شرمناک حالت میں ان تینوں مردوں کے سامنے کھڑی تھی۔

میرا شدت سے دل چاہا کہ کاش یہ زمین پھٹ جائے اور میرا یہ شرمندہ وجود ہمیشہ کے لیے اس میں چھپ جائے میں نے صدق دل سے اپنی موت کی دعا مانگی.....

میرے برہنہ وجود کو دیکھ کر باس کی آنکھوں میں داد و تحسین تھی' وہ بہت خوش ہوا لیکن ان تینوں میں سے کسی نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا اور تینوں باہر نکل گئے' دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا اور میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد دلبر دوبارہ آیا' اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے اور پانی کی بوتل تھی' مجھے دیکھ کر اس کے لبوں پر خباثت آمیز مسکراہٹ آ گئی' اس نے ٹرے میرے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

''کھانا کھالو.....!''

میں نے غصے سے ٹرے اٹھا کر دور پھینک دی اور کھلے دروازے سے نکل کر بھاگنے لگی تو دلبر نے مجھے تیزی سے پکڑ لیا' اس کی انگلیاں میرے بازو کی ہڈیوں کو توڑنے لگیں۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے میرے بالوں کو پکڑا اور میرا چہرہ اوپر اٹھا کر غراتے ہوئے کہا۔

''شرافت کی زبان سمجھ میں نہیں آتی ہے تجھے..... اپنے یار سے ملنے کے لیے جب گھر سے باہر نکلی تھی' جب تیری عزت اور شرافت کہاں سو گئی تھی۔ حرام زادی.....! یاد رکھ تو یہاں سے باہر مر کر بھی نہیں نکل سکتی۔ ان بھوکے کتوں کی آوازیں سن رہی ہے ناں' باہر نکلی تو ان کی خوراک بن جائے گی۔ اس لیے خاموشی سے یہاں بیٹھ کر کھانا کھالے اور باس کے اگلے حکم کا انتظار کر..... ورنہ یاد رکھ تیرا وہ حشر کروں گا کہ تو نہ زندوں میں رہے گی نہ مردوں میں.....'' اتنا کہہ کر دلبر نے ایک جھٹکے سے میرے بال چھوڑ دیئے اور تیزی سے باہر نکل گیا اور جاتے ہوئے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

میرا دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا' کبھی قصوروار مجھے اپنے گھر والے اور ان کا رویہ دکھائی دیتا کبھی اپنی حماقت اور کبھی راحیل کی محبت..... کچھ بھی تھا..... مگر میں اب بری طرح کسی بے بس چڑیا کی طرح ان کے جال میں پھنس چکی تھی جو پھڑ پھڑا تو سکتی ہے مگر اڑ نہیں سکتی۔

تین چار دن اسی طرح گزر گئے' میں قید تنہائی میں رہی' کھانا پینا مسلسل مل رہا تھا' اس دوران کوئی مجھ سے ملنے کے لیے نہیں آیا' پتہ نہیں یہ کون سی جگہ تھی' بالکل سناٹا تھا' بس کبھی کبھار کتوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ پتہ نہیں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

تب ہی ایک شام پھر دروازہ کھلا اور دلبر اندر آیا اور بولا۔ ''تمہیں باس نے بلایا ہے۔''

میں خاموشی سے اٹھ کر دلبر کے ساتھ اس کمرے سے باہر آ گئی' تب میں نے پہلی بار ان شکاری کتوں کو دیکھا لیکن وہ ایک بڑے سے لوہے کے پنجرے میں بند تھے۔

''انہیں اس وقت اس پنجرے میں تمہاری وجہ سے بند کیا ہے' کیونکہ یہ کسی بھی اجنبی کو دیکھ کر ذرا دیر میں چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔''

میں نے دلبر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا' اس منحوس صورت انسان کی شکل سے مجھے شدید نفرت تھی' جس کی نہ چاہنے کے باوجود مجھے بار بار صورت دکھائی دیتی تھی۔

دلبر مجھے لے کر ایک دوسرے کمرے میں آیا' یہاں صوفے وغیرہ بچھے ہوئے تھے' یہاں باس کو میں نے ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔

''آؤ لڑکی..... آؤ ادھر بیٹھو.....!'' باس نے اپنے قریب صوفے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو میں ڈرتے ڈرتے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیسی ہو.....؟'' باس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو میں نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

''میں تم سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں' انہیں غور سے سن لو اور سمجھ لو..... کیونکہ مجھے بار بار اپنی بات دہرانے کی عادت نہیں ہے۔'' باس نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔ میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اس کی شکل دیکھتی رہی۔

''راحیل جس کو تم سے محبت کا دعویٰ تھا اور تمہیں راحیل سے..... تو وہ تو تمہیں ہمارے ہاتھوں بیچ کر تمہارے دام کھرے کر گیا ہے' پورے پچاس ہزار روپے دیئے ہیں تمہاری قیمت۔ کیونکہ تم میری ڈیمانڈ پر پوری اتری ہو۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد بولا۔ ''خان بہادر خان کا نام سنا ہے کبھی؟'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

ایک سیاسی لیڈر ہیں۔ میرے بہت اچھے دوست ہیں اور خیر خواہ بھی..... ہمارے ایک دوسرے سے بہت سے کام پڑتے رہتے ہیں۔ انہیں سانولا حسن بہت بھاتا ہے' اب انہیں خوش رکھنا ہے تو ان کی پسند کا خیال تو رکھنا ہی پڑے گا ناں۔ مجھے تمہاری جیسی نمکین حسینہ کی تلاش تھی۔ اب تم مل گئی ہو تو میرے کام تو آؤ گی.....! سو تم تیاری کرو..... تمہیں خان صاحب کے ساتھ وقت گزارنا ہے انہیں خوش کرنا ہے اور ہمیں بھی.....'' باس نے دھیمے دھیمے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔ عجیب شخص تھا' ہر وقت اس کے لبوں پر مسکراہٹ رہتی تھی۔

''میں ہرگز ایسا نہیں کروں گی!'' نہ جانے میرے ڈرے اور سہمے ہوئے وجود میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ میں نے بے ساختہ کھڑے ہو کر سختی سے انکار کر دیا۔

''کیوں بھئی.....!'' باس نے بغیر کسی غصے کے نرم لہجے میں کہا۔

''آپ مجھے شرافت سے میرے گھر واپس پہنچا دیں۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ کیا آپ کی کوئی بیٹی نہیں ہے' کیا کسی عورت نے آپ کو جنم نہیں دیا۔ جو آپ کسی دوسرے کے گھر کی عزت کو یوں پامال کر رہے ہیں۔'' میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

''دلبر!'' باس نے مسکراتے ہوئے دلبر کو آواز دی..... ''بھئی میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تم اس شریف زادی کو لے جاؤ..... اور اس کو باعزت طریقے سے بے عزت کر دو.....!''

''جی باس.....!'' دلبر نے اپنے غلیظ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بے تکلفی سے باس کو دیکھا۔

''سنا نہیں تم نے.....'' وہ زور سے دہاڑا..... ''گلزار کو بھی بلا لو..... اب کل اس سے بات ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ میری جانب دیکھے بنا اٹھ کر تیزی سے چلا گیا۔ میں آنکھیں پھاڑے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''چل میری بلبل.....!'' دلبر نے مجھے دبوچتے ہوئے کہا اور میں نے اس کو بری طرح نوچ کھسوٹ ڈالا۔ مجھے ایک اور کمرے میں لے جایا گیا' جہاں ہر جانب کیمرے اور آئینے لگے ہوئے تھے۔

دلبر اور گلزار نے چند گھنٹوں میں میری عزت کی موت کر دی..... میری برہنہ تصاویر اور ویڈیو ان کے پاس تھی۔

میں بے دم سی پڑی تھی' تب دلبر نے میرے گھر کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایڈریس دہراتے ہوئے کہا۔

"آج کے اس شاندار کھیل کی یہ شاندار ویڈیو اور تصاویر تمہارے گھر کے پتے پر ارسال کی جارہی ہیں اور اس کی ایک دو کاپیاں تمہارے پڑوس کے گھروں میں بھی بھیجی جارہی ہیں' کتنا اچھا لگے گا جب تمہارا باپ یہ سب دیکھے گا اور تمہارے پڑوس کے لوگ اس ویڈیو کو دیکھ کر تمہارے باپ کے باس مبارک باد دینے کے لیے آئیں گے کہ اب اس کی بیٹی کنواری نہیں رہی.....!"

"نہیں نہیں تمہیں اللہ کا واسطہ تم لوگ ایسا مت کرنا..... میں تم لوگوں کا ہر کہنا مانوں گی بلکہ اگر ہو سکے تو میرے گھر یہ اطلاع بھیج دو کہ ان کی بیٹی مر چکی ہے' اسے تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں۔" میں نے دلبر کے پیر پکڑ کر روتے ہوئے کہا۔

"رومت بے بی..... بس آج سے تمہارا کام صرف باس کے حکم کو بجالانا ہے۔ ایسا کروگی تو سب ٹھیک رہے گا' ورنہ..... تمہاری ویڈیو تو ہمارے پاس محفوظ ہے۔" دلبر نے خباثت سے کہا۔

"نہیں..... باس سے کہنا' میں ان کی کنیز ہوں' جیسا وہ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

اور باس نے میرا نام "کنیز" ہی رکھ دیا۔ مجھے پورے پانچ سال ہوگئے ہیں ادھر آئے ہوئے۔ میرے گھر والوں کا کیا حال ہوا' وہ لوگ اب کہاں ہیں' زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔ جن کی جوان بیٹیاں یوں اچانک لاپتہ ہوجائیں وہ لوگ زندہ ہوتے ہوئے بھی مر ہی جاتے ہیں۔

مجھے کنیز کی داستان سن کر بہت افسوس ہوا تھا' بار بار میری آنکھوں میں فائزہ کی شکل آرہی تھی' اس کی بے بسی کی موت..... اس کی بے حرمتی۔ کیا قصور تھا اس کا.....؟ کنیز تو اپنے آپ کو محبت کی مجرم سمجھ رہی تھی' مگر میری بہن فائزہ تو بہت معصوم تھی' اس کا قصور تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہا تھا۔

یہ باس اور اس جیسے عفریت..... چاہے وہ سردار شیر افضل ہو یا شیر زادہ خٹک یا مدوش کا باپ راجا ہو..... سارے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ میرے دل میں ان سب کے لیے انتہائی نفرت اور حقارت تھی۔ یہ لوگوں کو مجبور کر کے جرائم کرواتے ہیں۔ پھر ان جرائم کی مووی بنوا کر انہیں زندگی بھر بلیک میل کرتے رہتے ہیں۔ شاید سب ہی کی کوئی نہ کوئی کمزوری اس آغا قزلباش کے ہاتھ میں ہوگی' میرے ساتھ بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا' یہ بات بھی مجھے کنیز نے ہی بتائی تھی۔

کنیز نے مجھے بتایا تھا کہ باس کے پاس کچھ لڑکیاں ہیں جو نوجوان لڑکوں کو پھنسا کر اغوا کرائی ہیں تو ایسے لڑکے بھی ہوں گے جو نوجوان لڑکیوں کو پھنسا کر لاتے ہوں گے اور باس ان لڑکیوں کو دوسرے ممالک میں فروخت کر دیتا ہے۔

میرے ذہن میں رہ رہ کر ایک ہی بات آرہی تھی کہ باس کے ہاتھ میں کتنے لوگوں کی کمزوریاں ہیں۔ جن سے فائدہ اٹھا کر وہ انہیں اپنے اشاروں پر نچاتا ہے تو باس کی بھی تو کوئی نہ کوئی کمزوری ہوگی بلکہ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی ویک پوائنٹ ہوتا ہے' اب یہ سامنے والے پر اور اس کی عقل مندی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اس شخص کے ویک پوائنٹ کو کس طرح پکڑتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

اور اس کام کے لیے مجھے زیادہ سے زیادہ باس کا اعتماد حاصل کر کے اس کے نزدیک ہونا ہے اور اس کا ویک پوائنٹ حاصل کرنا ہے' پتا نہیں اس کی کوئی فیملی ہے یا نہیں' اگر ہے تو وہ کہاں ہے' مجھے پورا یقین تھا کہ کم

از کم وہ لوگ پاکستان میں تو نہیں ہوں گے' اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا' کنیز کو بھی نہیں۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ مجھے یہ بات بھی بتاتی۔

اس کی باتوں اور رویے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے مگر میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ تو تھا مگر کوئی اور جذبہ نہیں تھا۔ اس جذبے سے مجھے مدوش نے آشنا کیا تھا مگر اب نہ جانے کیوں اس کا عکس بھی میری آنکھوں میں دھندلانے لگا تھا۔

میری سوچوں کا دھارا بہتے بہتے ایک بار پھر ٹرین کے حادثے میں ہلاک ہونے والے جاوید کی جانب مڑ گیا۔ میں اس کی ماں اور بہن کے بارے میں سوچنے لگا' کہ وہ لوگ اس کا انتظار کر رہی ہوں گی' اس کے کسی فون کسی پیغام کا..... اور جب کسی جانب سے کوئی اطلاع نہیں ملی ہوگی تو وہ کتنا پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ماں کی آنکھوں سے تو نیند ہی روٹھ گئی ہوگی۔ اس کے کان دروازے پر ہونے والی اپنے بیٹے کے قدموں کی آہٹ پر لگے ہوں گے..... مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اسے کون بتائے گا کہ وہ اب اس کا انتظار نہ کرے۔ اس کا بیٹا اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔

مجھے اچانک ایک خیال آیا کہ میں جاوید کے گھر اس کا دوست بن کر جاسکتا ہوں اور کچھ رقم اس کی ماں کے ہاتھ پر رکھ کر کہوں گا کہ یہ جاوید نے بھیجے ہیں۔ وہ خود کسی وجہ سے نہیں آسکتا تو شاید اس کی ماں کی بے قرار ممتا کو قرار آجائے' باس نے مجھے سلو بھائی کے قتل کا جو معاوضہ دیا تھا' وہ لفافہ یوں ہی بند پڑا تھا' میں یہ رقم جاوید کے گھر دے سکتا ہوں۔

پھر مجھے گولی استاد کا خیال آیا کہ وہ سمجھ رہا ہوگا کہ میں مر چکا ہوں' اگر میں اسے اپنے زندہ ہونے کی خبر دوں گا تو وہ حیران رہ جائے گا اور مجھ سے ساری داستان سننے کی خواہش کرے گا' جو میں فی الحال نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کام کو میں نے مؤخر کر دیا' البتہ جاوید کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس بات کو کسی سے چھپانے کی ضرورت بھی نہیں تھی' میں یہاں سب کو بتا کر بھی جاسکتا تھا۔

میرے پاس ویسے بھی کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آج ہی ناظم آباد کا چکر لگا لیتا ہوں۔ میں فٹافٹ تیار ہوا' باس کا دیا ہوا رقم کا لفافہ اٹھایا' اس میں سے آدھی رقم نکال کر الماری کی دراز میں رکھی' اور آدھی رقم اس براؤن لفافے میں رکھ کر جیکٹ کی جیب میں رکھ لی۔

میں نے اکرم کو آواز دی تو وہ فوراً چلا آیا' میں نے اس سے پوچھا کہ نیچے پارکنگ میں کوئی کار موجود ہے یا نہیں' کیونکہ اس وقت وہ تینوں گھر سے باہر تھے اور ظاہر ہے وہ گاڑیاں لے گئے ہوں گے' تو اکرم نے جواب دیا کہ ایک کار موجود ہے' وہ آپ ہی کے استعمال میں رہے گی' باقی سب کی اپنی اپنی گاڑیاں موجود ہیں۔ میں نے اس سے کار کی چابی مانگی جو اس نے مجھے فوراً دے دی اور کہا۔ "آج سے اس چابی کو آپ اپنے پاس ہی رکھیں۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے ایک دوست کے گھر جارہا ہوں' ناظم آباد ایک سے دو گھنٹے لگ جائیں گے' اگر کنیز یا جعفر وغیرہ پوچھیں تو انہیں بتا دینا۔

"یہاں آپ کا کون سا دوست ہے' آپ تو پنڈی کے رہنے والے ہیں۔" اس نے پوچھا' مجھے اس کے اس طرح سوال کرنے پر غصہ تو بہت آیا' مگر میں برداشت کر گیا اور کہا۔

"جب تم میرے بارے میں یہ جانتے ہو کہ میں پنڈی کا رہنے والا ہوں تو یہ بھی جانتے ہوگے کہ ٹرین کے حادثے میں جو شخص مرا ہے میں اس کے گھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جارہا ہوں۔'' میں نے ناگوار لہجے میں کہا۔

''ذرا دھیان سے جایئے گا۔'' اس نے کہا۔

''مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے' مجھے اپنی حفاظت خوب اچھی طرح کرنی آتی ہے۔'' میں نے سخت ترش لہجے میں جواب دیا تو وہ بے پروا انداز میں کندھے اچکا کر چلا گیا۔

میں غصے میں بھنا تا ہوا تیزی کے ساتھ فلیٹ کی سیڑھیاں اترنے لگا' لائٹ نہیں تھی اس لیے لفٹ بند تھی۔

اس بلڈنگ کے زیادہ تر فلیٹ باس کی ملکیت تھے اور اس میں زیادہ تر لوگ باس کے آدمی ہی تھے۔ یہ بات مجھے جعفر نے بتائی تھی اور ابھی تک ان میں سے میں زیادہ تر چہروں سے ناآشنا تھا۔

میں نے کار اسٹارٹ کی اور بلڈنگ کے احاطے سے باہر نکلنے لگا' تب ہی میں نے ایک شخص کو وہاں کھڑے دیکھا جو بے پروا انداز میں ایک کار سے ٹیک لگائے کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا' میرے گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ بھی تیزی کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ میں نے عقبی آئینے میں اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا' میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی' یعنی اکرم نے میرے پیچھے بندہ لگا دیا ہے لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا' میں نہ تو اس بات کو کسی سے چھپا رہا تھا اور نہ ہی کوئی جرم کر رہا تھا جو میں کسی سے ڈروں۔

راستے میں' میں نے اسے کئی جگہ ڈاج دینے کی کوشش کی لیکن وہ مسلسل میرے پیچھے پیچھے آتا رہا' مجھے اس احمق آدمی پر غصہ آ رہا تھا کہ اس آدمی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ تعاقب کس طرح کیا جاتا ہے' ایسے کہ اس شخص کو شبہ بھی نہ ہو کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے' جب میں نے ہی اسے پہچان لیا تو دوسرے کی تو خیر ہے' میں نے سوچا کہ باس نے کس قسم کے بودے اور احمق آدمیوں کو ان کاموں کے لیے رکھا ہے' ایسا کام تو کوئی تیز اور شاطر آدمی ہی کرتا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں باس سے اس بارے میں ضرور بات کروں گا' ہوسکتا ہے کہ میرے نمبر بڑھ جائیں۔

راستے بھر میں اسی قسم کی باتیں سوچتا ہوا ناظم آباد کے اس محلے میں پہنچ گیا' جاوید نے مجھے بتایا تھا کہ میری گلی کے سرے پر ایک میڈیکل اسٹور ''علی میڈیکل اسٹور'' کے نام سے کھلا ہے' اندر گلی میں جا کر دائیں ہاتھ پر پانچواں مکان میرا ہے۔

میں نے اپنی گاڑی میڈیکل اسٹور کے قریب پارک کر دی۔ اسٹور پر اس وقت بھی کئی افراد کھڑے تھے۔ مکان نمبر بھی میرے ذہن میں تھا۔ میں گاڑی لاک کر کے اندر گلی میں داخل ہو گیا۔

اچانک ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ جاوید نے پہلی ہی ملاقات میں' جبکہ میں اس کے لیے بالکل ہی اجنبی تھا' مجھ سے اتنی ساری باتیں کیوں کیں اور نہ صرف باتیں کیں اپنے گھر اور گھر والوں کے متعلق بہت کچھ بتا دیا اور اپنے گھر کا ایڈریس بھی۔ شاید یہ سب اس سے قدرت نے کہلوایا تھا' کیونکہ اسے معلوم تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور پھر چونکہ میں اس کے گھر کے متعلق بہت کچھ جان چکا ہوں تو یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس کی بیوہ ماں اور جوان بہن کا خیال رکھوں۔

میں پانچویں مکان پر رک کر مکان کے باہر لگی نیم پلیٹ دیکھنے لگا' یہاں جاوید کا نام اور گھر کا نمبر لکھا ہوا تھا' جاوید کا نمبر پڑھ کر ہی مجھے اطمینان ہو گیا تھا' اس لیے میں نے برقی کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

گھر کے اندر بجنے والی بیل کی آواز مجھے باہر بھی سنائی دے رہی تھی۔ تقریباً چند منٹ بعد ہی اندر سے ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟''

''میں جاوید کا دوست ہوں اور اس کا ایک پیغام لایا ہوں۔'' میں نے دروازے کے قریب ہو کر کہا۔

''ایک منٹ رکیں پلیز.....'' اندر سے ہیجان خیز لہجے میں کہا گیا۔ میں انتظار کرنے لگا' وہ یقیناً یہ بات اپنی ماں کو بتانے کے لیے گئی ہوگی۔ میں گھر کے باہر کھڑا گلی میں یوں ہی بے مقصد ادھر ادھر گردن گھما کر دیکھنے لگا' تب ہی میری نگاہ ٹیلی فون کے پول سے ٹیک لگائے کھڑے ایک جوان لڑکے پر پڑی جو میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ شکل سے ہی غنڈہ موالی دکھائی دے رہا تھا۔ منہ میں پان اور انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی' گلے میں اس نے رومال باندھا ہوا تھا۔ ابھی میں اس لڑکے کا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا' کہ اندر سے ایک لرزتی کانپتی آواز آئی۔

''کون ہے بیٹا.....؟''

''دروازہ کھولیں ماں جی' میں عماد ہوں' جاوید کا دوست' اسی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے' مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' میں سمجھ گیا کہ اس مرتبہ جاوید کی والدہ آئی ہیں۔ دو تنہا خواتین حد درجہ محتاط رویہ اختیار کیے ہوئے تھیں۔ انہیں کسی سے ڈر یا خوف تو نہیں' یہ تو ان سے مل کر ہی معلوم ہوگا' میں نے دل میں سوچا۔

اندر سے کنڈی کھلنے کی آواز آئی اور دروازہ تھوڑا سا کھل گیا اور ذرا سے کھلے دروازے سے ایک بوڑھا' غمزدہ اور کمزور وجود مجھے دکھائی دیا۔

میری شکل پر نگاہ پڑی تو بڑی بی کچھ خوف زدہ سی ہو گئیں۔ میرا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا بڑی بڑی مونچھیں' داڑھی اور سر کے بال بھی لمبے.....

''بیٹا آپ کا نام کبھی جاوید کے منہ سے سنا نہیں' آپ اس کے کون سے دوست ہیں۔'' انہوں نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''ماں جی اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اندر بلا لیں۔ میں اطمینان سے بیٹھ کر آپ سے بات کر سکوں گا اور جاوید کے بارے میں آپ کو بتا سکوں گا اور اگر آپ مجھے گھر کے اندر بلانا مناسب نہیں سمجھتیں تو کوئی بات نہیں' آپ یہ لفافہ رکھ لیں یہ جاوید نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے جیکٹ کی جیب سے براؤن لفافہ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔

ماں جی لفافہ لیتے ہوئے جھجک رہی تھیں۔ ان کی مشکل یہ تھی کہ وہ ایک جوان بیٹی کی ماں تھیں اور یوں ایک اجنبی پر بھروسہ کرنا ذرا مشکل تھا۔

''لے لیجیے ماں جی' یہ آپ کے بیٹے کے ہی پیسے ہیں.....'' نہ جانے کیوں یہ بات کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی' مجھے ایک دم اپنی ماں کی یاد آ گئی' مائیں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں' ماں تو صرف ماں ہوتی ہے چاہے کسی کی بھی ہو' اتنی ہی احترام اور عزت کے لائق۔

''اچھا ماں جی اب میں چلتا ہوں۔'' میں نے لفافہ مزید اندر کرتے ہوئے کہا' جو انہوں نے تھام لیا' پھر جھجکتے ہوئے بولیں۔

''بیٹا ایک منٹ رکو' تم اندر آ جاؤ اور بتاؤ کہ جاوید کہاں ہے۔''

''بہت شکریہ ماں جی!'' میں نگاہیں نیچی کر کے ان کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے ایک نگاہ ہی میں دیکھ لیا' کہ دو کمروں کے درمیان میں ایک چھوٹی سی گیلری تھی جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا' آگے کھلا صحن تھا' دونوں کمروں کے دروازے آمنے سامنے تھے۔

ماں جی دائیں طرف والے کمرے کی جانب مڑ گئیں' کمرے میں اندھیرا ہو رہا تھا' انہوں نے اندر جا کر لائٹ آن کی' میں باہر کھڑا رہا' روشنی ہو جانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے آواز دے کر مجھے اندر بلالیا۔

یہ ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا' نفاست اور سلیقے سے سجا ہوا' لکڑی کا سوفہ تھا' زمین پر سستا سا ریڈ کارپٹ بچھا تھا۔ دروازے اور کھڑکیوں پر معمولی کرٹن تھے' دیواروں پر سینری بھی معمولی قسم کی تھی۔

ماں جی نے مجھے سوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میرے سامنے والے سوفے پر بیٹھ گئیں' کسی زمانے میں وہ خاصی حد تک حسین رہی ہوں گی' اس وقت بھی ان کی رنگت سرخ وسفید تھی' بڑی بڑی سی آنکھیں' بجھی بجھی اور نمکین پانیوں سے لبریز دکھائی دے رہی تھیں۔ لان کے معمولی سوٹ میں وہ صوفے پر سمٹی بیٹھی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت ان کے دل کی کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ مگر وہ نہایت تحمل سے بیٹھی تھیں۔ میں خاموش ہی رہا تب وہ بولیں۔

''بیٹا جاوید کہاں ہے' وہ خود کیوں نہیں آیا' اس نے کوئی فون بھی نہیں کیا۔ نہ اپنی خیریت کی کوئی اطلاع دی۔ وہ تو دو تین دن کے لیے پنڈی گیا تھا۔ ٹرین میں بھی سوار ہوگیا تھا۔ تب آخری بار اس کا فون آیا تھا' بس اس کے بعد.....'' اس سے آگے وہ بول ہی نہیں سکیں۔ ان کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی' ڈھیر سارے آنسو حلق میں اتر آئے اور آواز بند کردی۔

''جی ماں جی' ایسا ہی ہوا تھا لیکن.....'' میں اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا' سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ فوری طور پر ان سے کیا کہوں۔ جوان بیٹے کی موت کی اطلاع یوں اچانک نہیں دینا چاہتا تھا۔

''لیکن کیا بیٹا.....!'' انہوں نے بے قرار لہجے میں پوچھا۔ ''ہمیں معلوم ہوا تھا کہ جس ٹرین میں جاوید آرہا تھا' اس کا حادثہ ہوگیا تھا' ہم نے بہت بھاگ دوڑ کی' سارے زخمی جس ہاسپٹل میں تھے' سب جگہ دیکھا' مرنے والوں کی لسٹ دیکھی مگر میرا بیٹا کہیں نہیں تھا۔ اس بات کا تو اطمینان تھا کہ جاوید ماشاء اللہ زندہ ہے' کچھ لاوارث لاشیں بھی تھیں' ان کے چہرے بھی دیکھے' میری عشاء بہت ہمت والی ہے' اس نے دن رات ایک کردیئے بھائی کی تلاش میں لیکن اس کی کوئی خبر نہیں ملی' آج اتنے عرصہ کے بعد تم آئے ہو اس کا پیغام لے کر.....''

میری نگاہ ڈرائنگ روم کے دروازے کی جانب اٹھ گئی جہاں گلابی دوپٹے کا پلو لہرا رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ یقیناً جاوید کی بہن عشاء ہے' جو بے تابی سے بھائی کے بارے میں جاننے کے لیے دروازے سے لگی کھڑی ہماری باتیں سن رہی ہے۔

''بات یہ ہے ماں جی کہ جاوید اس ٹرین میں سوار ضرور ہوا تھا' مگر چلنے سے پہلے اسے ٹرین سے اتار لیا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن کیوں؟'' انہوں نے احتجاج کے انداز میں کہا۔

''ماں جی ٹکٹ لیتے ہوئے جاوید کا ایک شخص سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ حالانکہ چاقو اس شخص نے جاوید پر حملہ کرنے کے لیے نکالا تھا لیکن جب وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوئے تو جاوید اس کے ہاتھ سے چاقو چھیننے لگا لیکن اچانک وہ دونوں نیچے گر پڑے اور چاقو جاوید کے ہاتھ سے اس شخص کے سینے میں گھس گیا۔

''ہائے میرے اللہ.....!'' میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ماں جی کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی اور انہوں نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی بلند ہونے والی چیخ کو روکنے کی کوشش کی' گلابی دوپٹے کے لہراتے ہوئے پلو میں بھی ہلچل سی مچی۔

''پھر.....پھر کیا ہوا.....'' میں بولتے بولتے رک گیا تو وہ بے تاب ہوگئیں اور میرے قریب آکر کھڑی ہوگئیں۔

''آپ بیٹھ جائیں ماں جی.....!'' میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے نزدیک بٹھالیا۔ وہ وحشت زدہ نگاہوں سے میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بری خبر کی منتظر تھیں۔

''جاوید تیزی سے اس شخص سے علیحدہ ہوگیا اور خوف زدہ ہوکر بھاگ نکلا اور ٹرین میں سوار ہوگیا اور خاموشی سے ایک جانب بیٹھ گیا۔ ایک تو اس کا قصور نہیں تھا' وہ غنڈہ ٹائپ شخص تھا۔ خواہ مخواہ جاوید سے بھڑ گیا اور ہاتھا پائی پر اتر آیا' چاقو بھی اس نے جاوید کو زخمی کرنے کے لیے نکالا تھا لیکن اپنے چاقو سے خود ہی زخمی ہوگیا۔ کہیں یہ کوئی لمبا چکر ہی نہ چل جائے' جاوید کو تو کراچی آنا تھا' ٹرین بھی اسٹیشن پر تھی' اس لیے وہ بھاگ کر اس میں سوار ہوگیا اور شاید اسی وقت اس نے آپ کو فون کیا ہوگا۔

وہاں جب لوگوں نے ایک بندے کو زخمی حالت میں تڑپتے ہوئے دیکھا تو پولیس موبائل کو بلالیا' جو اسٹیشن پر موجود تھی۔

کچھ لوگوں نے جاوید کو ٹرین میں چڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا' اس لیے پولیس نے بطور خاص ٹرین کو روانہ ہونے سے روک دیا اور ٹرین میں جاوید کی تلاش شروع کردی اور پھر اسے گرفتار کرلیا گیا۔

وہ شخص جو جاوید کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا' ہاسپٹل پہنچا دیا گیا' وہ زندہ تو تھا مگر چاقو کا زخم مہلک ثابت ہوا' زخم دل کے قریب آیا تھا' انفیکشن تیزی سے پھیلا اور تیسرے روز وہ شخص چل بسا۔ جاوید پر قتل کا مقدمہ قائم ہوگیا۔ تب اس نے بڑی مشکلوں سے کہہ سن کر مجھے کراچی کال کروائی' میں پنڈی سے آرہا ہوں' اس نے یہ ساری باتیں مجھے بتائی ہیں اور خاص تاکید کی ہے کہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے' خاص طور پر پنڈی میں موجود رشتہ داروں کو' سب سے یہی کہا جائے کہ میں ملک سے باہر گیا ہوا ہوں۔

وہ خود بھی اس بات سے بہت پریشان تھا کہ آپ لوگ بھی بہت زیادہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔ اس نے مجھے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں یہ آپ کو دے دوں۔ میں اپنی بات ختم کرکے خاموش ہوگیا۔ ماں جی اب باقاعدہ سسکیوں سے رو رہی تھیں۔ میں نے انہیں بہت تسلیاں دیں اور کہا۔

''ماں جی آپ فکر نہ کریں' جب تک جاوید گھر لوٹ کر نہیں آجاتا' آپ مجھے اپنا جاوید سمجھ لیں۔ میرا موبائل نمبر نوٹ کرلیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو' کوئی مسئلہ ہو مجھے بس ایک کال کردیں۔ اور اگر ہو سکے تو مجھے اپنا بھی کوئی کانٹیکٹ نمبر دے دیں۔'' میں نے کہا۔

''امی ان سے کہیں کہ کیا یہ ہمیں بھائی جان سے پنڈی لے جاکر ملوا سکتے ہیں۔'' باہر سے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز سنائی دی' تو ماں جی میری جانب جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ کیونکہ سوال تو میں سن ہی چکا تھا۔

''نہیں' نہیں آپ لوگ اس بات کی کوشش بھی مت کیجیے گا' جاوید نے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔'' میں نے تیزی کے ساتھ کہا۔

''بیٹا تم وہاں گئے تھے تو کم از کم میری اور اس کی بات ہی کروا دیتے۔'' ماں جی نے بے چارگی سے کہا۔

''امی جان بھائی جان نے ان کو بھی تو فون کیا تھا' تو کیا وہ ہمیں ایک فون کرکے اپنے بارے میں نہیں بتا سکتے تھے۔'' باہر سے عشاء کی آواز آئی۔

''میں آپ کی جاوید سے بات کرا سکتا تھا اور جاوید بھی آپ کو فون کرکے اپنے بارے میں بتا سکتا تھا' مگر اس نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا' کیونکہ ایک تو یوں اچانک اس طرح کی خبر دے کر وہ آپ لوگوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا' دوسرے یہ کہ اس کی ہمت ہی نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو رہی تھی کہ وہ آپ لوگوں سے بات کر سکتا' اس لیے اس نے مجھے سمجھا کر آپ لوگوں کے پاس بھیجا ہے۔ تاکہ آپ لوگ خود کو تنہا نہ سمجھیں۔ میں نے جاوید کے مقدمے کے لیے وکیل کیا ہے' اس کا مقدمہ ابھی چل رہا ہے۔ مگر پیشی کی تاریخ کافی لمبی ملتی ہے۔ آپ اللہ سے دعا کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے آہستہ آہستہ سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''اچھا بیٹا تم ایک منٹ رکو میں ابھی آئی۔'' ماں جی نے اپنے آنسو صاف کیے اور تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا۔ انہوں نے میرے سامنے اسے کھولتے ہوئے کہا۔

''بیٹا میرے پاس رقم تو نہیں ہے' البتہ یہ اچھے وقتوں کے کچھ زیور ہیں جو میں نے عشاء اور جاوید کی دلہن کے لیے سنبھال کے رکھے تھے' تم انہیں لے جاؤ اور فروخت کر کے مقدمے میں جتنا خرچ آئے' ان پیسوں کو استعمال کر لو۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں ماں جی..... آپ نے تو مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔ کیا آپ مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھتیں' جاوید اگر آپ کا بیٹا ہے تو میرا بھی جگری یار ہے' وہ رہا ہو کر گھر آ جائے' مجھے سب کچھ مل جائے گا اور ایک بات بتاؤں ماں جی آپ کو..... جاوید تو اتنا خوش نصیب ہے کہ اس کے لیے دعا کرنے والی ماں موجود ہے لیکن میں تو اتنا بدنصیب ہوں کہ اس عظیم نعمت سے محروم ہوں۔ نہ ماں نہ باپ اور نہ کوئی بہن بھائی' میں تو دنیا میں بالکل ہی تنہا ہوں' کیا چلا جائے گا آپ کا' جو میں چند دن آپ کے پاس آ کر ماں کی محبت کی مٹھاس چکھ لوں گا۔'' میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ بات نہیں ہے بیٹا' میں تو بس..... تم اداس مت ہو۔ تم جاوید ہی کی طرح میرے بیٹے ہو۔ اللہ تمہیں خوش رکھے' کبھی زندگی میں کوئی دکھ نہ ملے.....!'' انہوں نے محبت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

''دکھ!'' میں نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''زندگی نے اتنے دکھ دیئے ہیں ماں جی کہ اب اگر دکھ آئے بھی تو یہ سوچ کر لوٹ جائیں گے کہ اب اس شخص کا دکھوں کو اٹھانے کا پیمانہ ہی لبریز ہو چکا ہے' ہماری جگہ نہیں ہے۔ آپ یہ زیور پہلے کی طرح سنبھال کر رکھ لیں جب میں ہوں تو آپ کو کسی بات کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے۔'' میں نے زیورات کا ڈبہ بند کر کے ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''جائیے پہلے انہیں رکھ کر آئیے۔''

ماں جی ڈبہ اٹھا کر باہر نکلیں تو مجھے دروازے کے باہر سے تیز سرگوشی سنائی دی۔

''امی آپ یہ زیور لے کر کہاں جا رہی ہیں۔''

''وہ میں عماد بیٹے کو.....!''

''امی کیا ہو گیا ہے آپ کو..... جب تک ہماری بھائی جان سے بات نہیں ہو جاتی' آپ نے اس کی سنائی ہوئی کہانی پر یقین کیسے کر لیا' اللہ جانے کون ہے' کہاں سے آیا ہے' کیا چاہتا ہے' آپ نے حلیہ دیکھا ہے اس کا' دہشت گرد لگ رہا ہے پورا.....!''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو..... میں نے زیور اس کے آگے رکھے تھے مگر اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اگر کوئی چال باز ہوتا تو جھٹ اٹھا لیتا' ویسے بھی بیچارہ دنیا میں اکیلا ہے۔''

''آپ تو بس جھٹ یونہی سب کی باتوں میں آ جاتی ہیں۔ میری بھولی امی..... اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے بات کروں۔''

''نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے' اب میں اتنی بھی

احمق نہیں ہوں جو یوں منہ اٹھا کر ہر ایک کا اعتبار کر لوں گی۔ دنیا دیکھی ہے میں نے' لوگوں کی پہچان ہے مجھے' شکل سے ہی کسی شریف ماں باپ کی اولاد لگ رہا ہے۔''

''مجھے تو شکل سے غنڈہ لگ رہا ہے۔''

''چل زیادہ باتیں نہ بنا' تو اس کو سنبھال کر رکھ اور چائے کی ٹرے مجھے پکڑا۔''

''اب زیادہ خاطر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جلدی سے چلتا کریں اسے.....'' اس کے جاتے جاتے میرے کان میں آواز آئی۔

دونوں کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا' کہ عشاء ایک سمجھدار لڑکی ہے اور خاصی ذہین بھی۔ اس نے میرے بارے میں بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔

ماں جی ہاتھوں میں ٹرے تھامے اندر آئیں اور ٹیبل پر میرے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹا چائے پیو۔''

چائے کے ساتھ ایک چھوٹی طشتری میں چند بسکٹ بھی رکھے تھے۔ ''اس کی کیا ضرورت تھی ماں جی' میں اب چلتا ہوں' ہاں آپ اپنا کوئی نمبر دے دیں۔ تاکہ میں آپ کی خیریت معلوم کرتا رہوں اور میرا نمبر بھی نوٹ کر لیں تاکہ اگر آپ کو میری ضرورت ہو تو مجھے بلا سکیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں عشاء کے پاس موبائل فون ہے۔ عشاء بیٹی ذرا اپنا موبائل نمبر تو دے دو۔'' ماں جی نے آواز لگائی۔

مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد ماں جی کمرے سے باہر گئیں۔ مجھے ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آئیں۔ بس بھنبھناہٹ سی سنائی دی۔ یقیناً عشاء اپنے فون کا نمبر نہیں دے رہی ہو گی لیکن ماں جی نمبر لے ہی آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چٹ تھی جس پر نمبر لکھا تھا' میں نے وہ نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا' جلدی جلدی چائے پی اور ماں جی سے اجازت لے کر میں جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا۔

مجھے وہ سامنے کھڑی دکھائی دے گئی' صحن میں کھڑی وہ اپنے بالوں میں کنگھا کر رہی تھی' اس پر نگاہ پڑتے ہی میرے قدموں کو جیسے زمین نے جکڑ لیا۔ میں چند لمحوں تک تو اسے دیکھتا رہا' پھر وہ تیزی سے کمرے کی دیوار کی اوٹ میں ہوئی تو مجھے ہوش آیا اور میں گلی میں کھلنے والے دروازے سے باہر نکل آیا۔

عشاء کی حسین صورت میرے دماغ میں نقش ہو گئی تھی۔ اتنے ملیح حسن والے چہرے بہت کم دیکھنے کے لیے ملتے ہیں۔ اس کی شکل میں ماں جی کی بہت شباہت تھی۔ میں عشاء کے حسن میں کھویا ہوا تیزی سے جا رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرا راستہ روک لیا۔

''بڑی تیزی میں لگتے ہو' ذرا سا ڈی گل تو سنتے جاؤ جی.....!''

میں رک گیا اور دیکھا تو یہ وہی شخص تھا جس کو میں نے ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا دیکھا تھا جب بھی یہ مجھے مسلسل گھور رہا تھا۔

''کہو کیا بات ہے؟'' میں نے رک کر نرم لہجے میں پوچھا۔

''کون ہو تم اور یہاں کس لیے آئے تھے؟'' اس نے بائیں جانب جھک کر زمین پر منہ سے پان کی پچکاری نکالی اور منہ میں موجود پان کے ملغوبے کو زبان سے ایک طرف کرتے ہوئے بولا۔

''آپ فرمایئے آپ کون ہیں اور مجھ سے اس طرح سے سوال کس حیثیت سے کر رہے ہیں۔'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میں خدائی فوجدار ہوں' پھر.....؟'' اس نے اپنی ٹانگوں کو پھیلاتے ہوئے اور ایک جھٹکے سے گلے سے رومال کو کھینچتے ہوئے بدمعاشوں کے انداز میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں تم جیسے خدائی فوجداروں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ یہ میری خالہ جی کا گھر ہے' جاوید آج کل یہاں نہیں ہے اس لیے میں کچھ ضروری چیزیں لے کر آیا تھا۔ آج تو آیا ہوں اور آئندہ بھی آتا جاتا رہوں گا' تمہیں کوئی تکلیف ہو تو اس کا علاج کراؤ اور آئندہ میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کرنا' سمجھے..... یا کسی اور زبان میں سمجھاؤں۔" میں نے غصے سے سخت اور تیز لہجے میں کہا۔

"بلے بھئی بلے..... ذرا زیادہ ہی جوانی کا جوش ہے۔" اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا اور مڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے چلا گیا۔

میں نے فی الحال اس سے بھڑنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

وہاں سے واپسی پر میں نے پھر اس شخص کو اپنے تعاقب میں آتے ہوئے دیکھا لیکن آدھے راستے سے وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور میں فلیٹ میں واپس آ گیا۔

واپس آیا تو فلیٹ ویسے کا ویسا ہی خالی پڑا تھا' سوائے اکرم کے اور کوئی نہیں تھا۔

"بڑی جلدی واپس آ گئے آپ۔" میرے اس سوال کے جواب میں کہ کوئی ابھی تک واپس نہیں آیا جو میں نے اکرم سے پوچھا تھا' اس نے کہا۔

"ہاں مجھے اتنا ہی وقت لگتا' ویسے یار تم نے میرے پیچھے جس شخص کو بھیجا تھا' اس سے کہنا کہ اگر آئندہ کسی کا تعاقب کرو تو اتنے بھونڈے اور بچگانہ طریقے سے مت کرنا کہ اگلے شخص کو فوراً ہی اس بات کا پتا چل جائے۔"

"کیا مطلب.....؟" اکرم نے گھبرا کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے' اس میں نہ سمجھ میں آنے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"شاید آپ کو یہ بات بری لگی ہے لیکن یہ میری مجبوری ہے۔ میرے لیے باس کا حکم اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ آپ نئے آئے ہیں۔ اس لیے آپ کہاں جا رہے ہیں' کن لوگوں سے مل رہے ہیں' ان سب کی انفارمیشن' ہمیں باس کو دینی ہے۔" اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"یہ بات میں باس کو خود ہی بتا دوں گا اور ویسے بھی یار جسے بے ایمانی کرنی ہو گی' وہ ہزار حیلے بہانوں سے کر لے گا اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا لیکن میں پٹھان ہوں' کھرا بندہ ہوں' اپنی بات اور اپنے وعدے کا پابند..... میں دھوکا دینے والوں میں سے نہیں' بدلہ لوں گا' تو سامنے سے للکار کر....."

یہ کہہ کر میں اکرم کو حیران چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور جوتے اتارے بنا ہی بیڈ پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔

آنکھیں موندیں تو عشاء کا سراپا اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے تھا' میرا شدت سے دل چاہا کہ وہ میرے سامنے کھڑی رہتی اور میں اسے یونہی دیکھتا رہتا' میرے اوپر نگاہ پڑتے ہی اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرا گئیں اور وہ چھپاک سے میرے سامنے سے ہٹ گئی' اور مجھے ایسا لگا جیسے ہوا کا ایک خوش گوار اور خوشبو سے لبریز معطر جھونکا مجھے چھو کر گزر گیا۔ میں دیر تک اس کے تصور میں کھویا رہا۔

اچانک ہی میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا تو وہ عشاء کا تھا' نہ جانے کیوں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

(باقی آئندہ)

پریشان لمحات

محترم مدیر اعلیٰ نئے افق
آداب!

ہم ایک جذباتی قوم ہیں' ہمارے فیصلے ذہن سے نہیں بلکہ جذبات سے ہوتے ہیں۔ جذبے بھی وہ جو صرف لمحاتی ہوتے ہیں۔ جو ہمیں عقل و شعور سے خاصے دور بلکہ بعض اوقات انسانیت سے بھی دور لے جاتے ہیں۔ جذبات میں آکر ہم اپنے ہاتھوں اپنا گھر جلا کر قہقہے لگاتے ہیں۔ زیر نظر کہانی ایسے ہی جذبوں کی عکاس ہے۔ یہ ہر شہر ہر بستی اور ہر قریہ کی داستان ہے۔ آپ کے شہر کراچی میں تو ایسی کہانیاں ہر دوسرے روز ہر دوسری سڑک پر دہرائی جاتی ہے۔ میں اس امید پر یہ کہانی لکھ رہی ہوں کہ شاید..... شاید کوئی یہ کہانی پڑھ کر ہمارے جذبات سے کھیلنے والوں کو پہچان لے۔

والسلام
ناز سلوش زشے
میر پور آزاد کشمیر

دن ڈھلتا جا رہا تھا۔ سنہری کرنوں نے پورب پچھم اپنے جالے تان رکھے تھے۔ پرندے ان جالوں سے بچتے بچاتے جلد از جلد اپنے گھونسلوں میں پہنچنے کے لیے بے تاب تھے۔ ہر سُو شام کی اداسی کا پہرا تھا۔ زرد زرد ماحول نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور یہ ماحول یہ آوازیں اس کے دل میں عجیب سی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔

اندھیرے کے ساتھ ساتھ اس کی فکر بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بہت دیر سے بے مقصد سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ چلتے چلتے تھکا تو وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ شام ہو جانے کے باوجود بازار میں بہت گہما گہمی تھی۔ بچے' عورتیں اور مرد خریداری میں اس طرح مصروف تھے کہ جیسے یہی ان کا مقصد حیات ہو۔

اک وہی تھا جو سب کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ہر کوئی اپنی ذات میں گم تھا' دنیا کے کاموں میں مصروف و مشغول تھا۔ ہر کسی کے نزدیک اپنی ہی ذات کی اہمیت تھی۔ وہ دیر تک سب دیکھتا رہا۔ پھر اس خیال سے کہ گھر میں ماں پریشان ہو رہی ہو گی۔ وہ اٹھا اور گھر کو چل دیا۔ گھر کی چوکھٹ پار کرنے کے بعد بھی اس کے احساسات و جذبات وہی تھے۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ پریشان کن.....!

شام کے ملگجے سائے نے گھر کو بھی دھندلا دیا تھا۔ ماں نے اس سے کھانے کا پوچھا مگر اس نے انکار کر دیا اور چارپائی پر دراز ہو گیا۔ ماں جانتی تھی کہ وہ آج کل نوکری نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہے اور یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی متعدد بار وہ جب بھی انٹرویو کے لیے گھر سے گیا واپسی اسی حالت میں ہوئی۔ وہ لمبے قد اور گندمی رنگت کا بیس اکیس سال کا گریجویٹ نوجوان تھا۔ اس کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب وہ صرف پانچ سال کا تھا۔ ماں نے محنت مزدوری کر کے اس کو تعلیم دلوائی اور ہر ماں کی طرح وہ بھی اپنے بیٹے کو اعلیٰ افسر بنا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ بھی ان چھ کروڑ ڈگری یافتہ نوجوانوں کی طرح دفتروں اور کارخانوں میں چکر لگانے لگا جو تعلیم حاصل ہی اچھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مستقبل کے لیے کرتے تھے۔ مگر قسمت سے بڑھ کر اس ملک کے کرتا دھرتا حکمرانوں نے جیسے ان سب نوجوانوں کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اچھی تعلیم ہونے کے باوجود بھی اسے ہر جگہ سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ وہ کسی جگہ جب بھی انٹرویو دینے کے لیے جاتا تو اس کی فائل تمام تر کاغذات کے مکمل ہونے کے باوجود بھی نامکمل ہوتی کیونکہ اس میں سفارش کا ٹیگ یا رشوت کی رقم کا چیک نہیں ہوتا تھا۔

اس کے برعکس وہ دیکھتا تھا کہ میٹرک پاس لڑکیاں منٹوں میں مطلوبہ سیٹ حاصل کرلیتیں۔ ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ سجائے، گلے میں دوپٹے ڈالے گریبان چاک کیے وہ کسی بھی طرح پیٹ کی بھوک اور خواہشات کی ہوس مٹانے کو بے تاب نظر آتیں۔ چاہے اس کا نتیجہ بعد میں پے در پے اسپتالوں کے چکر ہوتے یا کسی کونے کھدرے میں جنم دیتے ناجائز بچے کی صورت، غربت اور مہنگائی کا چابک ان سے ہر طرح کا جائز ناجائز کام کروا رہا تھا۔ وہ اکثر ایسے لمحوں میں ان لڑکیوں کی جگہ خود کو رکھتا اور سوچتا کہ اگر وہ ان کی جگہ ہوتا تو کیا دو نوالوں کے لیے خود کو نیلام ہونے دیتا اور جب دماغ کے کسی کونے سے یکبارگی ''ہاں'' کی آواز ابھرتی تو وہ جھرجھرا جاتا۔

''آہ یہ بے روزگاری۔''

رقم تو اس کے پاس زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے بھی نہیں تھی۔ بھلا رشوت کے لیے کہاں سے لاتا۔ ادھر اُدھر کے چکر لگاتے اب تو اس کے جوتے بھی چیخ گئے تھے۔ مگر ہائے قسمت کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔ اس کی ماں کے پاس جو چھوٹے موٹے زیورات تھے وہ اچھے مستقبل کے خواب میں بیٹے کی پڑھائی پر خرچ ہوگئے۔ گھر میں سامان پہلے ہی برائے نام تھا۔ رہا سوال کسی موٹی آسامی کی سفارش کا تو غریب لوگوں کی جان پہچان تو بڑے اور اونچے مرتبے کے لوگوں سے ایسے بھی نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو وہ اپنا اثر و رسوخ غریب لوگوں پر استعمال کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور بالفرض کر بھی دیں تو پسِ پشت ضرور کوئی اپنا مطلب درکار ہوتا ہے۔

وہ اپنے گھر میں بیٹھا اپنی سوچوں میں مگن تھا۔ ہر سوال منہ پھاڑے کھڑا تھا اور وہ ان کے ممکنہ جوابات تلاشتے تلاشتے جیسے نیم پاگل سا ہوا جا رہا تھا۔ آہ کیا تھی زندگی۔

''کیا تھا خدائے پاک اگر ہمارے ہاتھ بھی تھوڑا اقتدار رکھا ہوتا۔ اور کچھ نہیں تو یوں در بدر ذلیل تو نہ ہونا پڑتا۔'' الجھنوں کے ناگ شکوہ بن کر اس کی زبان سے پھسل پڑتے۔

اس نے نظر اٹھا کر دو کمروں پر مشتمل اپنے چھوٹے سے گھر کو دیکھا کہ جس میں الگ سے کوئی کچن نہیں تھا۔ گھر کے چھوٹے سے صحن میں چھوٹے چھوٹے گملوں میں خوب صورت پودے لگے ہوئے تھے۔ گھر چھوٹا مگر بہت صاف ستھرا تھا۔

ایک سوچ کے بعد دوسری سوچ ذہن میں جگہ لے لیتی۔ سوچوں کے زاویے بدلے اور ایک نیا رخ سامنے آیا۔ اگر نوکری نہ ملی تو وہ اپنی بہنوں کو اعلیٰ تعلیم کیسے دلا سکے گا۔ ان کی شادیوں کی ذمہ داری بھی اس پر تھی۔ مرتے دم تک پیٹ کا جہنم خوراک کا ایندھن مانگنے کو بے تاب تھا۔ اس کی ماں کی عمر بھی اب ایسی نہیں تھی کہ وہ زیادہ کام کر سکے اور وہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ ماں اب سلائی کیا کرے۔ وہ خود ان کا سہارا بننا چاہتا تھا۔ مگر چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم بہت کچھ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہوتا نہیں ہے۔

کافی عرصہ یوں ہی گزر گیا۔ نوکری اس کے لیے مرغے کی ایک ٹانگ ثابت ہوئی۔ اب وہ خود بھی نوکری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن دورانِ سفر اسے ایک بس ڈرائیور ملا۔ کافی دیر کی گپ شپ کے بعد ڈرائیور اس سے بہت متاثر نظر آیا اور اسے کنڈیکٹر رکھوا دیا۔ خالی ہاتھوں کے لیے یہ کام بھی بہت تھا۔ کچھ نہ ہونے سے یہ تھوڑا بھی بہت تھا۔ اگرچہ اس کی تنخواہ مہنگائی کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اب وہ مطمئن تھا کہ وہ خود کما رہا ہے۔ اتنی پتلی حالت میں بھی اس نے حرام رستے کا نہ سوچا۔ جیسے بھی تھا ماں کو اب محنت مشقت کا بوجھ نہیں اٹھانا پڑتا تھا۔

نیت صاف ہو تو خدا رستہ خود صاف کر دیتا ہے۔ مشکل حالات بھی بندے کی آزمائش ہوتے ہیں۔ کچھ ان آزمائشوں میں ثابت قدم رہتے ہیں اور کچھ بھٹک کر خدا کی نعمتوں سے دور تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چھ ماہ اس کی زندگی میں محنت کے وہ ماہ تھے جن میں اس نے جان توڑ کر کام کیا۔ پھر اس نے اپنے مالک سے بات کر کے ایک ویگن قسطوں پر لے لی اور خود چلانے لگا۔ وہ دن میں تین چکر لگاتا اور رات گئے گھر واپس آتا۔ گھر کے مالی حالات میں بھی بہتری نظر آئی اور گھر والوں کے چہروں پر سکون بھی۔ چند برس گزرے تو مہنگائی کا بھوت غریبوں کے ساتھ ساتھ امیروں کے سروں پر بھی منڈلانے لگا۔ اس عرصے میں اس نے اس حد تک بچت ضرور کر لی تھی کہ اپنی ویگن لے لی اور چھوٹے موٹے قرضے اتار کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

دنیا میں ''نظر لگنے'' کو بہت مانا جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے آگے کے حالات کو اپنی بدقسمتی سے زیادہ اب ''نظر'' کا شکار سمجھتا ہے۔

یہ ایک خوب صورت سرد صبح کا قصہ ہے۔ رات وہ کافی دیر سے گھر لوٹا تھا۔ پنڈی میں ایک سیاسی خاتون لیڈر پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے سارے ملک کے حالات مخدوش ہوگئے تھے۔ رات بھی ہر جگہ ناکے اور کرفیو لگے تھے۔ بہت مشکل سے وہ جان بچاتا بچاتا گھر پہنچا تھا۔ حالات کو کوسنا اپنا خون ہی جلانے کے برابر تھا۔

وہ گھر سے نکلا تو ہر جگہ پہیہ جام ہڑتال تھی۔ اس نے اپنے کنڈیکٹر سے مشورہ کیا تو وہ بولا۔

''لالہ ایک چکر لگا لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ ہم چھوٹا چکر لگائیں گے۔'' اس نے بات مان لی اور ہڑتال کے باوجود گاڑی چلا لی۔

واپسی پر جب وہ اپنے گھر سے کچھ ہی دور تھا تو لوگوں کے ایک ہجوم نے اس کی گاڑی کو گھیر لیا۔ اس کی ہزار منتوں کے باوجود انہوں نے گاڑی کو دل ٹھنڈا کر کے توڑا اور تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ نعرے لگاتے اور احتجاج کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔

مرنے والی تو مر گئی مگر ساتھ میں ہزاروں گھروں کے چراغ بجھا گئی۔ چند سال پہلے اپنی محنت پر بھروسہ کرنے والا آج اسی محنت کی کمائی میں جل رہا تھا اور اس کا کنڈیکٹر اس جلتی گاڑی کے پاس کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خالی دامن

بھائی عمران احمد'
آداب!

حوصلہ افزائی کا شکریہ' آپ کی سرپرستی اور خلوص ہی مجھے نئے افق کے لیے لکھنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ سو ایک اور کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ سورۃ رحمٰن میں فرماتا ہے۔ "اور تم اپنے ربّ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔" لیکن اس کے باوجود ہم اس کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ شکوہ ہی کرتے رہتے ہیں۔ یہی اس کہانی کا بنیادی خیال ہے امید ہے یہ تحریر آپ کے معیار پر پوری اترے گی۔

طاہرہ جبیں تارا
لاہور

"اریبہ ڈیئر تم جن محرومیوں کا رونا روتی رہتی ہو' ان کا ازالہ ہونے والا ہے' بہت جلد کوئی تمہاری مانگ میں افشاں بھرنے کے لیے برات سجا کر آنے والا ہے۔"

"ثوبیہ یہ کیا بکواس ہے۔"

"جناب یہ بکواس نہیں ہے' آج میں آفس گئی تو محترم عاقب صاحب اداس الو کی طرح' بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اداسی کی وجہ پوچھی تو محترم خلا میں گھورنے لگے دو تین بار میز بجانے پر متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے کہ نہیں مس ثوبیہ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ تمہیں تو پتا ہے' کہ میں اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہوں' میں نے سوچا دال میں ضرور کالا ہے' یہ اداسی بلاسبب نہیں ہے یہ لال آنکھیں یوں تو دہشت گردوں کی ہوتی ہیں مگر اپنے عاقب صاحب دہشت گرد ہو نہیں سکتے' میں نے انہیں کریدا اور میرے بار بار اصرار پر بیچارے شرما شرما کر کہنے لگے کہ جی آپ وعدہ کریں کسی سے ذکر نہیں کریں گی' میں نے کہا عاقب صاحب بلیوی' تو پھر یوں گویا ہوئے وہ دراصل' آپ کی دوست اریبہ جی مجھے بہت اچھی لگتی ہیں' میں نے امی سے بات کی تھی' ہم ان کے گھر جانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اریبہ جی سے بات کرنی تھی' پر ہمت نہیں ہوئی' پلیز آپ میری مدد کریں نا' اف اریبہ ان کے اریبہ جی کہنے پر میں نے بڑی مشکلوں سے ہنسی ضبط کی اور پھر ان کے شرمانے کی ادا رئیلی' انہوں نے تو لڑکیوں کو بھی مات دے دی ہے۔ ویسے یار پکے مجنوں لگ رہے تھے تمہارے عاقب صاحب۔"

"ثوبی ایک تو میں تم سے بڑی تنگ ہوں' چھوٹی سی بات کو پوری جزئیات سمیت بیان کرنا' یار کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے' مختصر بات کیا کرو اور سنو مجھے یہ بیہودہ بکواس پسند نہیں ہے۔ پلیز آئندہ مت ذکر کرنا۔"

"ارے واہ! یہ کوئی بیہودہ بات ہے' کوئی تمہارے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے بیٹھا ہے اور تم اسے بیہودگی کا نام دیتی ہو' ہائے کاش کوئی ہمارے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کرتا' پر یہ نہ تھی ہماری قسمت......"

"جانم آہیں کیوں بھر رہی ہو' میں عاقب سے کہہ دوں گی' وہ تمہاری طرف رجوع فرمائیں۔"

"نہ نہ ایسا مت کرنا' سیکنڈ چوائس چیز کو میری طرف ریفر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' میں کسی کی سیکنڈ چوائس نہیں بننا چاہتی۔ ویسے بھی میں نے تو اسے حق سچ کا بھائی بنالیا ہے اور سنو آج تو تم چھٹی پر تھیں مگر کل ذرا اچھی طرح تیار ہو کر آنا' آخر کچھ تو مداوا ہو ہجر کا جاناں۔"

"بکو مت تم جانتی ہو کہ مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کسی پر یقین ہے۔ یہ سب وقتی باتیں ہیں کون کسی کی خاطر مرتا ہے' سب وقت گزاری کے قصے ہیں لمحوں کو رنگین بنانے کی داستانیں ہیں' پتا نہیں تمہاری الٹی کھوپڑی میں سب باتیں کیوں نہیں آتیں۔"

"بس یار میرا لیکچر سننے کا کوئی موڈ نہیں او کے تم سے کل ہی بات ہوگی۔" اس نے سیل آف کر دیا۔

اریبہ اس کی بہت اچھی دوست تھی' دونوں یک جان دو قالب تھیں وہ شوخ و چنچل اور آفت کی پرکالہ تھی' ہر وقت ہنگامہ برپا کرنے والی زندگی انجوائے کرنے والی اور کرانے والی جبکہ اریبہ سنجیدہ اور غم کی تصویر تھی' ہر وقت نام نہاد اداسی کا پیکر بنی' اس کے دل میں یہ بات سما گئی تھی کہ کوئی اس سے محبت نہیں کرتا' اگر کوئی کزن' یا دوست اس سے محبت کا اظہار کرتی تو وہ کہتی کہ یقیناً مجھ سے کوئی مفاد وابستہ ہے۔ یہاں تک کہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے حوالے سے بھی وہ تشکیک کا شکار تھی کہ اس سے کسی کو سچی محبت نہیں ہے۔ ثوبی اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھی مگر وہ سائیکو کیس بنتی جا رہی تھی۔

......☆☆☆......

ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی' وہ سب سے ہیلو ہائے کرتی اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔

"ہو ہو بڑا کام ہو رہا ہے۔ باہر دیکھو موسم کیسے آفت ہو رہا ہے۔ بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے سے اٹھکھیلیاں کرتے پھر رہے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے' یار بڑی بور ہو تم اتنے رومانٹک موسم میں کون کافر کام کرتا ہے۔ چلو ذرا باہر چلتے ہیں گرما گرم سموسے کھاتے ہیں اور سنو وہ تمہارے عاقب صاحب آئے ہوئے ہیں ان سے ملی ہو۔"

"ثوبی پلیز' تم جاؤ مجھے یہ ایڈیشن مکمل کرنا ہے اور یوں بھی جب دل کا موسم اچھا نہ ہو تو بیرونی موسموں کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔"

"مابدولت جانتے ہیں کہ تم انتہائی زود حس ہو اور تمہارے اندر خود ساختہ اداسیاں ڈیرے ڈالے رکھتی ہے لیکن آج لگتا ہے قنوطیت کچھ زیادہ ہی سوار ہے؟ کیا آج کل میر زیر مطالعہ ہے لیکن یار تم میری ضدی طبیعت سے آشنا ہو چھوڑو یہ کام اور چلو موسم کو انجوائے کرتے ہیں۔ اللہ نے گرم موسم میں یہ ٹھنڈی ہواؤں کا تحفہ دیا ہے تو ہم اللہ کی ناشکری کیوں کریں سنا نہیں تم نے کہ...... "تم میری کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"

اگر ہم نے اس موسم گرما کے دوران اللہ تعالیٰ کی ان ٹھنڈی ہواؤں اور بادلوں کے تحفہ سے فائدہ نہ اٹھایا تو اللہ ہم سے ناراض ہوگا اور دوبارہ سورج نکال کر اس کی آب و تاب سے ہمیں جلائے گا۔ سو چلو موسم انجوائے کرتے ہیں۔ زندگی کے جو لمحے ہماری گرفت میں ہیں ان سے ہمیں پورا پورا انصاف کرنا چاہیے۔"

"ثوبی ڈیئر تم اسے زندگی کہتی ہو' یہ زندگی' زندگی تو نہیں وبال جان ہے میرے لیے' کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس مہذب سوسائٹی کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لے لوں۔ ہر کوئی مفاد پرست ہے' دولت اور حسن کا پجاری' کسی کو کسی سے محبت نہیں' والدین کو اولاد سے' اولاد کو والدین سے' دوستوں کو دوستوں سے' رہبر کو وطن سے بھائی کو بہن سے' بہن کو بھائی سے' رشتہ داروں کو اپنے رشتے داروں سے کوئی کسی کا نہیں عجب نفسا نفسی کا عالم ہے سب غرض کے بندے......"

"شٹ اپ یار تم ہمیشہ ہی ایسی باتیں کرتی ہو' حالانکہ میں جانتی ہوں انکل آنٹی' حمنہ اور جولی بھائی تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ پھر حمرا' لالہ اور مجھ ناچیز سمیت سب تم سے محبت کرتے ہیں یہاں تک اس اخبار کے مالکان ہمارے کولیگز سب ہم سے بغیر کسی مفاد کے محبت کرتے ہیں' پتا نہیں تمہیں یقین کیوں نہیں' سچ کہوں اریبہ کہ تم خود کسی سے مخلص نہیں ہو۔ اس لیے ہر اک کے اخلاص کو شک کی نظر سے دیکھتی ہو تم ناشکری ہو جو سب کی محبتوں سے منہ موڑ کر خود ساختہ بے یقینی میں مبتلا ہو جاتی ہو۔ اچھا سنو' اللہ کو تو بغیر کسی مفاد کے انسان سے محبت ہے نا' اسی نے یہ زندگی عطا کی ہے' اس لیے اس زندگی کی قدر کرو تجرد کی زندگی اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ لہٰذا انسانوں میں رہ کر انسانوں کی طرح جینا سیکھو۔"

"ثوبی اللہ کو بھی تو اپنی اطاعت کے لیے بندے کی ضرورت تھی کہ وہ دنیا میں رہ کر دنیا کی رنگینیوں میں کھوتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے یا پھر میری تعلیمات کی پیروی کرتا ہے۔ بندے کو جنت کی طلب ہوتی ہے اس لیے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ بندے کی اطاعت قبول کرتا ہے اور اسے جنت عطا کرتا ہے' ہر اک کے ساتھ "طلب" کی چاہ ہے۔"

"اف اللہ! بیا پلیز کافرانہ جملے مت بولو' اللہ کی اطاعت کے لیے فرشتے کم نہیں تھے۔ صرف محبت کی بناء پر کائنات تخلیق ہوئی۔ اللہ کو اپنے نبی احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی تو صرف ایک بندے کی محبت کے لیے "کن فیکون" کہہ کر کائنات تخلیق کردی اور بندے نے اللہ سے اپنی محبت کو عشق کی انتہا پر پہنچادیا صرف اللہ کے عشق میں دشمنوں کے ستم سہے مگر ناشکری کا لفظ منہ سے نہ نکالا۔ اس ہستی کی محبت پر شک نہ کیا' بلکہ اس کی محبت میں سرشار صبر' استقامت اور توکل قائم رکھا۔ ہم اسی محبت کے پیکر کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ پلیز اپنے رویے اور نظریے کو بدلو ایسا نہ ہو کہ تمہیں اس ناشکری کی سزا ایسی ملے کہ..... چلو خیر چھوڑو' چلتے ہیں۔ پلیز اٹھو نہیں تو....."

"کیا؟"

"میں عاقب کو بلالاؤں گی۔"

"کیا؟"

"جی جناب!"

"اف ثوبی تم جیسی پاگل لڑکی سے خدا سمجھے۔"

"ارے عاقب صاحب آپ بھی موسم انجوائے کررہے ہیں یا ہمارا انتظار ہورہا تھا۔ اس نے "ہمارا" پر زور دیتے ہوئے کہا تو بیا نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔

"ارے آپ کی آنکھیں سرخ ہورہی ہیں اور کمزور بھی لگ رہے ہیں۔ کیا رتجگے منائے جارہے ہیں یا تارے گنتے رہے ہیں۔" وہ نان اسٹاپ بول رہی تھی۔

"نہیں مس ثوبیہ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ رات دیر تک مطالعہ کرتا رہا۔"

"کس کا؟"

"جی۔" وہ کنفیوز ہوگیا۔

"ارے وہ دیکھو حمرا آرہی ہے' کم بخت شادی کے بعد اب آئی ہے۔ تم یہیں ٹھہرو میں ذرا گیٹ پر ہی اس سے دو دو ہاتھ کرتی ہوں۔ تمہارے سامنے تو ہماری دال نہیں گلتی اور سنیے عاقب صاحب! جانس سے فائدہ ضرور اٹھائیے گا۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے کس سخی سے پالا پڑا ہے۔"

"ارے حمرا کی بچی تمہاری دید کو ہم ترس گئے اور تم شادی کے بعد ایسی رفو چکر ہوئیں نہ فون نہ خط نہ خیر نہ خبر۔" اس نے گیٹ پر ہی حمرا کو جا پکڑا۔

"ارے میری جان کیسی ہو اور وہ لنگور نظر نہیں آرہا جو تمہیں ہم سے لے اڑا۔"

"اے اے ثوبی خبردار جو تم نے میرے شوہر نامدار کی شان میں گستاخی کی۔ اتنے ہینڈسم بندے کو لنگور بنادیا شرم کرو۔"

"جناب ہم تو ٹھہرے شرم پروف۔"

"اچھا بیا کہاں ہے تم اکیلی نظر آرہی ہو۔"

"میرا حال پوچھا نہیں اور بیا کہاں ہے؟ کی رٹ لگا دی ہے۔"

"افوہ یار' تم دونوں مجھے عزیز ہو مگر بیا تم سے ذرا سی زیادہ عزیز ہے۔ اس لیے جیلس مت ہو ایڈیشن کے لیے سر کھپا رہی ہوگی۔ چلو اسی کے کمرے میں چلو۔"

"اسے کمرے سے کھینچ کر لائی ہوں۔ سامنے پارک میں بیٹھی ہے چلو۔ پارک میں چلتے ہیں۔"

☆☆☆

چھٹی کے وقت جب وہ اس کی گاڑی میں بیٹھی تو اس نے کہا۔ بیا عاقب نے کیا کہا؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"خیر خیر خاموشی کی بھی ایک اپنی زبان ہوتی ہے۔ دراصل خاموشی گویائی سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ ڈیئر محبت کا اعلیٰ ترین اظہار خاموشی ہی سے ممکن ہے' محبت بھرے دلوں کی یہ آفاقی زبان ہے' خاموشی کے مقابلے میں تمام

زبانوں کی فصاحت و بلاغت ہیچ ہے۔"

"ارے واہ آج تو تم بڑی ادبی گفتگو کررہی ہو۔"

"بس یار کبھی کبھی باادب ہونے کو بھی جی چاہتا ہے۔"

"بہرحال میری بات پر غور کرو۔ مجھے اور تمہیں نت نئے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے لیکن تم جانتی ہو کہ مجھے فیس ریڈنگ آتی ہے سو یقین جانو کہ عاقب سیریس ہے اس کی آنکھیں سچ کی غماز ہیں۔ پلیز اس کا یقین کرلو کم از کم ایک بندے کو تو شاد کردو۔ تم کب تک امتیاز علی تاج کی کہانیوں کا مایوس کردار بنی رہو گی۔"

"مجھے ڈسٹرب مت کرو پلیز۔ مجھے عاقب سے ہمدردی ہے۔ اور بس۔"

"اچھا تمہیں عاقب پر ترس آتا ہے۔ اچھی نشانی ہے ڈیئر' یہی ہمدردی محبت میں بدل جائے گی۔"

☆☆☆

"مس اریبہ پیا اپنی ثوبیہ آج کل کہاں گم ہے؟ کئی دنوں سے ملاقات نہیں ہورہی۔" شکیل صاحب نے پوچھا۔

"ارے آپ کو نہیں پتا' آج کل دارالامان کے بارے میں فیچر لکھ رہی ہے اسی سلسلے میں وہ گھر سے ہی مختلف جگہوں پر چلی جاتی ہے۔ آفس آہی نہیں رہی۔"

"ویسے مس ثوبیہ کے بغیر رونق نہیں ہے۔"

"سچ کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ ہر وقت ہنگامہ مچائے رکھتی ہے۔"

"ارے کس کے بارے میں باتیں ہورہی ہیں۔" وہ کاغذات کا پلندہ اٹھائے نمودار ہوئی۔

"شیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر ہوگیا۔"

"جی نہیں میں شیطانہ تو ہوسکتی ہوں مگر شیطان نہیں۔"

"آپ کہاں گم تھیں میں سوچ رہا تھا کہ آپ کی گمشدگی کی خبر اخبار میں دے دوں۔"

"واہ جی واہ پھر تو شکیل صاحب آپ نے انعام بھی رکھنا تھا' تو اب میں آگئی ہوں اس لیے انعام کی رقم میرے حوالے کردیں۔"

"بیا تم فارغ ہو اس فیلڈ ورک نے تو مجھے تھکا دیا ہے۔ اف ہمارے اردگرد بسنے والے انسانیت کی سطح سے ہی گر چکے ہیں۔ کس قدر خول چڑھا رکھے ہیں ان لوگوں نے جی چاہتا ہے کہ ایک ایک کو پکڑ کر سرعام پھانسی دے دوں۔"

"بڑی ایموشنل ہورہی ہو کیا ہوا؟"

"بیا سچ اس فیچر نے تو مجھے ذہنی طور پر بکھیر کر رکھ دیا ہے' سمجھ نہیں آتی بندہ کس پر بھروسہ کرے۔ ہمارے ملک میں کتنے ہی دارالامان ہیں۔ ان میں کچھ تو واقعی بے سہاروں کے لیے پناہ گاہ ہیں مگر کچھ پناہ گاہوں کے نام کو بدنام کررہے ہیں۔ وہاں عورتوں کو تحفظ نہیں دیا جاتا بلکہ عزتوں کی نیلامی کا گھناؤنا کاروبار ہوتا ہے۔ آشیانہ سرفہرست ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو ثوبی! یہ تو مجبور اور بے سہارا عورتوں کی پناہ گاہیں ہیں اور آشیانہ تو ایک سیاسی لیڈر اور سوشل ورکر چلا رہی ہے۔"

"ہوں! پناہ گاہیں' یہاں مجبوریوں کا سودا کیا جاتا ہے۔ یہ پناہ گاہیں نہیں ہیں بلکہ شرافت کے علمبرداروں نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اس تہذیب یافتہ سوسائٹی میں پناہ گاہوں کے نام سے قحبہ خانے کھول رکھے ہیں یہ سنہری جال ہے جس میں گھروں سے بھاگنے والی لڑکیاں اور بے سہارا لڑکیاں قید کردی جاتی ہیں اور پھر انہیں بناؤ سنگھار کرکے کبھی کہیں تو کبھی کہیں بھیجا جاتا ہے۔ نام نہاد شرفاء اور سوشل ورکرز نے درپردہ یہ کاروبار سجا رکھا ہے اور بظاہر لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹتے ہیں۔ کاش! میں انہیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کرسکتی۔"

"دھیرج ثوبی دھیرج! ہم اس معاشرے کو نہیں بدل سکتے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ ان پناہ گاہوں بلکہ قتل گاہوں سے لڑکیوں نے نکلنے کی کوشش نہیں کی؟"

"یار یہ پاگل لڑکیاں کبھی محبت کے نام پر تو کبھی فلموں میں کام کرنے کے شوق میں مبتلا ہوکر' کبھی مغرب کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیروی میں آزادی نسواں کی خواہش میں گھر کی دہلیز پار کر کے خود ہی اپنے در بند کر آتی ہیں' پھر کس منہ سے دوبارہ والدین کی دہلیز پر قدم رکھیں۔ اسی لیے سزا بھگت رہی ہیں۔ البتہ سنا ہے کہ کچھ لڑکیوں نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تھی مگر انہیں زمین نگل گئی یا آسمان' کچھ پتا نہیں چلا کیونکہ وہ فرار ہوتے ہوئے پکڑی گئی تھیں۔

یار ان لڑکیوں کا اندراج وغیرہ تو ہوتا ہوگا۔ باقی لڑکیوں نے ان کے لیے کچھ نہیں کیا۔

''ارے چھوڑو کبھی موت کے ٹھیکیداروں سے بھی کسی نے پوچھا ہے اور ڈر کے مارے باقی لڑکیوں نے خاموشی اختیار کر لی۔''

''تمہیں یہ سب معلومات کہاں سے ملیں؟''

''ایسے باضمیر لوگوں سے جو انسانیت' اخلاق اور عزت کی دھجیاں بکھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے مگر روزگار کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ موت کے ڈر کی وجہ سے اپنے نام صیغہ راز میں رکھنے کو کہا ہے۔

''ثوبی جب تمہارا فیچر شائع ہوگا' ایک طرف تو تمہیں لوگ سراہیں گے مگر شرافت کے علمبردار تمہیں زک پہنچانے کی کوشش کریں گے' پلیز اس فیچر کو شائع مت کرانا۔''

''ارے واہ اتنی محنت اور تحقیق کے بعد میں نے فیچر تیار کیا ہے اور اس ڈر سے کہ وہ لوگ مجھے نقصان پہنچائیں گے۔ شائع نہ کروں' نو نیور۔ یہ فیچر شائع ہوگا ہم سچ اور حق کے علمبردار ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ جس اخبار سے ہم منسلک ہیں انہوں نے کبھی سچ کا سودا نہیں کیا۔ ناصر صاحب بہت خوش ہیں کیونکہ معاشرے کے رستے ناسوروں کو بے نقاب کرنا ہمارے قلم کا ایمان ہے یہ فیچر ان لڑکیوں کے لیے ہے جو سنہرے وعدوں کے جال میں سوچے سمجھے بغیر نادانی میں اپنی خواہشوں کی تکمیل کی خاطر والدین کی دہلیز پار کر لیتی ہیں اور ان قحبہ خانوں کو پناہ گاہ سمجھتے ہوئے پناہ لے لیتی ہیں۔ اگر کسی ایک لڑکی نے بھی اس فیچر سے عبرت حاصل کی تو جانو میرے قلم کا حق ادا ہوگیا۔ ناصر صاحب نے کہا ہے کہ پھر چینل پر بھی ٹیلی کاسٹ کریں گے۔''

''اچھا سنو تم کچھ کہہ رہی تھیں۔''

''ہاں وہ میں کہہ رہی تھی کہ تم نے اتنا کام کیا ہے تمہاری تھکاوٹ دور کی جائے' کھانے پینے چلو گی؟''

''نیکی اور پوچھ پوچھ ویسے بیا یہ آج سورج کہاں سے نکلا ہے۔ یقین نہیں آرہا کہ تم اور تفریح؟''

''چلنا ہے تو چلو باتیں مت بناؤ۔''

کیبن میں داخل ہوتے ہوئے اس نے پوچھا ''دہی بھلے کھانے ہیں یا چاٹ؟''

''آج تمہارے زیر کرم ہیں جو کھلا دو۔''

''میری طرف کیا غور سے دیکھ رہی ہو؟''

''یہ نکھری نکھری رنگت اور نینوں کی چمک یہ لبوں پر مسکان تیرا چہرہ کہہ رہا ہے تیرے یار کا فسانہ! اس نے ٹیبل بجاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''اچھا جی ہم سے ہی پردہ داری۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو یقین اور بے یقینی کے دوراہے سے گزر رہی ہوں کبھی عاقب کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے یقین کرنے کو دل چاہتا ہے مگر دماغ نفی کر دیتا ہے۔ کہ کوئی انسان سچا نہیں ہے۔ سب کو ''طلب'' کی چاہ ہے۔ میں' میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی ویسے عاقب اور اس کی امی ہمارے گھر آئے تھے۔''

''واہ بھئی واہ ہم سے بالا ہی بالا سارے مرحلے طے ہوگئے۔''

''نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں' ویسے اس کی امی بڑی چالاک عورت ہیں' رئیلی ایسے چاروں اطراف گھور رہی تھیں اور جن نظروں سے مجھے دیکھا اللہ کی پناہ۔''

''کوئی بات نہیں ڈیئر' ظالم سماج محبت بھرے دلوں کے درمیان آ ہی جاتا ہے لیکن یہ شادی ہوگی اور ضرور ہوگی۔''

.....☆☆☆.....

''ثوبی تمہارے فیچر نے تو تہلکہ مچا دیا ہے۔''

''جی ہاں آج کل دھمکیوں سمیت مبارکباد کے فون وصول کر رہی ہوں۔ تم سناؤ کمزور لگ رہی ہو۔ خیریت ہے نا۔ دو چار دن تم سے ملاقات نہیں ہوئی اور تمہاری یہ کیفیت' یہ حالت یہ ہمارے ہجر کی کارستانی ہے یا عاقب.....؟ ارے ارے اتنی زخمی نگاہوں سے ہمیں نہ دیکھو ہم تو پہلے ہی گھائل ہیں۔''

''ثوبی تم سدا کی پاگل ہو' سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں دھوکے باز فلرٹی' پتا نہیں ہم لڑکیاں سب کچھ جانتے بوجھتے کمزور لمحوں کی گرفت میں کیوں آجاتی ہیں۔''

''نہیں یار عاقب ایسا نہیں ہے۔''

''یہ تمہاری بھول ہے ثوبی سب مردوں میں وفا نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ محترم اس دن کے بعد میرے پاس نہیں آئے' اور امی بار بار پوچھ چکی ہیں کہ اس کی امی آئی تھیں تو اب کیا ارادے ہیں۔ بتاؤ میں کیا کہوں۔ مجھے تو اس پر یقین تھا ہی نہیں مگر جب وہ امی کو لے کر آیا تو مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ سچا انسان ہے' فلرٹ نہیں ہے۔ مگر اب اس کی چپ سے کیا سمجھوں کہ اس نے مجھے.....''

بیا نے جھنجلا کر کہا۔ ''اور تم تو سچ جھوٹ پرکھنے کا دعویٰ کرتی رہتی ہو مگر عاطف سے دھوکا کھا لیا۔ ابھی تک تم عاطف۔ کے حصار میں ہو۔''

''جی نہیں مائی ڈیئر بیا میں جانتی تھی کہ عاطف فلرٹی ہے اس کا کام ہی نت نئے چہروں سے دل بہلانا ہے مگر میں اس جذبے سے مجبور تھی جو عاطف کو دیکھ کر میرے دل میں پیدا ہوا۔ اس لیے میں نے اپنے پسندیدہ بندے کے ساتھ اچھا وقت گزار لیا اور یہی گزرا وقت میرے لیے سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یار ذکر نہ چھیڑ پرانی داستان کا۔ ویسے تم فکر نہ کرو میں اس الو کی دم سے پوچھوں گی کہ اس نے اس قسم کی حرکت کیوں کی ہے؟''

''پلیز ثوبی میری خودداری اور انا کو داؤ پر مت لگانا۔ مجھے پہلے ہی بہت شرمندگی ہے۔''

''او کے او کے یہ میرا ہیڈک ہے کہ میں اس سے کیسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات کرتی ہوں۔"

☆☆☆

"کئی دنوں سے مجھے آپ کی تلاش تھی آپ تو ہاتھ ہی نہیں آرہے۔"

"دراصل میں گاؤں گیا ہوا تھا۔"

"خیریت؟"

"ہاں بس خیریت ہی تھی۔"

"عاقب صاحب مجھے آپ سے بات کرنی ہے بیا کے سلسلے میں۔"

"کہیے میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"کیا آپ بیا سے محض دل لگی کررہے ہیں یا واقعی اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔"

"ارے آپ کیسی باتیں کررہی ہیں' دراصل میں اسی سلسلے میں گاؤں گیا تھا ایکچولی امی کو جاب کرنے والی لڑکیاں پسند نہیں ہیں اور آپ جانتی ہیں کہ والد کی وفات کے بعد میں ہی اپنی فیملی کو سپورٹ کررہا ہوں۔ اس لیے میں امی کو ناراض اور دکھی نہیں کرنا چاہتا۔ میں پوری کوشش کررہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ امی مان جائیں گی' آپ بیا کو بتادیں کچھ عرصہ انتظار کریں۔ انشاء اللہ بہت بہتر ہوگا' پلیز آپ بھی دعا کریں۔"

'ارے میری تو نیک دعائیں آپ دونوں کے ساتھ ہیں۔"

"ثوبی! تم ایک ماہ کی چھٹی پر جارہی ہو۔ یار ہمارا کیا بنے گا' خیال کرو ہمارا' کیسے بتیں گے یہ دن۔"

"یوں" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ "نیا گرافال دیکھنا میری زندگی کی اولین تمنا ہے اب یہ خواہش پوری ہو رہی ہے' تو میں انجوائے کرنے کے لیے یہ چانس مس نہیں کروں گی۔ سنو تم میرے پیچھے چپکے چپکے شادی مت رچالینا۔"

☆☆☆

"بیا میں کل رات پاکستان پہنچی ہوں اور اب تمہاری طرف آرہی ہوں' گھر ہی رہنا اوکے۔"

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سرتال چھیڑے۔

"بیا پتہ تم ہو ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ یہ اجڑی مانگ' ویران چہرہ' بجھی بجھی آنکھیں' ایک مہینے میں تمہیں کیا ہوگیا۔"

"کچھ بھی تو نہیں زندہ ہوں۔ تمہارے سامنے ہوں۔"

"افوہ اسے زندگی کہتے ہیں۔ کہیں میرے بعد بیوہ تو نہیں ہوگئیں۔"

"بیوہ ہی سمجھ لو۔"

"چلو اٹھو فٹافٹ تیار ہوجاؤ آج تمہاری برتھ ڈے ہے لونگ ڈرائیو پر چلتے ہیں پھر تم مجھے K.F.C میں ٹریٹ دینا۔"

"پلیز ثوبی میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"اف بیا یہ مردم بیزاری اور ہاں تم نے ریزائن کیوں دیا؟"

"بس ثوبی جی نہیں چاہتا کچھ کرنے کو۔"

"واہ تو سارے فساد کی جڑ یہ محترم دل ہیں۔"

"ثوبی بیٹی تم کب آئی ہو؟ بیٹی اسے سمجھاؤ زندگی سے دور ہوتی جارہی ہے' بیا کی امی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں کیا روگ لگالیا ہے نہ کپڑے پہننے کا ہوش ہے نہ کھانا پینا یاد رہتا ہے نہ بہنوں سے نہ بھائی سے کوئی بات چیت' ہنسی مذاق' ملنا جلنا سب بند' ہم سب بہت پریشان ہیں اس کے لیے آج کل اس کے پروپوزل آرہے ہیں یہ کپڑے بدلے بغیر میلے کچیلے کپڑوں میں سر جھاڑ منہ پھاڑ چلی جاتی ہے' بھلا آج کل ایسا دور ہے لڑکے تو تیز طرار نوک پلک سنواری لڑکیاں پسند کرتے ہیں۔ ویران چہرے اجڑی مانگ اور بوڑھی روح کو کون پسند کرتا ہے؟ یہی تو عمر ہے شادی کی اگر یہ عمر گزر گئی تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ میں تو اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں۔"

"امی پلیز آپ..... میں ٹھیک تو ہوں۔"

"آنٹی آپ فکر نہ کریں میں اسے ابھی ٹھیک کرتی ہوں۔"

"ہاں جی اب بتاؤ کیا معاملہ ہے زندگی سے اتنی بے زاری کیوں؟ اور سناؤ عاقب کا کیا حال چال ہے؟"

"مت نام لو اس فلرٹی شخص کا' اب ماں کے نہ ماننے کا رونا رو رہا ہے۔" وہ پھٹ پڑی۔

"ارے بیا اس لیے تم نے یہ حلیہ بنا رکھا ہے اور زندگی جیسی خوب صورت نعمت کی ناشکری کررہی ہو۔ محض ایک شخص کی خاطر سب کو پریشان کررکھا ہے۔ بہت فضول ہو۔"

"پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ دیکھ لی ہیں سب کی محبتیں میں نے' محض دکھاوا' جب اللہ کو ہی بندے سے محبت نہیں ہے تو لوگ ہونہہ! اگر اللہ کو مجھ سے محبت ہوتی تو.....؟"

بیا بیا تم تم اتنی بدگمان ہو آج میں تمہیں آئینہ دکھاؤں گی یہ جو تم نے بدگمانی اور بے یقینی کا خود ساختہ خول چڑھا رکھا ہے یہ سراسر تمہاری خود پرستی ہے تم ایسا کرکے دوسروں کی توجہ حاصل کرتی ہو اگر تمہیں واقعی محبتوں کا یقین نہ ہوتا تو عاقب کے گریز کو تم محسوس نہ کرتیں اس کا مطلب ہے کہ تمہیں عاقب پر یقین تھا اس کی چاہت تمہارے دل میں بھی موجزن تھی۔ صرف بات یہ ہے کہ تم ناشکری ہو کسی حال میں خوش رہنا نہیں چاہتی اس لیے تم خود کو دھوکا دیتی ہو کیونکہ تم خود دھوکے باز' خود غرض ہو تمہیں تو اللہ سے بھی محبت نہیں ہے محض نماز روزے کا ڈھونگ رچا کر ظاہر کرتی ہو کہ تم بڑی اطاعت گزار ہو مگر.....

"شٹ اپ ثوبی جسٹ شٹ اپ۔" وہ ایکدم سے چیخ پڑی۔

"نہیں بیا آج مجھے بولنے دو جو لوگ واقعی دکھی ہوتے ہیں' وہ دکھوں کو چھپا کر جینے کا سلیقہ سیکھتے ہیں۔ وہ ہر ایک دکھ اور غم' پریشانی کو اللہ کی آزمائش سمجھتے ہوئے ہر وقت رونا نہیں روتے بلکہ صبر سے برداشت کرتے ہیں۔ وہ تمہاری طرح خود ساختہ دکھوں اور غموں کی نمائش نہیں کرتے وہ اپنے لبوں پر قہقہے سجالیتے ہیں تاکہ لوگ ان کے اندر جھانک ہی نہ سکیں لیکن تم تو لوگوں کی ہمدردیاں بٹورتی ہو اور اسی سے تمہاری نفسیاتی تسکین ہوتی ہے' بیا تم کتنے سالوں سے میرے ساتھ ہو کیا جانتی ہو میرے بارے میں؟"

"تم تم ثوبی ویری لکی' سب کی محبتیں حاصل ہیں تمہیں' محفلوں کی جان ہو تم اس لیے تمہارے لبوں پر مسکراہٹ سجی ہوتی ہے کہ نفرت اور غم کے بادل تمہیں چھو کر نہیں گزرے۔"

"ہاں بیا میں لوگوں کے نزدیک خوش قسمت ہوں مگر آج میں تمہارے سامنے اپنے کئی راز منکشف کروں گی ورنہ میں نے تو اپنے دکھوں اور غموں کو دل کے نہاں خانوں میں چھپا رکھا تھا۔ تم نہیں جانتی کہ میں لمحہ لمحہ محبت کو ترستی رہی ہوں' گورنس کی گود میں پرورش پانے والی وہ معصوم لڑکی ماں کی گود کے لیے تڑپتی رہی ہے مگر ماں جو اپنے اندر بے پناہ چاشنی اور محبت لیے ہوئے ہے سیمینار اٹینڈ کرنے میں مصروف رہی' میرا بچپن تو ریتلے صحرا میں گزرا ہے۔ پیسے دے کر میرے لیے گود خریدی گئی۔ یہ ہماری ایلیٹ سوسائٹی کا المیہ ہے جہاں ہر چیز چیک کے ترازو میں تولی جاتی ہے' یہاں تک کہ محبت اور رشتے بھی' جب کبھی میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر پاپا سے طلب کی چاہ میں ان کے کمرے میں جاتی تو پپا کہتے ثوبی بیٹے پیسے چاہئیں اور چیک کاٹ دیتے اور میں وہ بے جان چیک بے جان ہاتھوں میں تھام کر چلی آتی۔ یہی رویہ ممی کا ہوتا اور بھیا کو اپنے مشاغل سے فرصت نہیں تھی۔ ہم ایک ہی چھت تلے رہتے ہوئے قلبی اور خونی تعلق ہونے کے باوجود اجنبی اور انجان بن کر رہے ہیں اور پھر میں نے تنہا جینا سیکھ لیا مگر کبھی غم کو چہرے پر چھلکنے نہ دیا۔ خود ہی ٹوٹتی بکھرتی اور پھر خود ہی اپنے آپ کو سمیٹ کر دنیا کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوجاتی۔ میں نے اردگرد کے لوگوں میں محبتیں تلاش کیں' کسی نے میری امارت سے فائدہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹھایا کسی نے میری شوخی و شرارت سے' میں محبتوں کو ترسی ہوئی ان جھوٹی محبتوں پر یقین کرتی رہی۔ تم عاطف کی بات کرتی ہو میں جانتی تھی کہ اسے مجھ سے محبت نہیں ہے' مگر مجھے اس سے محبت تھی میں نے اس کے ساتھ کافی وقت گزارا۔ اس کی جھوٹی باتوں پر یقین کیا' کیونکہ وہ میری زندگی کی اولین خواہش تھی' پہلی اور آخری چاہت اور جب وہ میری زندگی سے نکل گیا تو میں نے اسے روگ نہیں بنایا بلکہ اللہ کی رضا پر راضی ہوگئی یہ سوچ کر کہ اللہ جو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے اسی میں میری بھلائی ہوگی۔ میں نے اللہ کی دی ہوئی اس زندگی کو عذاب اور آزار نہیں سمجھا بلکہ اس کی قدر کی ہے اس لیے آج میرے اردگرد محبتوں کی فراوانی ہے سچی اور مخلص۔ بیاڈیئر یہ دنیا ہنستے مسکراتے چہروں کی عادی ہے روتے بسورتے چہرے پسند نہیں کرتی۔ مجھے دیکھو میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں تہی دامن ہوں لیکن ہنس کھیل کر زندگی گزار رہی ہوں۔ اس ذاتِ باری تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ اگر مجھے کسی چیز کی کمی رہی ہے تو ہوسکتا ہے اس میں میری ہی کوئی کوتاہی ہو' اور سنو بیا' محبت انسان کو بزدل نہیں بہادر بنا دیتی ہے۔ پلیز تم بھی اس محبت کو روگ مت بناؤ محبت روگ نہیں ہے یہ تو معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے جو لوگ محبت کی خاطر دہلیز عبور کر لیتے ہیں یا اپنوں کو ناراض کر کے اپنی دنیا بسا لیتے ہیں وہ محبت نہیں کرتے ان کی محبت سطحی ہوتی ہے' محض پانے کی سطحی خواہش۔ اگر عاقب کی امی نہیں مانی ہوں گی تو وہ کیسے ماں کی ہستی کو چھوڑ کر تمہیں اپنا لے۔ اگر وہ ماں کو ناراض کر کے تمہیں اپنا لے تو میرے نزدیک وہ شخص تم سے بھی محبت کا دعویٰ نہیں کر سکتا جو خونی رشتوں کو محض محبت کے نام پر چھوڑ دے وہ کیسے مخلص ہوسکتا ہے' اس جیسا تو خود غرض دنیا میں نہ ہوگا اس لیے پلیز بیا بدگمانی اور بے یقینی کے اس خود ساختہ خول کو توڑ دو تم سے سب محبت کرتے ہیں اور ماں باپ کی محبت تو بغیر کسی غرض کے آئینے کی طرح شفاف ہوتی ہے۔ سب کو پریشان مت کرو۔ اف یار بول بول کے میرا حلق خشک ہوگیا ہے پلیز کچھ پلاؤ ورنہ میں فوت ہو جاؤں گی۔"

"او کے ٹوبی یو آر ویری گریٹ۔" اس نے پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ہونے والی اپنی اس دوست کو دیکھا جو دنیا سے اپنی محبتیں وصول کرنے کا ہنر جانتی تھی۔

☆☆☆

"عاقب صاحب مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی۔ آپ لوگ اس قابل ہی نہیں کہ....."

"ارے آج تمام تر توپوں کا رخ میری طرف کیوں؟ آتش فشاں بنی ہوئی ہیں آپ' کیا ہوا؟"

"آپ جیسے کم ظرف انسان اور گھٹیا لوگ ہی آتش فشاں بنا دیتے ہیں ہم لڑکیوں کو آپ کو میری دوست ہی ملی تھی بے وقوف بنانے کے لیے۔ اس کی زندگی تباہ کر دی آپ نے' آپ کی وجہ سے اس نے جاب چھوڑ دی' وہ ناصر کاظمی کی غزل کی تفسیر بن گئی ہے۔"

"نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے"

اف بہت برا کیا آپ نے اب آپ خود ساختہ مجبوریوں کا رونا رو رہے ہیں۔ امی نہیں مانتیں۔ آپ لوگ اپنی ماؤں سے پوچھ کر محبت کیا کریں۔ بہت خود غرض ہیں آپ لوگ محض چند لمحوں کو رنگین بنانے کی خاطر' جھوٹی انا کی تسکین کے لیے معصوم لڑکیوں کی زندگی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ میں آپ کو اور لوگوں سے الگ سمجھی تھی مگر آپ تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے نکلے۔ اگر میری دوست جو آپ کی وجہ سے تاریک راہوں کی مسافر بن رہی ہے کچھ ہوا تو میں آپ کو معاف نہیں کروں گی روزِ محشر میرا ہاتھ اور آپ کا گریبان ہوگا۔"

"مس ٹوبیہ بس یا کچھ اور! آپ نے تو الزامات کی بوچھاڑ کر دی ہے۔ میری بھی تو سنیں۔"

"کیا سنوں آپ بھی ہزار ہا لوگوں کی طرح اپنی خود ساختہ مجبوریوں کا رونا روئیں گے۔....."

"نہیں مس ٹوبیہ یہ بات نہیں' میں نے چند دن پہلے پڑھا ہے کہ بچھڑنے سے محبت امر ہو جاتی ہے۔ میں نے بھی بیا کو روح کی گہرائیوں سے چاہا ہے' میری چاہت میں احترام اور عقیدت کا جذبہ ہے' میں نے اپنے لمحوں کو رنگین بنانے کے لیے نہ کبھی اس کے ساتھ ہوٹلنگ کی اور نہ پارکنگ' یہاں تک کہ اپنے جذبوں کو زبان تک نہیں دی' میرے خاموش جذبوں نے آپ کے ذریعے بیا تک رسائی حاصل کی ہے' مجھے اس سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ مگر میں امی کو دکھی کر کے بیا کو ان چاہی بہو نہیں بنانا چاہتا۔ میری امی مجبور ہو کر مان بھی جائیں گی تو بیا بھی وہ مقام حاصل نہیں کر پائے گی جو ایک من چاہی بہو کا مقام ہوتا ہے۔ اسی میں ہم سب کی بہتری پوشیدہ ہے۔ میں نے اپنے اردگرد لو میرج کا انجام بھی دیکھا ہے۔ محبتوں کو نفرتوں میں بدلتے دیکھا ہے۔ بس میں نے فیصلہ کیا کہ میں بیا سے شادی نہیں کروں گا میں اپنی محبت کو نفرت میں بدلتے نہیں دیکھنا چاہتا ہوسکتا ہے کہ میں امی کی محبت کی خاطر اس سے زیادتی کر بیٹھوں یا اس کی محبت میں آ کر امی کی نافرمانی کر بیٹھوں دونوں صورتوں میں خسارہ تو میرا ہوگا۔ بیا میری اولین محبت ہے' وہ ہمیشہ ایک اچھی یاد کی طرح میرے دل میں رہے گی۔ موسموں اور وقت کے تغیر و تبدل کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

"کیا آپ شادی نہیں کریں گے؟"

"ہم معاشرتی حیوان ہیں مس ٹوبیہ' اور اس معاشرے میں رہتے ہوئے اس کے تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ میری بھی شادی ہو جائے گی' محبت ایک سطح پر رکنے کا نام نہیں ہے۔ محبت کا دائرہ تو بہت وسیع ہے۔ ایک کی محبت مارتی ہے تو دوسرے کی محبت جینے کا جواز بن جاتی ہے۔ آپ بیا کو سمجھائیں کسی اچھے شخص سے شادی کر لیں۔"

"کیا یہ آسان کام ہے عاقب صاحب' ہم لڑکیاں جب کسی جذبے کی اسیر ہوتی ہیں نا تو اس جذبے کے پیدا ہوتے ہی ایک گھر کے خواب بننا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ نہیں کہ ہماری روح تو کسی اور کی متلاشی رہے اور ہمارے ہاتھوں میں کسی اور کے نام کی مہندی رچا دی جائے' یہ جذبے ہم لڑکیوں کے لیے المیہ بن جاتے ہیں۔ آپ پلیز ایک بار پھر کوشش کریں اور اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔"

"سوری مس ٹوبیہ مجھے بددعاؤں سے ڈر لگتا ہے' میں اپنی امی اور بہنوں کو کسی صورت ناراض نہیں کر سکتا' بہو وہی کامیاب رہتی ہے دنیا میں جو من چاہی بہو ہو' ان چاہی بہو کے ساتھ بیٹا بھی بدبختی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یوں میں اپنی محبت کو پامال نہیں کرنا چاہتا کہ کبھی ہمیں پچھتاوے کا احساس ہو۔ میں نے بیا سے سچی محبت کی ہے اور سچی محبت شادی کی محتاج نہیں' بیا ہمیشہ میرے دل میں رہے گی۔ بچھڑنے کی تڑپ میں تمام عمر محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ میری محبت بچھڑ کر امر ہو جائے گی۔ یوں بھی محبت قربانی کا نام ہے ایک کو پانے کے لیے میں باقی لوگوں کو جنہوں نے مجھے اس مقام پر پہنچایا کھو دینے یا ناراض کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"او کے عاقب میں آپ کے جذبے کی قدر کرتی ہوں۔"

☆☆☆

"بیا میں یہاں سے جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟"

"خوابوں کے شہر پیرس۔"

"کیا؟"

"ہاں یار ماما پاپا اب چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ رہوں اور ہاں سنو بیا اور میرا یقین کرو کہ سب تم سے محبت کرتے ہیں۔ یو آر ویری لکی کہ عاقب نے بالکل ٹھیک کہا کہ وہ تمہیں اچھی یاد کی طرح دل کے نہاں خانوں میں رکھنا چاہتا ہے اور یار محبت ملاپ کا نام تو نہیں محبت تو قربانی کا نام ہے۔ مر مٹنے کا نام ہے۔ کاش کوئی مجھے بھی اس طرح یاد رکھتا' خیر چھوڑو۔ اب اللہ کی ناشکری کرنا چھوڑ دو' اس بات پر یقین رکھو کہ اللہ جو بھی کرتا ہے ہمارے لیے بہتر کرتا ہے کیونکہ ہم کچھ نہیں جانتے مگر وہ سب کچھ جانتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے اور کسی اچھے سے شخص سے شادی کر لینا۔"

☆☆☆

ماہ و سال بیت گئے۔ بالوں میں سفیدی آ گئی' چہرہ جھریوں زدہ ہو گیا۔ آتش دان میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی اس نے ہمیشہ ناشکری کی اور خود اپنے ہاتھوں سب کچھ کھو دیا اور وہ جو کبھی تہی دامن تھی؟ اس نے ایک بار پھر تصویر کو اٹھا کر دیکھا آج خوشیوں اور محبتوں کی خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ وہ دونوں مسکرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور ہونٹوں پر وہی ازلی مسکان۔ جیسے کہہ رہی ہو' دیکھو میں کبھی محبت کے پیچھے بھاگا کرتی تھی اور آج محبت میرے پیچھے بھاگ رہی ہے' اس نے کاغذ کا پرزہ اٹھایا اور ایک بار پڑھا لکھا تھا۔ پیاری بیا۔ اپنی شادی کی تصویر بھیج رہی ہوں' پتا ہے یار یہ شخص مجھے بے حد چاہتا ہے' اتنا کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی۔ ہاں یار ہم محبت تو ہر ایک سے کر سکتے ہیں ناں' البتہ عشق تو ایک ہی بندے سے ہوتا ہے۔ میں نے اس سر پھرے سے کہا کہ میں نے زندگی میں صرف ایک ہی شخص سے عشق کیا ہے اور اس کا نام عاطف ہے' تم اپنی خوبیوں کی وجہ سے مجھے اچھے لگتے ہو اور بس۔ جانتی ہو اس نے کیا کہا کہ دیکھو ثوبی میں تمہیں چاہتا ہوں اور میرے نزدیک یہی بات کافی ہے اگر تم خوشی سے میری چاہت قبول کر لیتی ہو تو میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھوں گا اور پھر میں نے اس کی چاہت محبت کے ساتھ قبول کر لی ہے۔ انکل اور آنٹی شہروز سے بھی بڑھ کر مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ سچ بیا میں جو کبھی محبت کی بھوکی تھی' تہی دامن تھی' آج محبتوں کی پھوار میں نہا رہی ہوں' میرے دونوں ہاتھ جو کبھی خالی تھے' آج محبتوں کو سمیٹتے سمیٹتے تھک جاتے ہیں۔ بیا آئی ایم ویری لکی اور یہ میرے ربّ کا انعام ہے کہ میں نے کبھی اس کی ناشکری نہ کی' اس نے جس حال میں رکھا اس کا سجدہ شکر بجا لائی۔ میرا رب ستر ماؤں سے بڑھ کر مجھ سے محبت کرتا ہے وہ کیسے اپنی شکر بجا لانے والی بندی کو فراموش کر دیتا۔ مجھے لگتا ہے بیاڈیئر تم آج بھی یونہی روٹھی ہوئی' دنیا سے خفا سب سے بدگمان ہو۔ میرے کسی خط کا جواب تمہیں دیتی ہو بس عید اور جنم دن پر تمہارا کارڈ مل جاتا ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ جو لوگ اللہ کی رضا میں خوش رہتے ہیں وہ محبتیں حاصل کرنے کا ہنر جانتے ہیں وہ کبھی تنہا نہیں رہتے اور دیکھ لو میں آج تنہا نہیں ہوں۔ بس میں اور "وہ" جلد تمہارے پاس ہوں گے۔ او کے اپنا خیال رکھنا۔ تمہاری ثوبی۔"

"ہاں ثوبی! تم نے سچ کہا تھا' میں نے ہمیشہ رب کی ناشکری کی۔ اس لیے میں نے سب کچھ خود گنوا دیا۔ آج صرف پچھتاوے ہیں' کتنے ہی ہاتھ میری طرف بڑھے اور میں نے بدگمانی کی زد میں سب کو جھٹک دیا۔ تم ٹھیک کہتی تھیں کہ میں اپنے آپ سے مخلص نہیں ہوں' دیکھو اسی لیے تو میں یہاں سب سے دور تنہائی کی آگ میں جل رہی ہوں۔ بیمار ہوں' تو کوئی دو گھونٹ پانی پلانے والا بھی نہیں' کبھی میرے گرد بھی محبتوں کی پھوار برسا کرتی تھی' مگر میں نے ہمیشہ ناشکری کی' مایوسی اور ناامیدی کا شکار رہی' یہاں تک کہ رب سے بھی منحرف رہی' کبھی کسی حال میں خوش نہ رہی تم جو کل تک خالی دامن تھیں مگر تمہیں دنیا سے محبتیں حاصل کرنے کا ہنر آتا تھا' تم ناشکری نہیں تھیں اس لیے یہ برکھا آج تم پر برس رہی ہے اور میں جس کے دامن میں ہر ایک نے محبتوں کے پھول ڈالے محض اپنی ناشکری' خود ساختہ بدگمانی کی بدولت خالی ہاتھ رہ گئی ہوں یا پھر مجھے دنیا سے اپنا حصہ وصول کرنے کا ہنر ہی نہیں آیا۔ آج صرف پچھتاوے کے آنسو ہیں کہ یہ تنہائی ناگ بن کر ڈستی ہے۔ سب سے رابطہ توڑ کر اب جو تنہا ہوں تو یہ تنہائیاں کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور آتش دان کی آگ بجھتی جا رہی تھی۔ ذہن و دل میں ایک آواز گونج رہی تھی۔

"اور اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

بازگشت

عزیزم عمران احمد قریشی!
السّلام علیکم!
امید ہے مزاج بخیر ہوگا' روایت سے ہٹ کر ایک کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ ایسی کہانیاں عموماً جنم لیتی ہیں لیکن گھروں کی چار دیواری میں ہی گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ مگر جب منظر عام پر آتی ہیں تو کئی المیے جنم لیتے ہیں میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں کہوں گا۔ بس کہانی پڑھیے اگر معیار پر پوری اترے تو قارئین کی عدالت میں پیش کر دیجیے۔

والسّلام
یونس خلش
ایبٹ آباد

"غفور نے باپ کو گھر سے نکال دیا۔"

صبح کے ناشتے پر یہ سنسنی خیز خبر اڑی۔ بات چوں کہ متوسط گھرانے کی تھی' شام تک سینہ بہ سینہ ادھر سے ادھر پورے محلّہ میں سفر کر گئی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس افسوس ناک خبر کا محرک' خمیدہ کمر تائی نوراں ہے۔ تائی نوراں محلے کا ضمیر تھی۔ پچاس کے پیٹے میں مگر دم خم اب بھی قائم تھا۔ بات کرنے کا ڈھنگ اور طریقہ رکھتی تھی۔ ایسی ایسی ہوش ربا خبریں جمع کر لیتی تھی کہ سننے والا دم بخود رہ جاتا تھا۔ بات کتنی معمولی کیوں نہ ہو لیکن تائی نوراں کو انداز بیان پر اتنی تحیر خیز دسترس تھی کہ سامع کا تجسس سوا ہو جاتا۔ محلے کی کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں تھی شادی ہو یا ولیمہ' غم ہو یا خوشی کی کوئی تقریب' اخبار نویسوں کی طرح موقع پر پہنچ جاتی تھی۔ ان موقعوں پر اس کی موجودگی عجیب سا تاثر چھوڑتی' بوڑھی عورتوں کے ابرو تن جاتے۔ بہار رسیدہ آنکھیں چمک اٹھتیں اور بچے کھل کھلا کر اس کے گرد حلقہ بنا لیتے۔ محلے کے کسی فرد کو کوئی خبر یا معلومات مطلوب ہوتی تو تائی نوراں سے رجوع کیا جاتا۔ اس وقت تائی کی شان اور وقار دیدنی ہوتا۔ وہ ناک پر انگلی لگا کر کہتی "مجھ سے کیا چھپا ہوا ہے۔" یوں یہ اس کا تکیہ کلام بھی تھا۔

غفور درجہ چہارم کا ملازم تھا۔ چار بچوں کا اس کے سر پر بار تھا۔ معمولی تنخواہ اور اوپر سے بوڑھے ماں باپ کا بوجھ' ان سب چیزوں نے اس کا معاشی توازن خراب کر رکھا تھا۔ مگر بہت سعادت مند اور برخوردار مزاج کا آدمی تھا۔ محلے کے ہر آدمی سے صاحب سلامت تھی۔ والدین کی خدمت کرتا' بچوں سے پیار اور بیوی سے کچھ واجبی سا تعلق تھا۔ جسے نہ نفرت کا نام دیا جا سکتا تھا اور نہ محبت' بس وضع داری نبھائے جا رہا تھا۔ اصل میں غفور ے بے چارے کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ سات برس کی عمر میں اس کی شادی ہوئی۔ دلہن کی عمر اس وقت کوئی سولہ برس تھی۔ اس بے جوڑ شادی پر رشتہ داروں نے اس کے والد کو بہت سمجھایا اہل محلّہ نے بھی باز رکھنے کی بہت کوشش کی' مگر اس کے والد نے کسی کی نہیں سنی'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہتا تھا۔ جب گھر میں شہنائی بجے گی اور چاند سی دلہن کے قہقہے آنگن میں گونجیں گے تو میری عمر دو نیم ہو جائے گی۔

غفورے کی شادی پر اس نے دل کی ساری حسرتیں پوری کیں۔ بڑے چاؤ سے بہو گھر لایا۔ اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔ مدتوں پس انداز کی ہوئی رقم اپنے بیٹے کی شادی پر اڑا دی۔ محلے والوں نے بہت سمجھایا میاں ہاتھ روک لو' کچھ کفایت کر لو لیکن وہ غفورے کی محبت میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ بڑے ارمانوں سے آج کا دن نصیب ہوا ہے۔ میں سارے ارمان نکالوں گا۔ لوگ خاموش ہو گئے۔ کچھ قیافہ شناس اور جہاں دیدہ تبصرہ کرتے کہ میاں بیوی کی عمروں کا یہ تفاوت کسی دن بوڑھا سینہ ویران کر دے گا۔ ان کا قیافہ اور تبصرہ کچھ غیر دانش مندانہ بھی نہ تھا۔ گلستان کو غفورے سے محبت تو تھی ہی بہو کی راہ میں بھی آنکھیں بچھا لیتا۔ اس کی ہر خواہش پر سر جھکا لیتا اور جتنے بھی سسر کو شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔ محلے میں سسر بہو کی محبت مثال بن گئی۔ جوان لڑکیاں جنتے کی خوش گوار زندگی پر رشک کرتیں۔ اسے خوش نما زرق برق لباس میں دیکھ کے ان کی پلکوں کے چراغ جل اٹھتے۔

غفورے نے جب پندرہویں برس میں قدم رکھا تو جنتے کے سر پر ایک سفید بال لہرانے لگا۔ یعنی محفل پر رنگ آیا تو چراغ کی لو مدھم پڑنے لگی۔ کبھی کبھی غفورے کے جوان سینے سے گھٹی گھٹی آہ برآمد ہوتی اور دل میں کانٹا سا چبھتا مگر گھر کا نظم و نسق پوری طرح اس کے والدہ کی گرفت میں تھا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں تدبر' فراست اور زمانے کا وسیع تجربہ تھا۔ سرکش جوانی' عمر رسیدہ بڑھاپے کے سامنے بے بس تھی۔ اس لیے گھر کے ماحول میں کبھی ابال نہیں آیا۔ چھ افراد پر مشتمل خاندان میانہ روی اور کسی حد تک خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب غفورے کے بچے بھی تھے۔ زندگی رواں دواں تھی کہ اچانک تائی نوراں نے دھماکا کر کے گھر کا سناٹا شکست کر دیا۔ محلے کا ہر شخص مبہوت' گم اور سراسیمہ تھا۔ جانے کیا آسیب داخل ہوا جس نے پرسکون زندگی کو شعلہ کر دیا اور گھر کا سارا نظام درہم برہم کر دیا۔ میں اس پر جتنا سوچتا اور الجھ جاتا۔ ڈور کا سرا نہیں مل رہا تھا۔ آخر ایک دن خبر رساں تائی نوراں کو بلایا اور یہ الجھن اس کے سامنے رکھتے ہوئے مغموم لہجے میں کہا۔ تائی' اس گھر کی خزاں پر میرا دل کڑھتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کیا جائے۔

''پر تیرے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھتا ہے۔'' وہ تیوری چڑھا کر بولی۔

''ایک شریف کا گھر اجڑ گیا ہے۔ انسانی ہمدردی کا.....''

''میں کیا کروں؟'' س نے میری بات اچک لی۔

''دیکھ تائی تو جانتی ہے کہ غفورے سے میرا کوئی رشتہ نہیں' مگر ایک رشتہ ایسا اٹوٹ ہے جس سے ہر آدمی دوسرے سے مربوط اور بندھا ہوا ہے۔ انسانیت کا لازوال رشتہ۔ محلے کا ہر آدمی تجھے عزت اور تکریم کی نگاہ سے

دیکھتا ہے۔ سارے لوگ تیری قدر کرتے ہیں تو اگر ذرا سی کوشش کرے تو باپ بیٹے میں صلح و صفائی ہو سکتی ہے ایک خاندان کی آبادی اور عزت کا مسئلہ درپیش ہے۔''

''مگر مصالحت نہیں ہو سکتی۔''

''یقیناً ہو سکتی ہے' اگر تو.....'' میں نے اصرار کیا۔

''میں کہتی ہوں نہیں ہو سکتی' زندگی بھر نہیں ہو سکتی۔'' وہ میز پر مکا رسید کر کے بولی۔

''آخر کیوں؟'' میرے لہجے میں سر بہ سر استفہام اور احتجاج تھا۔

''بات ہی کچھ ایسی ہے رے۔'' اس کا لہجہ بدستور اکھڑا ہوا تھا۔

''نہ تو تو کچھ بتاتی ہے اور نہ مصالحت پر آمادہ ہے۔ اتنی کٹھور دل نہ بن تائی۔'' میں نے دست بستہ ہو کے پھر التجا کی۔

تائی آنکھ بند کر کے گہری سوچ میں ڈوب گئی اور تا دیر چپ سادھ لی۔

''کیا سوچنے لگی ہو تائی۔ اس کا انہماک ٹوٹ گیا۔

''میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' اس نے ادھر ادھر دیکھ کر انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ''تجھے شاید معلوم نہیں جس روز غفورے نے باپ کو گھر سے نکالا' اس شام وہ ساتھ والے گاؤں گیا تھا۔ رات پچھلے پہر گھر لوٹا اور اسی روز صبح اس نے باپ کو گھر سے نکال دیا۔ اب سمجھا۔'' وہ ناگواری سے بولی۔

''تمہاری کوئی بات میرے پلے نہیں پڑی۔ کھل کر بات کر پہیلی نہ بجھوا۔''

''تیری عقل شاید چرنے گئی ہے۔'' وہ برافروختہ ہو گئی۔ ''چوداں جماعت کیا پاس کیا کہ خود کو افلاطون کا چچا سمجھتا ہے۔ اتنی سی بات تیری عقل میں نہیں سما رہی اور اترا تا تو ایسے ہے جیسے عقل کے گھوڑے پر سوار ہے۔ ان کتابوں کو چولہے میں ڈال دے۔'' اس نے میز پر رکھی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔

''تائی' تُو تو کو سنے دینے لگی' تیری زمانہ ساز بصیرت کے سامنے میری کیا حیثیت ہے۔''

''مجھے مسکا لگاتا ہے۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

''نہیں نہیں' میری کیا مجال ہے۔ بعد میں چاہے جتنے طعنے دینا پہلے بات تو بتا۔'' میری نرمی سے اس کی درشتی میں کمی آ گئی۔

''کان نزدیک کر'' اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ میں اس کے قریب جھک گیا۔ اس نے آہستگی سے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''کیا! سسر نے.....؟ نہیں!'' میں چیخ پڑا۔

''ہاں! اب اپنے ہونٹ سی لے اور ان سفید بالوں کا کچھ لحاظ کرنا۔'' اس نے تنبیہ کی۔

''میرے خدا۔'' میں سر تھام کر رہ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین پھٹ گئی ہو۔

''یہ بات سینے میں اتار دے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے دوبارہ انتباہ کیا۔

❁

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تلاشِ مجرم

محترم بھائی عمران احمد قریشی'
السّلام علیکم!
ایک اور تفتیشی کہانی حاضر ہے۔ آپ نے جس طرح میری رہنمائی اور سرپرستی کی اس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ آپ کے تعاون اور سرپرستی نے ہی مجھے لکھنے کا حوصلہ دیا آپ کے ساتھ میں ان تمام قارئین کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری تحریروں کو پزیرائی بخشی۔ ان شاء اللہ میں آئندہ بھی اپنے قارئین کو مایوس نہیں کروں گا۔

آپ کا اپنا
ریاض بٹ
حسن ابدال

میں نے اپنی پہلی تفتیشی کہانی میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ میں آپ کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں نے کب کب' کس کس تھانے میں تھانے دار کی حیثیت سے ڈیوٹی انجام دی تھی۔ صرف تفتیشی کہانیاں سناؤں گا۔ آج بھی میں اس بات پر قائم ہوں اور یہ میری مجبوری ہے لیکن ایک حقیقت تو اپنی جگہ اٹل ہے کہ میں تمام سروس ایک تھانہ میں تو رہا نہیں تھا یہ میری اور شوکی اور باقی ٹیم کے ساتھ آخری تفتیش تھی۔

وہ ایک خوشگوار صبح تھی۔ گرمیوں کا آخری پرندہ بھی اڑ چکا تھا۔ گلابی جاڑا شروع ہو چکا تھا۔ ہمیں اطلاع ملی کہ پیر شربت والی سرکار کو رات کسی نے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔ اطلاع پیر کا ایک مرید لے کر آیا تھا۔ ہم نے ضروری تیاری کے بعد مرید کو ساتھ لیا اور پیر کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

میرے ساتھ سپاہی اللہ دتہ اور سلطان محمود تھے۔

پیر کا ڈیرا شہر کے بڑے قبرستان کے پاس تھا۔

یہ مکان یا ڈیرا تقریباً پانچ مرلے میں تھا۔ دو کمرے اور ایک حجرہ تھا۔

صحن میں ایک آم کا درخت بھی تھا۔ جو کافی گھنا تھا۔ جو مرید اطلاع لے کر ہمارے پاس آیا تھا۔ اس سے ہم نے ابتدائی باتیں پوچھ لی تھیں اس مرید کا نام فضل دین تھا اور فضلو کہلاتا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ رات کو میں اور سائیں اس ڈیرے پر ہوتے ہیں۔ مجھے کل شام پیر صاحب نے ایک کام سے کسی دوسرے شہر بھیجا تھا۔ آج صبح منہ اندھیرے میں آیا تو حجرے کے ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھا۔ ارادہ یہ تھا کہ کچھ دیر آرام کرلوں گا اس وقت تک پیر صاحب بھی جاگ جائیں گے۔ ایک بات پر میں حیران تھا کہ آج صحن کی بجلی کیوں بند ہے لیکن ابھی میں صورتِ حال جاننے کے لیے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ میں جلدی سے اٹھا۔ میری جیب میں ماچس موجود تھی۔ میں نے دیا سلائی جلا کر دیکھا اور اچھل پڑا یہ تو سائیں تھا۔ اس کا سر پھٹا ہوا تھا اور پھٹے ہوئے سر سے خون نکل رہا تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر میرے ذہن سے آواز آئی۔

ہوش کرو' جلدی سے اس کا خون بند کرو۔ ورنہ......! اس دوران میں پانچ چھ دیا سلائیاں جلا چکا تھا۔

دیا سلائی جلا کر ہی میں نے صحن میں لگے بلب کا سوئچ آن کیا۔ شکر ہے صرف سوئچ ہی بند تھا یا کیا گیا تھا۔

اب ہر چیز واضح تھی۔ میں نے پہلے کمرے سے صاف کپڑا لا کر سائیں کے سر سے بہتا ہوا خون صاف کیا اور پھر کس کر کپڑے کی پٹی بنا کر اس کے سر پر باندھ دی۔

اب پیر صاحب کو صورتِ حال بتانا ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے محتاط قدموں سے حجرے کے دروازے پر دستک دی لیکن دروازہ تو میرے ہاتھ کے دباؤ کے ساتھ ہی کھل گیا۔ اندر بلب جل رہا تھا اور پیر صاحب چت پڑے تھے۔ وہ اپنے ہی خون میں لت پت تھے۔

✡......✡......✡

اور اس وقت ہم دیکھ رہے تھے کہ پیر صاحب کو کلہاڑی کے وار کر کے بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔ تقریباً دس زخم میں نے انگلیوں پر گنے۔ ہم نے ضروری کارروائی کر کے لاش کو تھانے پہنچا دیا۔ ڈیرے کا صحن کچا تھا۔ کھرے اٹھانے کا کام بھی سپاہی اللہ دتہ نے مکمل کر لیا تھا۔ میں نے فضل دین کو ساتھ لے لیا تھا۔ اسے فی الحال ایک علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا اور ایک سپاہی کو اس کی نگرانی پر مامور کر دیا۔

یہاں دو باتوں کی وضاحت کر دوں کہ سائیں اس وقت اسپتال میں تھا۔ اسپتال ڈیرے سے قریب ہی تھا۔ فضل دین نے سائیں کو اپنے کاندھے پر لاد کر وہاں پہنچایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ پہلے تھانے جاؤ۔

اس نے تھانے تو آنا ہی تھا۔ کیونکہ پیر قتل ہو گیا تھا۔

دوسری بات جس پر آپ کو بھی حیرانی ہو رہی ہو گی کہ اگر پیر قتل ہو جائے تو ان کے ڈیروں پر ایک جم غفیر لگا ہوتا ہے لیکن یہاں معاملہ الٹ تھا۔ دراصل یہ پیر اور اس کے یہ چیلے (میں ان کو چیلے ہی کہتا ہوں) ابھی چند دن پہلے ہی یہاں آئے تھے اور یہ ڈیرا کرایہ پر لیا تھا۔ باقی تفصیل آگے آئے گی۔

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا کر ابھی میں اپنے کمرے میں آیا ہی تھا کہ شوکی بھی آ گیا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ جونہی صبح تھانے میں آتا تھا۔ سلام دعا کرنے میرے کمرے میں آ جاتا تھا۔

جب اسے واردات کے متعلق پتا چلا تو اس نے کہا۔

"اب کیا پروگرام ہے سر......؟"

"میرا ارادہ یا پروگرام تو اس اسپتال میں جانے کا ہے جہاں سائیں داخل ہے۔" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے سر میں چائے اور انڈوں کا کہہ آیا ہوں۔ ان سے دو دو ہاتھ کر کے چلتے ہیں۔" شوکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیکن ہمیں اسپتال جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس کے بدلے یہ اطلاع آ گئی کہ سائیں بے ہوشی ہی کی حالت میں چل بسا ہے۔ اب یہ دوہرے قتل کی واردات بن گئی تھی۔

بہر حال سائیں کی لاش بھی پوسٹ مارٹم کے لیے کے پاس پہنچادی گئی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں اگلے دن آنی تھیں۔ اس دوران ہم نے ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو بیٹھنا نہیں تھا۔ ہم نے فضل دین کو بلا لیا۔ فضل دین مضبوط ہاتھ پیر کا ایک قبول صورت بندہ تھا۔ عمر کا اندازہ میں نے چالیس سال کے قریب لگایا۔

"ہاں بھئی' فضل دین اب سچ بولو۔" شوکی نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''سرکار' میں نے پہلے بھی سچ ہی بولا تھا۔'' اس نے ہاتھ باندھ دیے۔

''یہ ہندوؤں کی طرح ہاتھ نہ باندھو۔ اصل بات بتا دو۔ ورنہ الٹا لٹکا کر نیچے مرچوں کی دھونی لگا دیں گے۔'' میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔

وہ باقاعدہ رونے لگ گیا۔ ہم نے اس کے آنسوؤں پر تو جانا نہیں تھا۔ اس لیے شوکی نے اسے ڈپٹ کر کہا۔

''شروع ہو جاؤ۔''

اور وہ شروع ہو گیا۔ اس نے جو کہانی سنائی وہ اس طرح ہے۔

یہ لوگ یعنی پیر صاحب' فضل دین اور سائیں اس سے پہلے پچاس میل دور ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا نام میں ظاہر نہیں کروں گا۔ وہاں مریدوں کی کمی نہیں تھی۔ یہ دو مرید تو دن رات پیر صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ وہاں پر پیر صاحب' پیر شربت والی سرکار کے نام سے مشہور تھے۔ دراصل پیر صاحب چینی دم کر کے دیتے تھے اور سائل گھر جا کر اسے پانی میں حل کر کے شربت بناتے تھے اور فیض حاصل کرتے تھے۔ جب لوگ کمزور عقیدے کے ہوں گے تو شربت والی سرکار جیسے پیروں کی چاندی تو ہو گی۔ سب کام ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اچانک ایک ایسی بات ہو گئی جس نے پیر صاحب کے پاؤں اکھاڑ دیے۔

ایک عورت پیر صاحب کے پاس آئی اور بتایا کہ اس کا زیور گم ہو گیا ہے۔ حساب لگا کر بتائیں کہ زیور کون لے گیا ہے۔ عورت خوب صورت تھی۔ پیر صاحب نے حساب لگا کر کچھ اشارے بتائے جو ایک عورت پر فٹ آ گئے۔ جس کا زیور گم ہوا تھا وہ عورت ان کے گھر آئی تھی۔ اپنی چالاکی سے پیر صاحب نے اس عورت کا حلیہ معلوم کر لیا تھا۔ جس عوت کا زیور گم ہوا تھا۔ اس کو پتا بھی نہیں چلا کہ پیر صاحب نے کیا چکر چلایا ہے؟ بہر حال اس چکر نے پیر کو چکر میں پھنسا دیا۔ دراصل جب اس عورت نے (جس کا زیور گم ہوا تھا) دوسری عورت پر الزام لگا دیا۔ تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ بات مرنے مارنے پر پہنچ گئی۔ ایک سمجھ دار بزرگ نے دونوں پارٹیوں کو ٹھنڈا کیا اور کہا۔ اس الزام کا محرک کیا ہے اور جب اسے محرک پتا چلا تو اس نے کہا۔ کن خرافات میں پڑ گئے ہو۔

بہر طور وقتی طور پر تو معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا لیکن ایک دن پھر لڑائی ہو گئی اور بات تھانے کچہری تک جا پہنچی۔ دونوں طرف کے کچھ آدمی اور عورتیں زخمی ہو گئیں۔ اس علاقے کے تھانیدار نے ان کا راضی نامہ کروا دیا۔

بقول فضل دین کے ایک صبح ایک جوان آدمی پیر صاحب سے ملنے آیا اس وقت فضل دین پیر صاحب کے پاس ہی موجود تھا۔ جوان نے پیر صاحب سے غصے میں کہا۔

''میں تم جیسے پیروں کو خوب جانتا ہوں۔ تمہارے پاس کون سا غیب کا علم ہے جو تو نے میری ماں پر الزام لگوا دیا۔

پیر صاحب نے جلال سے کہا۔ ''مورکھ' میں نے تمہاری ماں کا نام تو نہیں لیا تھا۔ تم حد ادب ملحوظ رکھو ورنہ.....!''

''ورنہ تم کیا کرو گے؟'' جوان نے قبلہ پیر صاحب کا گریبان پکڑ لیا۔ فضل دین نے شور ڈالا تو سائیں بھی دوڑا چلا آیا۔ چونکہ اس وقت صبح صبح کا وقت تھا اس لیے ابھی سائلوں کی آمد شروع نہیں ہوئی تھی۔

شاید اس لیے جوان نے یہ وقت چنا تھا۔

بہر کیف دونوں نے بڑی مشکل سے پیر صاحب کو اس جوان سے نجات دلائی۔

جوان جاتے جاتے دھمکی دے گیا کہ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں تمہارے ٹوٹے ٹوٹے کر کے کوؤں کو نہ کھلایا تو میرا نام عشرت جٹ نہیں۔

فضل دین یہاں تک پہنچ کر خاموش ہو گیا۔ میں اور شوکی اس کی یہ کہانی بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ کافی دیر خاموشی میں گزر گئی۔

''آگے کیا ہوا؟'' شوکی نے پوچھا۔ کیونکہ خاموشی کا وقفہ طویل ہو رہا تھا۔

''سرکار.....!'' وہ جیسے خیالات سے چونک پڑا۔ ''ایک رات ہم نے ڈیرے پر پراسرار حرکات دیکھی تھیں۔

''کیا مطلب کیسی حرکات؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے ذرا سخت اور تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس وقت ہم خود ان حرکات کو کوئی معنی نہیں دے سکے۔ البتہ ہم اور پیر صاحب ڈر گئے۔''

''تمہارے پیر صاحب تو پہنچی ہوئی چیز تھے۔ ان کو بھی کچھ پتا نہیں چلا۔'' شوکی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ ہمارے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے پاس ہمارے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پھر یہ ہوا کہ اس نے اگلی بات خود ہی بتا دی۔

انہوں نے پیر صاحب سے کہا کہ یہاں سے کہیں اور چلتے ہیں۔ یہاں ان کی جان کو خطرہ ہے۔

اس طرح معاملات ان کو میرے تھانے کی حدود میں لے آئے۔ آگے جو کچھ ہوا وہ آپ کے علم میں آ چکا ہے۔

جس مکان کو انہوں نے اپنا ڈیرا بنایا تھا۔ وہ انہوں نے کرایے پر لیا تھا۔ ابھی یہاں کسی کو بھی پتا نہیں تھا کہ یہ کون ہیں۔ ابھی انہوں نے یہاں پاؤں جمانے تھے۔ اسی لیے جب ہم ڈیرے پر گئے تھے تو چند مرد و زن کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔

فی الحال فضل دین کو ہم نے حوالات میں بند کر دیا۔

اگلے دن میں نے تھانے کا انتظام شوکی کے حوالے کیا اور خود سپاہی اللہ دتہ کو ساتھ لے کر فضل دین کے بتائے ہوئے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا ہم گاؤں کی حدود میں واقع تھانے میں گئے۔

وہاں کے تھانے دار نے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک سپاہی ہمارے ساتھ کر دیا۔ چھوٹا گاؤں ہونے کی وجہ سے عشرت کا گھر جلد ہی مل گیا۔ عشرت ایک خوب صورت اور کسرتی بدن کا حامل ثابت ہوا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں اس کے چہرے کو بارعب بنا رہی تھیں۔ عمر بیس اور بائیس کے لگ بھگ تھی۔

ہم نے اسے کیسے چھاپا؟ اس کو بیان کرنے کے لیے قیمتی صفحات کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ آپ آگے کی کہانی سنیے لیکن یہاں اتنا بتانا ضروری ہے کہ فی الحال ہم نے فضل دین کی ہر بات پر یقین نہیں کر لیا تھا۔ لیکن عشرت مشتبہ تو تھا اور اس کے پاس پیر کو قتل کرنے کا جواز بھی موجود تھا۔

ہم نے اس سے کلہاڑی بھی مانگی تھی۔ جو اس نے لا کر ہمارے حوالے کر دی تھی۔ بظاہر کلہاڑی پر کسی قسم کا نشان نہیں تھا لیکن میری تجربہ کار نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ کلہاڑی کو رگڑا گیا ہے۔

بہر حال کاغذی کارروائی مکمل کر کے ہم شام ڈھلے واپس اپنے تھانے میں پہنچ گئے۔ عشرت نے صرف اتنا کہا تھا کہ میں نے پیر کو قتل نہیں کیا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

البتہ اس کے بعد وہ چپ ہو گیا تھا۔

تھانے میں شوکی الرٹ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں آج نہیں آئیں اگلی صبح متوقع تھیں۔

میں نے اور شوکی نے مشورہ کر کے فی الحال عشرت کو ایک الگ حوالات میں بند کر دیا اور آرام کرنے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دوسری صبح جب ہم تھانے میں پہنچے تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ آج میں اور شوکی ساتھ ساتھ تھانے میں داخل ہوئے تھے۔

کلہاڑی کو ہم نے رات کو ہی پارسل بنا کر ٹیسٹ کے لیے بھیج دیا تھا۔ ہم کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں دن دس بجے موصول ہو گئیں۔

پہلی رپورٹ پیر صاحب کے متعلق تھی۔ پیر صاحب کا قتل رات دو اور تین بجے کے درمیان ہوا تھا۔ جسم پر پندرہ زخم تھے اور رپورٹ میں آلۂ قتل کلہاڑی یا اس جیسے ہتھیار کو ظاہر کیا گیا تھا یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ قاتل پیر کے لیے اپنے دل میں شدید نوعیت کی نفرت رکھتا تھا۔

دوسری رپورٹ سائیں کے متعلق تھی۔ اس کے سر میں کسی مضبوط لکڑی کے ڈنڈے یا دستے سے چوٹ لگائی گئی تھی اور اس کی موت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ یعنی اسے اسپتال تاخیر سے پہنچایا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹوں کے ساتھ لاشیں بھی آ گئی تھیں۔

فی الحال ان لاشوں کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ بقول فضل دین تینوں کے لواحقین مر کھپ گئے تھے۔ فضل دین کو ہم چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ ابھی معاملہ اندھیرے میں تھا۔

بالآخر ہم نے وہی کیا جو ان لاشوں کا کرتے تھے۔ یعنی ایک فلاحی تنظیم کو یہ لاشیں دے دیں۔ انہوں نے انہیں اماناً دفنانا تھا۔

یہ سارے کام نمٹاتے نمٹاتے سہ پہر ہو گئی۔ شوکی نے چائے منگوالی۔ چائے ہم نے اسی ہوٹل سے منگوائی تھی جس کے مالک کا نام امانت ہے۔ اس کا ذکر میری تفتیشی کہانی منصوبہ ساز میں آ چکا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر اس وجہ سے کرنا پڑ رہا ہے کہ اس تھانے میں یہ میری آخری تفتیش تھی۔

"سر امانت کے ہاتھ میں واقعی جادو ہے۔" شوکی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"واقعی بھئی جو چیز تعریف کے قابل ہو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیے۔" میں نے اپنی خالی پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر مزید کہا۔ "اور چائے ڈالو۔"

اس طرح امانت کی باتیں کرتے ہوئے چائے ختم ہو گئی۔

وہ دور اس بڑھاپے میں بھی مجھے یاد آتا ہے تو دل سے ایک آہ نکل جاتی ہے۔ کتنا پرسکون دور تھا کتنی خالص چیزیں ملتی تھیں۔ نہ خودکش دھماکے تھے نہ ڈینگی وائرس نہ اتنی ٹینشن۔

البتہ قتل اس وقت بھی ہوتے تھے۔ آج بھی ہو رہے ہیں۔ اس وقت قتل کی ٹھوس وجوہات ہوتی تھیں آج کل سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ خیر ان باتوں پر دل دکھتا ہے۔ میں آپ کو دہرے قتل کی کہانی سنا رہا ہوں۔

اس کے بعد ہم نے عشرت کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"ہاں بھئی عشرت! اقبالِ جرم کرو گے یا نہیں۔"

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"جناب میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ.....!"

"پہلے اور آگے کو چھوڑو۔ تم نے مَردوں والا کام کیا ہے۔ ایسے ڈباپیروں کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ اب مردوں والا ایک اور کام کرو اور اقبالِ جرم کر لو۔" میں نے اسے پھونک دیتے ہوئے کہا۔

"سنا ہے آپ لوگ تو تھپوں سے بھی اقبالِ جرم کروا لیتے ہیں۔ وہی طریقہ مجھ پر بھی آزما لیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنی کسی کہانی میں کہا تھا کہ شوکی غصہ کا تیز تھا جونہی اس نے اٹھنا چاہا میں نے اس کا کاندھا دباتے ہوئے اسے بٹھا دیا اور خود اٹھ کر عشرت کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خنک لہجے میں کہا۔ "البتہ اوہ ہاں۔" مجھے اچانک یاد آ گیا کہ یہ لفظ اس نے استعمال کیا تھا۔

"میں نے تمہارے گاؤں میں تم سے پوچھا تھا کہ پیر کو تم نے قتل کیا ہے تو تم نے کہا تھا نہیں البتہ.....! اس البتہ سے تمہاری کیا مراد تھی؟"

"جناب اس البتہ سے میری یہ مراد تھی کہ میں پیر کو قتل کرنا چاہتا تھا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

پھر اس نے اپنی بے گناہی میں دلیلیں دینی شروع کر دیں۔ سب سے بڑی دلیل یہ دی کہ اسے پیر کے متعلق پتا ہی نہیں تھا کہ وہ یہاں آ گیا ہے۔ البتہ پیر اور اس کے چیلوں کا اچانک غائب ہو جانا اس کے لیے حیرانی اور تشویش کی بات تھی کیونکہ وہ ہر حال میں پیر کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ بقول اس کے ایسے پیروں کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خاتمہ ضروری تھا۔ اس بات کا اس نے اقرار کرلیا کہ رات کے اندھیرے میں کلہاڑی لے کر وہ پیر کو قتل کرنے پرانے ڈیرے پر گیا تھا لیکن دونوں چیلے جاگ رہے تھے وہ واپس آ گیا اور پیر کو قتل کرنے کے منصوبے بناتا رہا۔ پرانے ڈیرے کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ ڈیرا ابھی شروع میں کرایہ پر لیا گیا تھا لیکن بعد میں جب پیر کا کام چل نکلا اور وہ مشہور ہو گیا تو مالک نے کرایہ لینا چھوڑ دیا اور اس کا مرید بن گیا۔

ان باتوں سے ہمارا مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ ہمیں قاتل یا قاتلوں کی تلاش تھی۔ عشرت کی باتوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔

پھر قاتل کون تھا؟ اور پیر کے ساتھ سائیں کو کیوں قتل کیا تھا۔ فی الحال ہم نے عشرت کو دوبارہ حوالات میں بند کر دیا اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہمارے دماغ دکھ رہے تھے لیکن ہم اپنے فرض سے مجبور تھے۔ دُہرے قتل کی رپورٹ اوپر پہنچ چکی تھی۔ تاخیر اچھی نہیں تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اللہ دتہ نے اپنا کام مکمل کرلیا ہوگا۔

ابھی میں اسے بلانے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود ہی آ گیا۔

''ہاں بھئی کیا خبریں ہیں۔'' شوکی نے کندھے ہلاتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں استفسار کیا۔

پھر اس نے اپنی مرتب کی ہوئی رپورٹ ہمیں دے دی۔ رپورٹ نے ہماری مزید کوئی رہنمائی نہیں کی۔ کیونکہ مجرم یا مجرموں نے سارے کھرے مٹا دیے تھے۔

اس کا مطلب تھا اکھاڑو سے پالا پڑا ہے۔

جب سپاہی اللہ دتہ چلا گیا تو ہم وہیں کھڑے تھے۔ جہاں پہلے تھے کسی کسی کیس میں ایسا بھی ہو جاتا تھا۔

''سر، قتل کا محرک کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔'' شوکی کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا تھا۔

''اوہ ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہو سکتا ہے پیر صاحب نے کوئی اور بھی گل کھلا دیا ہو؟'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔

آخر ہم نے ایک فیصلہ کیا ابھی میں آپ کو اس فیصلے سے آگاہ نہیں کروں گا۔

پھر ہم آرام کرنے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ یعنی میں اور شوکی۔ دوسری صبح ایک سنسنی خیز اطلاع ہماری منتظر تھی۔ لیکن یہ اطلاع ہمارے لیے سنسنی خیز نہیں تھی۔ ہم نے اطلاع لانے والے کو کچھ ضروری ہدایات دے کر رخصت کر دیا اور اسے اپنی زبان بند رکھنے کی تاکید کی۔

کلہاڑی کے متعلق رپورٹ بھی موصول ہو گئی۔ جس کا ذکر فی الحال مناسب نہیں۔

پروگرام کے مطابق میں نے سپاہی انور کو ساتھ لیا اور ایک بار پھر عشرت کے گاؤں جا پہنچا۔ اس بار ہم گاؤں کے نمبردار کے گھر میں بیٹھے۔ نمبردار ہماری خاطر تواضع کے لیے دوڑ دھوپ میں لگ گیا حالانکہ میں نے منع کر دیا تھا۔

بہر حال کھوئے والے حلوے اور گرم گرم دودھ سے ہمیں دو دو ہاتھ کرنا پڑے۔

نمبردار کا نام شفقت علی تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ تمہارے گاؤں کا ایک جوان ہے عشرت اس کے متعلق کچھ معلومات چاہئیں۔

''جناب، مجھے پتا چلا تھا کہ آپ لوگ پہلے بھی گاؤں میں آئے تھے اور عشرت کو لے گئے تھے لیکن آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں تھا۔''

''دیکھو شفقت علی ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ پوچھیں۔''

''کیا عشرت صرف بڑھکیں مارنے والا ہے یا.....؟'' میں نے دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ دراصل یہ خاندان شریف ہے۔ کبھی کسی کے ساتھ ان کا جھگڑا وغیرہ نہیں ہوا لیکن ان کی بہت بے عزتی ہوئی ہے۔ زیورات کی چوری کے سلسلے میں اور عشرت گاؤں میں کہتا پھرتا تھا کہ وہ پیر کو دنیا کے تختے سے اکھاڑ پھینکے گا۔'' شفقت علی نے جواب دیا۔

''اور واقعی اس نے ایسا کر دیا۔ کیوں.....؟'' میں نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو سوہنا رب ہی جانتا ہے البتہ ایک بات ہے کہ پیر اور اس کے دو چیلے تو راتوں رات غائب ہو گئے تھے۔'' عشرت نئی جگہ پہنچا۔ کس طرح ہوگا؟

''کیا یہ ناممکن ہے؟'' میں نے اسے گھورا۔

''میرا یہ مطلب نہیں جناب میں تو ایک امکان ظاہر کر رہا تھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ پھر اس نے مجھ سے ایک بات پوچھی۔ جس کا میں نے اسے جواب دیا اور ساتھ یہ تاکید بھی کر دی کہ منہ بند رکھے۔ شام تک ہم واپس آ گئے۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل اِدھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔ خنکی بڑھ چکی تھی رونگٹے کھڑے کر دینے والا سماں تھا۔ کیونکہ ہم قبرستان میں چھپے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ سلطان محمود اور سپاہی انور تھے۔ ہم مسلح تھے اور ہمارے پاس بڑی بڑی ٹارچیں تھیں۔

ہم سے پچاس گز کے فاصلے پر شوکی دو مسلح اہلکاروں کے ساتھ مشرق کی طرف چھپا ہوا تھا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ ہمیں شیروں کا شکار کرنا پڑ سکتا ہے لیکن اصل میں ہمارا پالا ایسے گھوڑوں سے تھا جنہوں نے بھونڈے طریقے سے اپنے آپ کو شیروں کی کھال میں محفوظ کیا ہوا تھا اور سمجھ رہے تھے کہ وہ واقعی محفوظ رہیں گے اور اپنا کام کر کے صاف نکل جائیں گے۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ صرف کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز اس خاموشی کا سینہ شق کر دیتی تھی۔

پھر وہ سناٹا۔

اس طرح مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ہمیں یقین نہیں تھا کہ آج ہی کچھ ہوگا لیکن یہ تو ایک جوا تھا جس سنسنی خیز خبر کا میں نے ذکر کیا تھا وہ یہی تھی کہ کل رات بھی کچھ پراسرار نقل و حرکت دیکھی گئی تھی قبرستان میں۔

اطلاع آج صبح گورکن لے کر آیا تھا۔ ہم نے اسے جو ہدایات دی تھیں ان میں یہ ہدایت بھی تھی کہ آج وہ اپنی کوٹھری میں نہ سوئے اور مجھے یقین تھا کہ اس نے ہماری ہدایت پر ضرور عمل کیا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ مایوسی ہمارے ذہنوں پر دستک دیتی۔ ہمیں ہائی الرٹ ہونا پڑا۔

گورکن کی کوٹھری سے ہمیں ہلچل سی محسوس ہوئی۔ اندھیرا اتنا تھا کہ کوئی چیز واضح نظر نہیں آ رہی تھی۔

پھر ہمیں ننھی ننھی تین روشنیاں نظر آئیں۔ انہوں نے پنسل ٹارچیں روشن کر لی تھیں اور وہ تین تھے۔

وہ اس طرف بڑھ رہے تھے۔ جس طرف ابھی کوئی قبر نہیں کھودی گئی تھی۔ جگہ خاصی تھی۔ مجھے امید تھی کہ شوکی وغیرہ بھی الرٹ ہو چکے ہوں گے۔ میں نے اللہ دتہ اور سلطان محمود کو سرگوشی میں آگے بڑھنے کے لیے کہا اور ہم سینے کے بل آگے سرکنے لگے۔ خطرہ تو موجود تھا۔ مگر فرض کی راہ میں خطرے تو مول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لینے پڑتے ہیں۔

سایوں کی حرکت ایک جگہ رک گئی۔ میں نے ان سے بیس قدموں کے فاصلے پر رک جانا مناسب سمجھا۔ ظاہر ہے میرے ہمراہی بھی رک گئے ہوں گے۔

یہ احساس بھی مجھے ہوگیا تھا کہ شوکی وغیرہ سے ہم صرف دس قدموں کے فاصلے پر ہیں۔

پھر.....!

رات کی تاریکی میں زمین کھودنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم سانس روکے پڑے رہے۔

جب یہ آوازیں بند ہوگئیں تو ہم نے دو منٹ انتظار کیا۔

اچانک رات کی تاریکی میں مجھے شوکی کی سانپ کی پھنکار سے مشابہ آواز سنائی دی۔ ”ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ تم ہماری گنوں کی زد پر ہو۔“ اور ساتھ میں دو طاقت ور ٹارچوں کی روشنی سایوں کی آنکھوں پر پڑی ہم کب پیچھے رہنے والے تھے اللہ دتہ اور سلطان محمود نے بھی ٹارچیں روشن کرلیں۔ میں نے بھی ٹارچ روشن کرلی اور ریوالور نکال کر اس کا رخ بوکھلائے ہوئے مجرموں کی طرف کردیا۔ وہ اس اچانک پڑنے والی افتاد سے گھبرا چکے تھے۔ انہیں ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع بھی نہیں ملا۔

اور ہم نے مالِ غنیمت سمیت انہیں چھاپ لیا۔

وہ تین تھے اور ہم چھ۔ اس وقت ہر طرح سے ہمارا پلہ بھاری تھا۔ ان کے پاس بھی اسلحہ تھا لیکن کسی قسم کا خون خرابہ نہیں ہوا۔

اور.....!

ہم نے انہیں لاکر حوالات میں بند کردیا اور تھانے کا نظام سلطان محمود کے حوالے کر کے میں اور شوکی آرام کرنے چلے گئے۔

بارہ بجے واپس آ کر میں اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ شوکی بھی تازہ دم ہوکر آ گیا۔

ہم نے مجرموں کو حوالات سے نکال کر ٹرائل روم میں پہنچوادیا۔ حوالدار ہیبت خان اور سلطان محمود نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔

مگر انہوں نے ہمیں ذرا بھی پریشان نہیں کیا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ ان کے پاس حیل و حجت اور انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انہوں نے اقبالِ جرم کرلیا اور ہم نے انہیں دوبارہ حوالات میں بند کردیا۔ اب چالان مکمل کر کے انہیں حوالۂ عدالت کرنا تھا۔

یہ سب کچھ تو ہوگیا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ان کی نقاب کشائی کب ہوگی؟ لیجیے جناب نقاب کشائی حاضر ہے۔

ان میں ایک تو پیر کا چیلا فضل دین تھا اور دوسرے دو اس کے ساتھی۔ بات اس فیصلے سے شروع کرتے ہیں۔ جو ہم نے کیا تھا ہم نے متفقہ فیصلہ کر کے عشرت اور فضل دین کو رہا کردیا تھا اور ان کے پیچھے دو اہلکار مختلف بھیسوں میں لگا دیے تھے۔ عشرت کی کلہاڑی کے متعلق رپورٹ یہ ظاہر کررہی تھی کہ اس پر کسی قسم کا خون نہیں ہے۔ صرف اسے تیز کرنے کے لیے رگڑا گیا تھا۔ کلہاڑی کے متعلق رپورٹ پڑھ کر عشرت پر شک کم ہوگیا تھا۔ فضل دین کی کچھ باتیں ہمیں بھی کھٹک رہی تھیں۔

عشرت پیر کا دشمن کیوں ہوا تھا۔ اس کا ذکر آ چکا ہے۔ پیر کا چیلا فضل دین ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ پیر صاحب کی آمدنی بے شمار تھی۔ اس نے بنک میں تقریباً دو لاکھ روپیہ جمع کروایا ہوا تھا۔ بقول فضل دین کے ہر روز ہزار بارہ سو روپے لوگ پیر کو نذرانے کے طور پر دے جاتے تھے۔ یہاں میں

پیر کے متعلق باقی باتیں نہیں کروں گا۔ صرف اتنا بتاؤں گا کہ یہ اس دور کے دو لاکھ روپے تھے۔ جب سونا تین ہزار کے اریب قریب فی تولہ تھا۔

ہوا یہ کہ ڈاکوؤں کا سردار بیمار پڑ گیا اور وقتی طور پر ڈاکے ڈالنا بند کردیے۔ دو ڈاکو فضل دین سے آ ملے۔ فضل دین کی نظریں دو لاکھ روپے پر تھیں۔ ادھر عشرت والا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فضل دین نے پیر کو راضی کرلیا کہ بنک سے پیسا نکلوایا جائے۔ پھر دو لاکھ سمیت وہ یہاں آ گئے۔

پیسہ پیر کی جیب میں رہتا تھا۔ فضل دین نے ہم سے جھوٹ بولا تھا کہ پیر نے اسے کہیں بھیجا تھا۔ پروگرام کے مطابق دونوں ڈاکو آ گئے اور ایک ڈاکو نے کلہاڑی کے پے در پے وار کر کے پیر کا کام تمام کردیا۔ وہ عشرت کو قاتل ظاہر کرنا چاہتے تھے وہ پیر کے لیے دل میں بہت زیادہ نفرت رکھتا تھا۔ اس لیے بہت زیادہ وار کیے گئے تھے میں فضل دین کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ ہم عشرت کو ہی مجرم سمجھ رہے ہیں۔ اسی لیے میں اس کے گاؤں جا کر نمبردار سے ملا تھا۔ ہمارا ایک اہلکار ایک فقیر کے بھیس میں اس کے گاؤں میں موجود تھا۔ ان کا تعاقب کیا جارہا تھا۔

اِدھر جو اہلکار فضل دین کے پیچھے تھا اس نے ہمیں اطلاع دے دی تھی کہ فضل دین دو بندوں سے ملا ہے۔ جو ڈیرے پر آئے تھے۔

جس صبح گورکن نے ہمیں اطلاع دی تھی کہ رات قبرستان میں کچھ پراسراری سرگرمیاں دیکھی گئی ہیں اس رات یہ دو ڈاکو تھے دراصل کلہاڑی اور دو لاکھ روپیہ انہوں نے قبرستان میں جا کر دبا دیا تھا۔ یہ ڈاکو جگہ کھود کر وہاں سے روپیہ اور کلہاڑی نکالنا چاہتے تھے لیکن گورکن کے شور مچانے پر بھاگ گئے تھے۔ وہ یہ کام خاموشی سے کرنا چاہتے تھے۔

جب انہیں اطمینان ہوگیا کہ پولیس عشرت کے پیچھے پڑی ہوئی ہے تو اس رات تینوں وہاں پہنچ گئے۔ آج رات وہ گورکن کو بے ہوش کر کے اپنا کام کرنا چاہتے تھے۔ گورکن انہیں وہاں نہ ملا۔ اس کے باوجود ان کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی نہیں بجی۔

شاید وہ زیادہ دن دو لاکھ کو زمین میں دبا نہیں رہنے دینا چاہتے تھے۔

اب بات ہوجائے سائیں کے قتل کی اس نے انہیں پیر کو قتل کرتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے بلکہ فضل دین نے کلہاڑی کا دستہ (جو مضبوط لکڑی کا تھا) زور سے سائیں کے سر پر مارا۔ کچھ دیر کے بعد وہ بے ہوش ہوگیا۔ انہوں نے جان بوجھ کر اس کا خون بہنے دیا۔ جب انہیں یقین ہوگیا کہ وہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے تو فضل دین نے اسے اسپتال پہنچادیا۔ جب میں کہانی لکھتا ہوں تو میری کوشش ہوتی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نہ رہ جائے نمبردار نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ آپ کو عشرت پر شک ہے تو اسے چھوڑا کیوں.....؟ کیونکہ اس نے عشرت کو دیکھا تھا۔ اس کیس میں سب سے اطمینان والی بات ہمارے لیے یہ تھی کہ عشرت قاتل بننے سے بال بال بچ گیا تھا اور ڈبا پیر صاحب اور اس کے چیلے اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے۔ اس کیس کے ختم ہونے کے چند دن بعد میرا تبادلہ ہوگیا تھا اور ڈاکوؤں کے باقی گروہ کے متعلق مجھے پھر کچھ بھی معلوم نہ ہوسکا۔

⌘

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بزمِ سخن

روبین احمد

نازسلوش ذشے.....میرپورآزادکشمیر

یوں بھی کرتا ہے کوئی چاہنے والوں پہ ستم
پیار کی داستانیں کہیں، اقرار نہیں، اشارے نہیں

مہرگل بانو.....سکھر

بکھری ہے کچھ اس طرح محبت اسے کہنا
آنکھوں میں اُتر آئی ہے وحشت اسے کہنا
کہنا کہ تیرے بعد سے جی لگتا نہیں ہے
بے چین سی رہتی ہے طبیعت اسے کہنا

مجاہدناز عباسی.....سنجرپور

یہ زندگانی تیرے بن بالکل ادھوری ہے ناز
کہ لوٹ آؤ اب تیرے دن جیا نہیں جاتا

ریاض بٹ.....حسن ابدال

میں خود کو ڈھونڈتا ہوں سرِ شہرِ آرزو
مجھ کو بھی دل کے ساتھ چُرا لے گیا کوئی

صدف سلیمان.....شورکوٹ

ہر سانس محبت پہ فدا کرتا رہوں گا
سائل ہوں تیرے در پہ صدا کرتا رہوں گا
یہ داد، یہ آنسو میری قسمت کی عطا ہے
ہاں تیرے لیے دل سے دعا کرتا رہوں گا

عبدالرحمن سیاغر.....کشمیر

تم سب کی یاد آتی رہی ساری رات
سو نہ سکا رات کے آخری پہر تک

فقیرمحمد بخش لنگاہ.....خانیوال

میری دنیا میں کسی روز سویرا ہوتا
وہ کسی روپ میں آتا اور میرا ہوتا
اس کی حسرت میری تقدیر میں لکھنے والے
کاش اس کو بھی میری تقدیر میں لکھا ہوتا

محمد سلیمان.....منڈی بہاؤالدین

تُو نے دیکھا ہے کبھی اک نظر شام کے بعد
کتنے چپ چاپ سے لگتے ہیں شجر شام کے بعد
تُو ہے سورج تجھے معلوم کہاں رات کا دکھ
تو کسی روز میرے گھر میں اتر شام کے بعد

عبدالمالک کیف.....ڈھرکی

محبت کی بھٹی سے جو بن کے کندن نکلتے ہیں
بے خوف و خطر وہ درد کے صحرا میں اترتے ہیں
چاہت کے سچے جذبوں سے جو سرشار ہوں کیف
وہ کچے گھڑے پہ بیٹھ کے دریا میں اُترتے ہیں

سبین احمد.....کراچی

تشنگی، تشنگی مٹاتی ہے
تشنگی، تشنگی بڑھاتی ہے
اور پھر تشنگی محبت کی
غیر محدود ہوتی جاتی ہے

منزہ فاطمہ.....کراچی

ستارے ٹمٹماتے ہیں تو کوئی یاد آتا ہے
نظارے جھلملاتے ہیں تو کوئی یاد آتا ہے
اسے واپس نہیں آنا، مگر ہم پھر بھی ہاتھ اپنے
دعا میں جب اٹھاتے ہیں تو کوئی یاد آتا ہے

مہرین.....بہاول پور

تجھ سے مل کر بچھڑ گئے تجھ سے بچھڑ کر مل گئے
ایسی بھی قربتیں رہیں ایسے بھی فاصلے رہے
تُو بھی نہ مل سکا ہمیں عمر بھر رائیگاں گئی
تجھ سے تو خیر عشق تھا خود سے بڑے گلے رہے

کرن آفتاب.....لاہور

میری آنکھوں میں تیرا پیار چھلکتا ہے ابھی
تیرے نام پہ میرا دل دھڑکتا ہے ابھی
مانا کہ میری زیست میں فقط تُو ہی بچا ہے
تجھے پا کے کھو دینا میرے بس میں ہے ابھی

سیدفرقان.....کوٹ غلام محمد

بڑے خلوص سے بنتے ہیں ہمسفر
چھوڑ جاتے ہیں دو گام چل کر

محمد عمیر.....سکھر

یونہی تو کوئی بھی تنہا نہیں ہوتا
چاہ کر کسی سے جدا نہیں ہوتا
محبت کو مجبوریاں ہی لے ڈوبتی ہیں
ورنہ کوئی خوشی سے بے وفا نہیں ہوتا

فراز.....شورکوٹ

زندگی خواب ہونے کو ہے
اک دل ویران ہونے کو ہے
امید کا آخری دیا بھی اب بجھ جانے کو ہے
کیونکہ رات اپنی تاریکی کے ساتھ ہونے کو ہے

انیلہ.....صادق آباد

سُونا آنگن، تنہا عورت، لمبی عمر
خالی آنکھیں بھیگا آنچل، گیلے ہونٹ
اتنا بولو گی تو کیا سوچیں گے لوگ
رسم یہاں کی ہے، لڑکی سی لے ہونٹ

اقصیٰ.....ڈگری سندھ

مجھے ضبطِ غم پر غرور تھا میرے آنسوؤں نے وفا نہ کی
میرے راز اسی پر عیاں ہوئے یہ میری آنکھ سے ٹپک گئے
مجھے چھوڑ دے یا سنبھال لے ہے میری لاج اس کے ہاتھ میں
مجھے اعتراف شکست ہے میرے پاؤں راہ میں تھک گئے

مہک.....راولپنڈی

لگتا ہے کئی راتوں کا جاگا تھا مصور
تصویر کی آنکھوں میں تھکن جھانک رہی ہے

احمد ندیم.....جہلم

کہیں نزدیک ہی رکھی ہے بچھڑنے کی گھڑی
اس سے ملنے کے سبب بہم ہو گئے ہیں
اس تواتر سے رہی ہے شبِ غم اپنا نصیب
ہم کہ اب خود ہی نصیبِ شبِ غم ہو گئے ہیں

گل ناز.....موموبر آزاد کشمیر

وہ نفرتوں کے سوال کرے محبتوں کے جواب مانگے
کہ میرے حصے میں کانٹے لکھ کر وہ مجھ سے تازہ گلاب مانگے
یہ چاہتوں کی کڑی مسافت، چلے ہیں تنہا شکست خوردہ
کوئی تو میرا درد جانے، کوئی تو اس سے حساب مانگے

دلدار حسین.....راولپنڈی

بے سبب زلزلہ عالم میں نہیں آتا
کوئی بے تاب تہہ خاک تڑپتا ہو گا

دلاور خان.....رحیم یار خان

یقین کرو کبھی مرنے کے ڈر نہ اترے تھے
کہ خواہشوں پر میری جب یہ پر نہ اترے تھے
بڑا غرور تھا ہم کو بھی خوبروئی کا
کہ جب تلک یہاں آئینہ گر نہ اترے تھے

پروین.....لیہ

میں نے ساری خوشبوئیں آنچل سے باندھ کے رکھیں
شاید ان کا ذکر تو اپنے کسی سوال میں رکھے
صبا سے تیرے آنے کی سرگوشی کو سنتے ہی
میں نے کتنے پھول چُنے اور اپنی شال میں رکھے

عمران شیخ.....کراچی

کسی نے کب ہمیں جینے کا اختیار دیا
تجھے اجل نے، مجھے زندگی نے مار دیا
کسی سے عشق کا اظہار جس میں کرنا تھا
خبر نہیں کہ وہ لمحہ کہاں گزار دیا

جہانگیر.....ملک وال

وہ خواب تھا جو بکھر گیا خیال تھا ملا نہیں
مگر دل کو کیا ہوا یہ کیوں بجھا پتا نہیں
ہر ایک دن اداس دن تمام شب اداسیاں
کسی سے کیا بچھڑ گئے کہ جیسے کچھ بچا نہیں

ظفیل.....آزاد کشمیر

محبتوں کا حساب تھا نہ عداوتوں کا شمار تھا
کبھی اس کی ذات عذاب تھی کبھی وہ روح کا قرار تھا
اسے میں نے مڑ کے صدا نہ دی کہ پلٹ گیا وہ راہ سے
میں خزاں ہوا تو پتا چلا میری ذات کا وہ نکھار تھا

حرا.....بورے والا

ہے یہ ممکن کہ طلب گاہِ محبت میں کبھی
دل کی گہرائی سے تُو نے مجھے چاہا ہی نہ ہو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمر بھر ساتھ رہیں ساتھ جئیں، ساتھ چلیں
ان دعاؤں کے لیے تُو نے ہاتھ اٹھایا ہی نہ ہو
ندا فاطمہ.....کورنگی کراچی

مراسم اتنے بھی گہرے رکھے نہیں جاتے
بعد میں زخموں پہ پہرے رکھے نہیں جاتے
منافقت ہم سے تو بالکل نہیں ہوتی فائق
اک چہرے پہ سو چہرے رکھے نہیں جاتے
سحرش.....ملتان

بس اے بہار کے سورج، بڑھا یہ قہر کا رنگ
جلا گئی ہے تیری دھوپ میرے شہر کا رنگ
ابھی تو میں نے سمندر میں ناؤ ڈالی تھی
یہ کیا ہوا کہ بدلنے لگا ہے لہر کا رنگ
کلیم.....لاہور

محبتوں کا اپنی نصاب مانگتا تھا
چاہتوں کا اپنی حساب مانگتا تھا
عجیب شخص تھا سب جاننے کے باوجود
وہ باتوں کا اپنی جواب مانگتا تھا
شہاب الدین.....گوجرانوالہ

کہتے ہیں محبت انجانی ہوتی ہے
لیکن کچھ جانی پہچانی ہوتی ہے
کچھ لوگ وعدہ کر کے مکر جاتے ہیں
یہ بے وفا لوگوں کی کہانی ہوتی ہے
میمونہ.....آزاد کشمیر

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجیے پھر سمجھئے زندگی کیا چیز ہے
ہم لبوں سے کہہ نہ پائے ان سے حالِ دل کبھی
اور وہ سمجھے نہیں یہ خاموشی کیا چیز ہے
ثناء.....جھنگ

اگر ہو سکے تو کرو خود میں کشش پیدا
ہر کسی کو حسرت سے دیکھا نہیں کرتے
ہر شخص نہیں ہوتا ہر شخص کے قابل
ہر شخص کو اپنے لیے پرکھا نہیں کرتے
عبدالرحمٰن.....کراچی

تیری چاہ میں تیری راہ میں میرے حوصلوں کا ہنر گیا
تھیں وہ آندھیاں تیرے شہر کی میرا گھر گیا میرا در گیا
تیرے شہر میں اے بے مہر تیرے دوستوں کا یہ حال ہے
کوئی چپکے سے جی اٹھا کوئی چپکے سے مر گیا
ثمن.....صدر، کراچی

مجھے جتنی ضرورت ہے میرے داتا مجھے دے دے
کسی سے مانگ کر لینا مجھے اچھا نہیں لگتا
دیا گل کر دیا ہے اس لیے اے جانِ جاں میں نے
کوئی آئے نظر جلتا مجھے اچھا نہیں لگتا
عظمیٰ رضی.....دہلی کالونی

میری آنکھوں میں روشن ہوئے امید کے دیئے
کون ہے جو میرے لیے خوابوں کی خوشی لایا ہے
یہ سال کچھ اس لیے بھی خوب صورت لگا مجھے
کہ اپنے سنگ یہ تیری دوستی جو لایا ہے
نائمہ.....کراچی

محبتوں کا حساب تھا نہ عداوتوں کا شمار تھا
کبھی اس کی ذات عذاب تھی کبھی روح کا وہ قرار تھا
میں نے اسے مڑ کر صدا نہ دی پلٹ گیا تھا وہ راہ سے
میں خزاں ہوئی تو پتا چلا میری ذات کا وہ نکھار تھا
کاشف ملک.....بہاول پور

ہم کسی سے نہ ملے تجھ سے ملاقات کے بعد
دل میں اتری نہ کوئی ذات تری ذات کے بعد
پت جھڑ، ساون، رت بسنت سب ہی بیتے جائیں
ہم کو کوئی موسم نہ بھائے تیرے جانے کے بعد
حسن شاہد.....کراچی

یہاں پیار کا اظہار ملامت ہے گناہ ہے
پھولوں سے کبھی تتلیاں پوچھا نہیں کرتیں
آنگن میں گھنے پیڑ کے نیچے تیری یادیں
میلہ سا لگا دیتی ہیں اچھا نہیں کرتیں

خوشبو سخن

سیما بنت عاصم

غزل

وہ منظر کیسا ہوگا
جب وہ اپنوں سے بچھڑا ہوگا
غموں کی دھول میں اے لوگو!
خشک پتوں کی طرح بکھرا ہوگا
میرے آنے کا نہ سن کر
اس کا چہرہ پھر اُترا ہوگا
جہاں جہاں میری خوشبو پھیلی ہوگی
وہاں وہ بھی ضرور گیا ہوگا
جب وہ چھوڑ چلا سب لوگوں کو
یہ دل پھر کیسا تڑپا ہوگا
کیا معلوم تھا اتنی جلدی ہوگی
اب وہ نہیں، اس کا سایہ ہوگا
وسیم اختر.....راولپنڈی

غزل

شبِ تاریک کو دن، بادِ صرصر کو صبا کہنا
یہی دستورِ دنیا ہے روا کو ناروا کہنا
لبِ خاموش سے بھی داستانِ غم سنا دیں گے
ہماری آنکھ میں اشکوں کا ہے طوفاں چھپا، کہنا
ہوں طوفانِ غمِ جاناں کی زد میں کشتیاں جن کی
کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں وہ آخر ناخدا کہنا
مرے چاروں طرف غم کے بگولے رقص کرتے ہیں
نہیں ہے ٹوٹنے والا غموں کا سلسلہ، کہنا
یہ سونا اور چاندی ہیں سبھی بے کار کی باتیں
کہ زیور آج بھی عورت کا ہے شرم و حیا، کہنا
حقائق کو چھپانے کی کبھی غلطی نہ کر جانا
جو سچی بات ہو بے باک ہو کر برملا کہنا
قمر کرتا تو ہے کوشش صنم کو بھول جانے کی
مگر ان کا خیال ہوتا نہیں دل سے جدا کہنا
ریاض حسین قمر.....منگلا ڈیم

غزل

اے میرے دوست! جی میں آتا ہے تجھ پہ کوئی غزل کہوں
کوئی مصرعہ، کوئی فقرہ، کوئی نظم کہوں
اشعار کی، الفاظ کی، روانی ہو جس میں
بکھرے ہوئے، ادھورے لفظوں کی کہانی ہو جس میں
جس میں ہو تیری ذات کا حسنِ تمام
جس میں ہو میرا تو کہیں دوست تیرا نام
میں کہوں جس میں اپنے دل کی ہر ہر بات
جس کے لفظ لفظ میں پروئی ہو تیری ہی بات
اے میرے دوست کہ جس میں تیری عادات کو لکھوں
تیری خوبی، تیری اچھائی، تیری صفات کو لکھوں
جس میں لکھوں تیرے دھیمے پن کو بارش کی پھوار
ہاں میں لکھوں تجھ پہ یونہی ہر روز نظمیں ہزار
اے میرے دوست! کہ جس میں، میں تجھ کو اپنا دوست کہوں
اے میرے دوست! کہ جس میں، میں تجھ کو اپنا ہمزاد کہوں
ہم صفات کہوں، ہم راز کہوں، ہم ذات کہوں
اے میرے دوست جی میں آتا ہے تجھ پہ ایسی ہی کوئی بات کہوں
نازسلوش ذشے.....میرپور آزاد کشمیر

غزل

بن کے دل اور جان زمانے میں
ملتے ہیں مہربان زمانے میں
عشق وہ در ہے جس پہ دیوانے
بس لٹاتے ہے جان زمانے میں
سچ کی راہ پہ چلنے والوں کی کون
کاٹتا ہے زبان زمانے میں
کاش صبر و وفا کی میرے ربّ
اب ملے کوئی دکان زمانے میں
قیس سے بھی بری ہوئی حالت
عشق میں کامران زمانے میں
کامران شاہ کامی.....راولپنڈی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چولہے

ہوئے گھر کے چولہے ٹھنڈے
گیس ملے گی اب سنڈے کے سنڈے
ختم ہوا اب روز پکانے کا چکر
کھانا پکاؤ اب سنڈے کے سنڈے
کیسے کھائیں ہم سرد موسم میں انڈے
صبح و شام پڑتے ہیں گرانی کے ڈنڈے
کچھ تو رکھ سفید پوشی کا بھرم لنڈے
گیس بھی ملتی ہے اب سنڈے کے سنڈے
دیکھو یارو ہم نے چاروں طرف
کیا خوب گاڑے جمہوریت کے جھنڈے

عبدالرحمٰن.....صدر کراچی

غزل

بات خوشبو کی طرح وہ کھول رہی تھیں
چُرا مرائے آنچل کی شکنیں بول رہی تھیں
صدائیں بکھر رہی تھیں جانی انجانی سی
نیند سے پلکیں تو مری ڈول رہی تھیں
صبح خیز تھے برگ و بارِ گلستاں ابھی تو
خزائیں ہجر کا زہر سا اس میں گھول رہی تھیں
تارے تو خاموشی سے آئے تھے نیل گگن پر
تلاش سحر میں کرنیں کیوں پر تول رہی تھیں؟
ابھی ابھی تھک ہار کے سوئی تھیں سب چڑیاں
تیز ہوائیں چمن میں تنکے رول رہی تھیں
چاند سے تو چند لمحوں کا ہی ساتھ رہا تھا
کالی راتیں پھر سے زلفیں کھول رہی تھیں
بھنوروں نے گلزار میں ڈیرے ڈالے تو
دریدہ کلیاں چیخ چیخ کے بول رہی تھیں
بھولی بھالی دوشیزائیں بس اپنی دُھن میں
خوابوں کے در چپکے چپکے کھول رہی تھیں
شہرِ سخن میں آمد پہ مری خوش ہو کر
فہم و شعور کی پریاں بھی کچھ بول رہی تھیں
دے گیا پلکوں کو مری وہ غم کا اک سمندر
ورنہ یہ آنکھیں تو مری انمول رہی تھیں

عصمت اقبال عین.....منگلا ڈیم

نظم

بارشوں کے موسم میں
وقت کے اندھیروں میں
میں نے اس سے پوچھا تھا
چھوڑ تو نہ جاؤ گے؟
ہاتھ تھام کر اس نے
کان میں یہ بولا تھا
کیسے چھوڑ سکتا ہوں
تم تو جان ہو میری
اور آج ایسے ہی
وقت کی تمازت میں
وحشتوں کے موسم میں
میں نے اس سے پوچھا ہے
اگر
چھوڑ کر ہی جانا تھا
آس کیوں دلائی تھی
پیاس کیوں جگائی تھی
میرے ان سوالوں پر
چلتے چلتے وہ بولا
موسموں کی عادت ہے
وقت پر بدل جانا

رابعہ حسن صابر لنگاہ.....خانیوال

غزل

جدائی کا احساس ہی اب ہوا ہے
یہ مانا کہ وہ مدتوں سے جدا ہے
بہاروں کو کیسے گلے سے لگاؤں
بہاروں کا موسم جو مجھ سے خفا ہے
یہ اپنے نصیبوں کا ہے کھیل کیسا
کہ ہر ایک مجھ سے ہی روٹھا ہوا ہے
گلہ بے وفائی کا کس سے کروں میں

مجھے اپنی قسمت نے دھوکا دیا ہے
یہ حالات میرے ڈبو دیں گے مجھ کو
خدایا تیرا ہی مجھے آسرا ہے
مجھے اب خوشی کی تمنا نہیں ہے
کہ اب جب کہ تو ہی مجھ سے خفا ہے

محمد ارشاد قریشی.....اسلام آباد

غزل

جدائی کے صدمے اٹھاتے رہیں گے
مگر ہم سدا مسکراتے رہیں گے
محبت نے ہم کو بنایا ہے شاعر
محبت کے ہم گیت گاتے رہیں گے
کوئی لاکھ روکے کوئی ہم کو ٹوکے
حقیقت سے پردہ اٹھاتے رہیں گے
عبث ہے وفا کی توقع صنم سے
رہِ رسم دنیا نبھاتے رہیں گے
کہاں تک چھپائیں گے وہ اپنا چہرہ
کہاں تک ہمیں یوں بناتے رہیں گے
جلاتے رہیں گے جو نمرودِ عالم
ہم اس آگ میں گل کھلاتے رہیں گے

محمد عبداللہ عاطر.....منگلا کینٹ

غزل

ایک چہرہ جو چشمِ خواب میں تھا
عکس اس کا ہر اک گلاب میں تھا
سکھ کے سپنے تھے اس کی آنکھوں میں
دکھ تو سارا میرے حساب میں تھا
ہم نفس مجھ سے بے رخی کے بعد
مبتلا خود بھی اک عذاب میں تھا
اک فسانہ جسے کہیں چاہت
نامکمل ہر اک کتاب میں تھا
نشہ جو اس کی آنکھ میں تھا جمال
وہ بھلا کب کسی شراب میں تھا

سمیع جمال.....کراچی

غزل

اگر یقین نہیں تو آزما مجھے
یا خود کرشمہ کوئی دِکھا مجھے
چاہت ہے اگر تیرے دل میں
پہلو میں اپنے سجا مجھے
پتھروں کی طرح خاموش کیوں ہو
اپنوں کی طرح گلے لگا مجھے
ہر وقت خوش فہمی میں رہنا
نفرت سے اپنی رُلا مجھے
کیا ملا سکون مجھ سے دور جا کے
آ کبھی کتاب دل دکھا مجھے

محمد اسحاق انجم.....کنگن پور

غزل

لہو کی بوند میں کوئی شرارہ جاگتا ہے
زبان گنگ ہے اور استعارہ جاگتا ہے
یہ کہہ رہا ہے سمندر سے چودھویں کا چاند
ابھی نہ موج میں آ، شہر سارا جاگتا ہے
لہو کے رشتے کہیں سو گئے زمانے میں
بس ایک رشتہ اور ہمارا تمہارا جاگتا ہے
گلے لگا کے جو سو جائیں اپنی قسمت کو
تو شہرِ خواب کا روشن ستارہ جاگتا ہے
قدیر ان کا تعلق بھی کیا انوکھا ہے
کہ گھاؤ روح میں ہے جسم سارا جاگتا ہے

عمیر قدیر بھٹی.....راولپنڈی

غزل

اب اگر آؤ تو جانے کے لیے مت آنا
صرف احسان جتانے کے لیے مت آنا
میں نے پلکوں پہ تمنائیں سجا رکھی ہیں
دل میں امید کی سو شمعیں جلا رکھی ہیں
یہ حسیں شمعیں بجھانے کے لیے مت آنا
اب اگر آؤ تو جانے کے لیے مت آنا
پیار کی آگ میں زنجیریں پگھل سکتی ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہنے والوں کی تقدیریں بدل سکتی ہیں
تم ہو بے بس یہ بتانے کے لیے مت آنا
اب اگر آؤ تو جانے کے لیے مت آنا
زین شانی.....کراچی

غزل

زندگی رہی تو وفا بھی کریں گے
تجھے چاہنے کی خطا بھی کریں گے
زمانوں کی بندشیں بھی اگر ہوں
ہم ایک دوسرے سے ملا بھی کریں گے
نہیں ہے جہاں میں کوئی تیرے جیسا
ہم دل میں بٹھا کے تیری پوجا کریں گے
محبت ہماری ہے شمع کی مانند
تو پروانے تم پر مٹا بھی کریں گے
جو دینا پڑی پیار میں جان اے دوست!
تو جان دے کے بھی ہم گلہ نہ کریں گے
نورِ صبا.....کراچی

غزل

وہ بے وفا تو ہے نہیں، پر بے وفا سے کم نہیں
اس نے جو کی تھی دل لگی، وہ تو جفا سے کم نہیں
سنگدل ہے وہ صنم، پر بے رحم سے کم نہیں
دیکھی جو اس کی بے رخی وہ بھی دغا سے کم نہیں
نظروں سے اوجھل وہ نہیں دل کی سرائے میں ہے وہ
ہر زخم تازہ پھر دیا کیا وہ دوا سے کم نہیں
تنہا مجھے چھوڑا ہے کیوں، دل توڑ کے جوڑا ہے کیوں؟
وہ ساتھ میرے پھر بھی ہے، کیا وہ جدا سے کم نہیں
اب کیوں صنم جلتا ہے وہ، دل توڑ کے ہنستا ہے وہ
مجھ کو جلایا پیار نے، کیا وہ سزا سے کم نہیں
مجھ کو اس نے دی دغا، رہتا ہے وہ مجھ سے خفا
سچ ہے کہ ظالم ہے وہ مگر مہرباں سے کم نہیں
تنہا واجد مجھے پھر کردیا سب سے جدا پھر کردیا
پھر بھی وہ میرا ہمنوا، کسی رازداں سے کم نہیں
پروفیسر واجد نگینوی.....کراچی

نظم

سنو!
جب کبھی کوئی غم ستائے
دل کو کوئی بات نہ بھائے
آنکھ سے ساگر چھلکا جائے
توبات کر کے دیکھنا ہم سے
کیا پتا
ایک آنسو کم ہو جائے!
جب کبھی دل بے چین ہو جائے
بچھڑنے پر یہ اور رُلائے
ملنے پر اور تڑپائے
توبات کر کے دیکھنا ہم سے
کیا پتا
دل کو تھوڑا چین آ جائے!
جب کبھی کوئی سپنا آئے
سپنے میں کوئی اپنا آئے
توبات کر کے دیکھنا ہم سے
کیا پتا
وہ سپنا سچ ہو جائے!
شہروز.....کراچی

ذوقِ آگہی

عفان احمد

اللہ کی نصیحت

''(مسلمانو) یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ یقین جانو اللہ تم کو جس بات کی نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے۔ بے شک اللہ ہر بات سنتا اور ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو۔ تم میں سے جو لوگ صاحبِ اختیار ہوں، ان کی بھی۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اگر تم واقعی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور رسول کے حوالے کر دو۔ یہی طریقہ بہترین ہے اور اس کا انجام بھی سب سے بہتر ہے۔''

(النساء ۵۹)

افتخار احمد.....کراچی

لعنت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چھ طرح کے لوگ ہیں میں نے ان پر لعنت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر لعنت کی ہے اور ہر نبی نے بھی لعنت کی ہے۔

(۱) اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا۔
(۲) اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا۔
(۳) زبردستی مسلط ہونے والا تاکہ جسے اللہ نے ذلیل کیا ہے اسے عزت دے اور جسے اللہ نے عزت دی ہے اسے ذلیل کرے۔
(۴) اللہ کے حرام کو حلال سمجھنے والا۔
(۵) میری اولاد سے اس چیز کو حلال جاننے والا جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔
(۶) میری سنت کو ترک کر دینے والا۔

مرسلہ: اسرار علی.....کراچی

محبت و عشق

کائنات کی ہر ایک چیز محبت کی وجہ سے قائم ہے، اگر زمانے میں محبت نہ ہوتی تو شائد آج کوئی چیز اس قابل نہ ہوتی کہ ہم ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے بولتے ایک دوسرے کی خوشیوں اور چاہتوں میں شریک ہوتے۔ اس دنیا میں اس کائنات میں نجانے محبت و عشق کی کتنی لازوال داستانیں ہیں جو آج بھی ادھوری ہیں۔ جو ابھی کسی مجبوری یا غربت مفلسی کی وجہ سے کہیں گم نامی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ کوئی ایسی داستانوں پہ یقین نہیں کرتا۔ کوئی کرے بھی تو کیسے؟ کیونکہ کوئی بھی تو محبت نہیں سمجھتا سب ہوس اور لالچ کے مارے لوگ ایک دوسرے سے محبت کا ڈراما کرتے ہیں۔ کبھی کسی لڑکی کے سر بے وفائی تو کبھی کسی لڑکے کے ماتھے پہ بے وفائی کا نشان آخر کیوں؟ ہمارے اس معاشرے سے محبت، چاہت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کیوں محبت پر سے لوگوں کا یقین اٹھ گیا ہے؟ کبھی ہم نے سوچا کہ کس وجہ سے محبت و عشق کو ختم کیا جا رہا ہے۔ کیوں محبت ہم سے روٹھتی جا رہی ہے۔ ہم سب محبت کرنے والے محبت محبت کا راگ الاپتے ہیں مگر کبھی عملی طور پر اس کی تکمیل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔ محبت و عشق کی دنیا الگ ہے۔ محبت و عشق کے جذبات الگ ہیں۔ محبت و عشق کا مذہب الگ ہے۔ احساسات منفرد ہیں۔ محبت کے ناکام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہونے پہ دل برداشتہ نہیں ہوتے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیتے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات نہیں سجاتے بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ محبت جو ہم سے روٹھ کر کہیں بہت دور جا رہی ہے اس کو دور نہ جانے دیں اس کا راستا روک لیں اس کے آگے دیوار بن جائیں۔ اگر ہم اپنی سچی محبت کو بچانا چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ محبت ہمیشہ ہمارے آس پاس رہے ہمارے دلوں میں بسی رہے تو ہمیں ان لوگوں کے نقش قدم پر چلنا ہوگا جنہوں نے محبت و عشق کے لیے سب کچھ قربان کر دیا۔ اپنی زندگی کو محبت و عشق کی نذر کر دیا کبھی آپ نے سوچا وہ لوگ کون تھے؟ وہ لوگ ہمارے جیسے ہم میں سے تھے ہماری طرح کھاتے پیتے تھے ہماری طرح چلتے پھرتے تھے مگر ان کے دلوں میں محبت و عشق کا سمندر موجزن تھا۔ اس لیے آج بھی کائنات میں محبت و عشق کی نجانے کتنی داستانیں موجود ہیں اور موجود رہیں گی۔

کتنے عشق و محبت کرنے والے آئے اور آ کر چلے گئے اور ان کی قبروں کے نشانات بھی مٹ گئے مگر ان کی محبت و عشق کی داستانیں آج بھی لوگوں کے دلوں میں ذہنوں میں اور تاریخ کے اوراق میں زندہ ہیں اور ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔

مجاہد ناز عباسی.....سنجر پور

انتخاب

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا جہاں پر خدا نہیں
(غالب)

مسجد خدا کا گھر ہے پینے کی جا نہیں
کافر کے دل میں جا وہاں پر خدا نہیں
(اقبال)

کافر کے دل سے آیا ہوں میں یہ دیکھ کر
خدا موجود ہے وہاں اسے پتا نہیں
(فراز)

نازسلوش ذشے.....میر پور

تین چیزیں

تین چیزیں خلوص دل سے کرنی چاہئیں۔
رحم، کرم، دعا
تین چیزیں کسی کا انتظار نہیں کرتیں۔
موت، وقت، گاہک
تین چیزیں بھائی کو بھائی کا دشمن بناتی ہیں۔
زن، زر، زمین
تین چیزیں پردہ چاہتی ہیں۔
کھانا، دولت، عورت
تین چیزیں یاد رکھنی ضروری ہیں۔
سچائی، فرائض، موت
تین چیزیں انسان کو ذلیل کرتی ہیں۔
چوری، چغلی، جھوٹ
تین شخص تین چیزوں سے پہچانے جاتے ہیں۔
صابر، مصیبت پر۔ بہادر، مقابلے پر۔ بھائی، ضرورت پر

ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی.....راولپنڈی

ذرا مسکرائیے

ایک سکھ نے تین سوئمنگ پول بنوائے گرم پانی کا، ٹھنڈے پانی کا اور ایک خالی۔

دوسرے سکھ نے گرم پانی اور ٹھنڈے پانی والے سوئمنگ پول بنوانے کی وجہ دریافت کی تو وہ بولا۔

جب سردی لگے گی تو گرم میں نہاؤں گا اور جب گرمی لگے گی تو ٹھنڈے میں۔ دوسرے سکھ نے پھر پوچھا۔

مگر یہ خالی سوئمنگ پول کس لیے ہے۔

وہ بولا۔ یار! کبھی کبھی نہانے کو دل نہیں بھی چاہتا۔

ریاض بٹ.....حسن ابدال

دو ہیرو بچی بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

ایک بولا۔ میں نے کل سمندر سے ڈھائی ٹن وزنی مچھلی پکڑی۔

دوسرا بولا۔ میں نے کل سمندر میں ڈور ڈالی تو جلتی ہوئی لالٹین نکلی۔

پہلا بولا۔ نہیں تو جھوٹ کہتا ہے۔

دوسرا بولا۔ تو اپنی مچھلی کا وزن کم کر دے میں اپنی لالٹین بجھا دوں گا۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....ملیر کراچی

تعلیم

ہر ترقی یافتہ ملک میں اس کی اپنی زبان ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ مگر پاکستان میں ذریعہ تعلیم اردو نہیں انگریزی ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں کا معیار تعلیم پست ہے کیونکہ طالب علم اپنا قیمتی وقت علوم سیکھنے کے بجائے انگریزی سیکھنے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ کسی غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ جاپان میں جاپانی، چین میں چینی، انگلستان میں انگریزی، فرانس میں فرانسیسی، جرمن میں جرمنی غرض یہ کہ ہر ملک کے اندر وہی زبان ذریعہ تعلیم ہے جس کو سب بخوبی سمجھتے ہیں سوائے پاکستان کے جہاں سب لوگ سمجھتے تو اردو ہیں لیکن یہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور اسی وجہ سے ہمارا معیار تعلیم پست ہے۔ تعلیم اسی زبان میں اچھی طرح دی جاتی ہے جس کو طالب علم آسانی سے سمجھ سکیں۔ ہمارے یہاں تعلیم اس زبان میں دی جاتی ہے جس کو سمجھنے میں دس سال کا عرصہ لگ جاتا ہے پھر کہیں جا کر صحیح علم سیکھنے کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمارے زوال و پستی اور نالائقی کا واحد سبب یہی ہے کہ ہم نے اردو کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا اور ہم اپنا قیمتی وقت علم سیکھنے کے بجائے انگریزی سیکھنے میں گنوا دیتے ہیں۔

سفیان اشرف.....اوکاڑہ

جسمانی آرائش

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ہمارے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کی غرض سے تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا جو گرد و غبار سے اَٹا ہوا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آدمی کے پاس کوئی کنگھا نہیں ہے جس سے یہ اپنے بالوں کو درست کر لیتا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے آدمی کو دیکھا جس نے میلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کیا اس آدمی کے پاس وہ چیز (صابن وغیرہ) نہیں ہے جس سے یہ اپنے کپڑے دھو لیتا۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس شخص کے سر پر بال اور داڑھی کے بال ہوں اس کو چاہیئے کہ ان کو اچھی طرح رکھے۔ (ابوداؤد۔ مشکوٰۃ)

مرسلہ: شہروز.....کراچی

❖

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

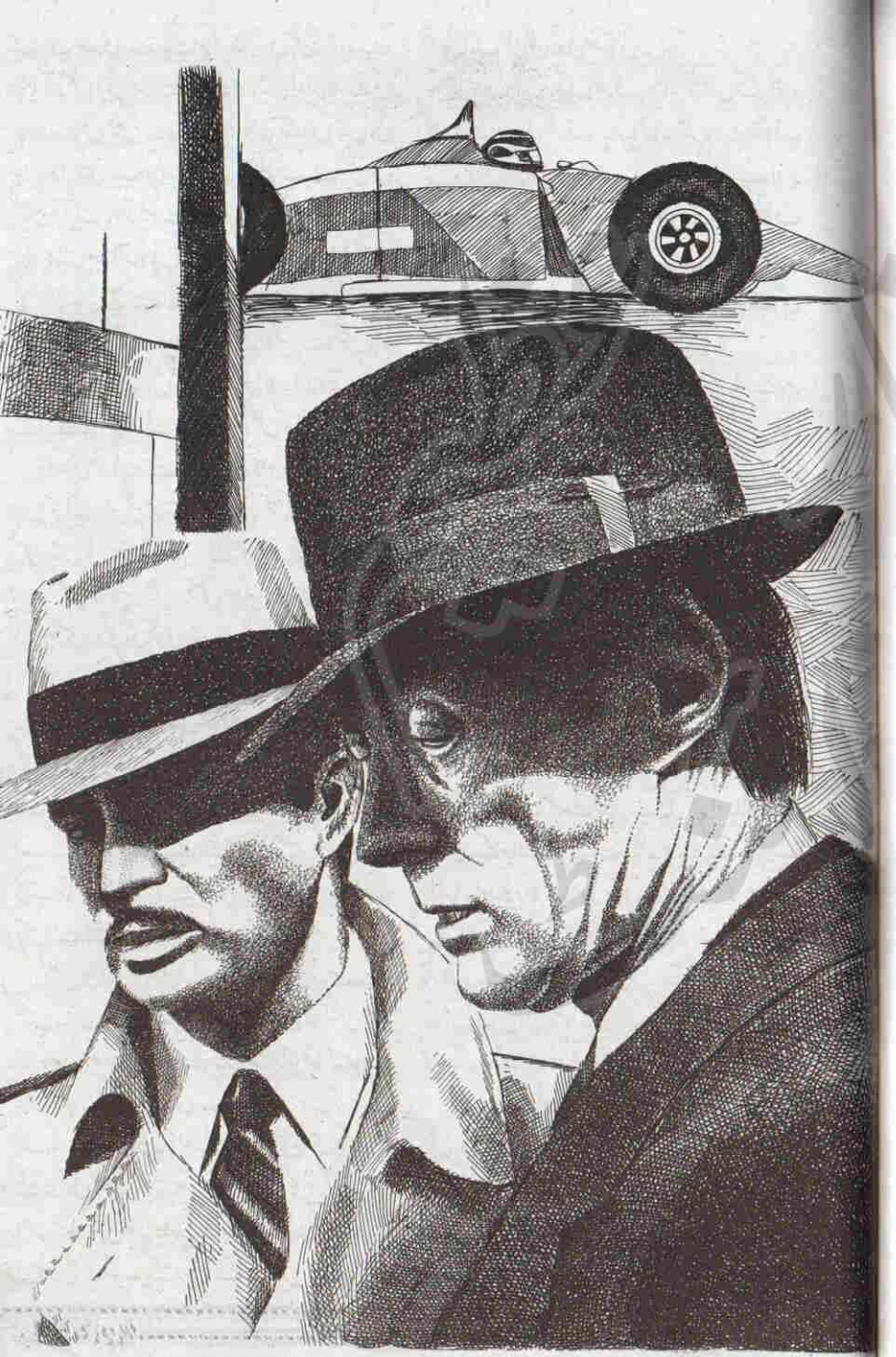

خطروں کا کھلاڑی

اے حمید

محترم اے حمید کا نام نئے افق کے قارئین کے لیے نیا نہیں۔ وہ نئے افق' نیا رخ اور آنچل کے لیے متعدد سلسلے وار ناول' افسانے اور سفر نامے لکھ چکے ہیں۔ ان کے لکھنے کا ایک منفرد انداز ہے۔ وہ جب لکھتے ہیں تو لفظ بولتے ہیں۔ جب قاری انہیں پڑھنا شروع کرتا ہے تو خود بخود اس ماحول میں پہنچ جاتا ہے بلکہ خود اس کہانی کا کردار بن جاتا ہے۔ منظر کشی میں اے حمید کا کوئی ثانی نہیں۔ جب وہ بارش کے بارے میں لکھتے ہیں تو پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی کمرے سے باہر بوندیں برس رہی ہیں۔ جب وہ خوش بو کا تذکرہ کرتے ہیں تو قاری خود کو اس خوش بو کے ہالے میں محسوس کرتا ہے۔ زیر نظر تحریر ماضی کے برما حال کے میان مار کا سفر نامہ ہے۔ آج اے حمید ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی تحریریں انہیں ہمیشہ قارئین کے دلوں میں زندہ رکھیں گی۔ آئیے خطروں کا کھلاڑی پڑھیے بلکہ محسوس کیجیے۔

ایک ایسا سفر نامہ جو آپ کو دن میں خواب دیکھنے پر مجبور کر دے گا

میں اٹھا اور واپس چل پڑا۔ چلتے چلتے میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ غار ختم نہیں ہو رہا تھا۔ ایک جگہ غار کی دو شاخیں پھوٹ رہی تھیں۔ اب مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کس طرف سے آیا تھا۔ بس اللہ توکل ایک طرف مڑ گیا۔ سو ڈیڑھ سو قدم چلا ہوں گا کہ غار بند ہو گیا۔ آگے دیوار آ گئی۔ گھبرا کر واپس مڑا اور جلدی جلدی اسی جگہ واپس آ گیا جہاں سے غار کی دو شاخیں پھوٹتی تھیں۔ اب میں دوسرے غار میں مڑ گیا۔ یہ غار بھی آگے جا کر بند ہو جاتا تھا۔ سخت پریشانی کے عالم میں پھر اسی جگہ پر واپس آ گیا۔ پریشانی مجھے اس بات کی تھی کہ پیچھے جانے کا اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ دونوں غار آگے جا کر بند ہو جاتے تھے۔ سخت حیران تھا کہ اگر غار بند ہو جاتے ہیں تو میں کس طرف سے آیا تھا؟

کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ عجیب تذبذب اور حیرانی پریشانی کے عالم میں ایک بار پھر میں سامنے کی طرف غار میں تیز تیز چلنے لگا۔ اندر سے میں گھبرا گیا تھا اور پچھتانے لگا تھا کہ میں نے لڑکی کے پیچھے ٹرین سے اترنے کی حماقت کیوں کی۔ مگر اب پچھتانا بیکار تھا۔

میں ایڈونچر پسند ضرور تھا مگر زمین کے اندر قبر کی طرح بند غار کے ایڈونچر کی میں نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ یہ تو مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی عذاب میں پھنس گیا ہوں۔ میں نے اپنے حواس کو کسی حد تک اپنے قابو میں کر لیا تھا اور سوچ سمجھ کر اور ایک ایک قدم پر دائیں بائیں دیکھ دیکھ کر آگے بڑھ رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ ایک جگہ غار کی دیوار میں ایک طاق سا بنا ہوا تھا۔ یہ طاق لکڑی کا نہیں تھا۔ پتھر کا تھا۔ میں رک کر اسے جھک کر دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ یہ طاق پتھر میں سے تراش کر بنایا ہوا ہے۔ میں نے اسے ہاتھ لگا کر آگے کو دبایا تو ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ طاق کی پتھر کی سل اپنی جگہ سے ایک طرف گھوم گئی۔ میں نے ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ طاق کی دوسری طرف اندھیرے میں پتھر کی سیڑھیاں نظر آئیں جو اوپر کو جا رہی تھیں۔ اس خیال سے کہ شاید یہیں سے باہر جانے کا کوئی راستہ مل جائے میں طاق کے اندر داخل ہو گیا اور زینے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

جیسے ہی میں نے زینے پر قدم رکھا طاق کی سل اپنے آپ بند ہو گئی۔ سیڑھیوں میں اندھیرا ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے جلدی سے پیچھے مڑ کر طاق کی سل کو زور سے دبایا کہ سل اپنی جگہ سے ہٹے اور میں اوپر جانے کی بجائے طاق میں سے نکل کر واپس غاروں میں ہی چلا جاؤں۔ جب دیکھا کہ سل کسی طرف سے کھلتی ہی نہیں تو ایک بار تو موت آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ دیوار کو ٹٹول کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دس پندرہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد زینہ ختم ہو گیا۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا۔ آگے دیوار نہیں تھی بلکہ لکڑی کا دروازہ تھا۔ میں نے اسے باہر کی طرف دھکیلا تو وہ کھل گیا۔

دوسری طرف سے تازہ ہوا کا جھونکا آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اونچی چھت والا کافی کشادہ دالان ہے جس میں کئی ستون زمین سے چھت تک چلے گئے ہیں۔ میں دالان میں داخل ہو گیا۔ وہاں ویسی ہی پھیکی پھیکی روشنی تھی جیسی غاروں میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ دالان کی دیواروں میں طاق بنے ہوئے ہیں جن میں عورتوں کی پتھر کی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ مورتیوں کی تمام عورتوں کی شکلیں الگ الگ تھیں۔ سب کے بالوں کے جوڑے تھے۔ سب نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ عجیب تماشہ تھا۔ میں نے مورتیوں کو تو وہیں چھوڑا اور وہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

لیکن دالان کی دیواریں چاروں طرف سے بند تھیں۔ کسی جگہ کوئی کھڑکی یا دروازہ نہیں تھا لیکن میں نے مایوس ہونے کی بجائے پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں یہاں سے نکل کر رہوں گا۔ میں جھک کر دیواروں کا جائزہ لینے لگا کہ شاید کسی جگہ باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ ہو۔ باہر جانے کا تو کوئی خفیہ راستہ نہ ملا لیکن اوپر جانے کا ایک اور زینہ نکل آیا۔ وہ اس طرح کہ ایک جگہ مورتی کے نیچے دیوار کے ساتھ پتھر کی ایک سل لگی ہوئی نظر آئی۔

میں نے اسے ایک طرف ہٹایا تو اس کے اندر ایک زینہ اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے شگاف میں سر ڈال کر اوپر کی جانب دیکھا۔ سب سے اوپر والی سیڑھی پر ہلکی روشنی تھی۔ یہ سوچ کر میں شگاف میں داخل ہو گیا کہ شاید اسی زینے سے باہر نکلنے کا کوئی سبب بن جائے۔ یہ ایک اوپر اٹھی ہوئی سرنگ تھی جس کی دیوار میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

میں دونوں پاؤں ایک جگہ ٹکا ٹکا کر زینے پر چڑھنے لگا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر میں نے سر باہر نکال کر دیکھا تو ایک اور دالان تھا جو نیچے والے دالان سے چھوٹا تھا۔ میں شگاف سے باہر نکل آیا اور دالان کا جائزہ لیا۔ دالان میں روشنی نیچے والے دالان سے بہت ہی کم تھی اور اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ اس نیم تاریکی میں مجھے دالان کے وسط میں ایک تابوت نما بکس پڑا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہو گیا کہ خدا جانے اس تابوت کے اندر کیا ہے۔

دالان میں صرف وہی ایک تابوت تھا۔ باقی کچھ بھی نہیں تھا۔ چھت قدرے نیچی تھی اور اس میں مکڑی کے جالے نیچے تک لٹکے ہوئے تھے۔ عجیب پراسرار اور ڈراؤنا ماحول تھا۔ میں نے سوچا شاید اس تابوت کے اندر سے کوئی راستہ ان منحوس غاروں سے باہر نکلا ہو۔ میں ڈرتے ڈرتے تابوت کے قریب گیا اور نیم اندھیرے میں جھک کر بڑے غور کے ساتھ تابوت کو دیکھا۔

تابوت کے اوپر بھی ایک عورت کی ابھری ہوئی شکل بنی تھی۔ اس عورت کا بھی جوڑا تھا اور ماتھے پر سیاہ بندیا تھی۔ میں نے تابوت کو کھولنے کی بہت کوشش کی مگر اس کا ڈھکنا اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں ہلا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ ڈھکنا مضبوط کیلوں سے بند

کر دیا گیا ہے۔ تابوت پتھر کا نہیں تھا۔ سیاہ لکڑی کا تھا۔ مجھے امرتسر کے چھاؤنی والے سینما میں دیکھی ہوئی انگریزی دہشت ناک فلمیں یاد آنے لگیں اور خوف سے میرا حلق خشک ہونا شروع ہو گیا۔

میں نے تابوت سے ہٹ کر دالان کی دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ دیواریں پتھر کی تھیں۔ نہ کہیں کوئی کھڑکی یا طاق تھا اور نہ کوئی روشندان تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ تازہ ہوا وہاں بھی محسوس ہو رہی تھی اور سانس لینے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن باہر جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ کسی وقت خیال آتا کہ یہی جگہ میرا مدفن بن جائے گی اور میری لاش تک کسی کو نہ مل سکے گی۔

ٹرین میں ملی ہوئی اداس آنکھوں والی لڑکی پر مجھے کسی چڑیل کا شبہ ہونے لگا جو مجھے اپنی مسکراہٹ کے جال میں پھنسا کر اس جہنم میں لے آئی تھی۔ کسی وقت سوچتا کہ نہیں اس میں اس لڑکی کا کیا قصور ہے۔ یہ سب کچھ مجھے میرے گناہ کی سزا ملی ہے۔ مجھے اپنے آپ کو ہندو ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اگر اپنے آپ کو ہندو ظاہر نہ کرتا تو بڑی آسانی سے حج دیو کے آگے ان منحوس غاروں میں آنے سے انکار کر سکتا تھا لیکن مجھے میرا شوق فضول لے ڈوبا تھا کہ ذرا ان پراسرار غاروں کی سیر کی جائے۔ اب میں ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگنے لگا کہ میں مسلمان ہوں اور اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے میں نے گناہ کیا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہاں سے نیچے بڑے دالان میں آنے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں سخت تھک چکا تھا۔ اوپر سے مایوسی اور ناامیدی دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ مجھ پر غنودگی چھانے لگی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ میں سو گیا تھا۔ پتہ نہیں پانچ دس منٹ سویا ہوں گا یا ایک گھنٹے تک سوتا رہا تھا کہ اچانک ایک عجیب سی آواز نے مجھے جگا دیا۔

میں آنکھیں کھول کر نیم اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ یہ آواز کیسی تھی اور کہاں سے آئی تھی۔ یہ ایسی آواز تھی جیسے کوئی صدیوں سے بند دروازہ کھلتے وقت چرچرایا ہو۔ مگر وہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ دیواریں اسی طرح اپنی جگہ پر ساکت کھڑی تھیں۔ دالان کے وسط میں تابوت بھی ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ وقت کا کچھ اندازہ نہیں تھا کہ دن ہے یا شام ہے یا رات ہے۔ بس ایک پھیکا سا اندھیرا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا کہ شاید اس طرح سے پریشان ذہن کو تھوڑا سا سکون ملے۔ ابھی میں نے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ وہی چرچراہٹ کی آواز پھر سنائی دی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے جلدی سے آنکھیں کھول لیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ تابوت کا ڈھکنا آہستہ آہستہ اپنے آپ اوپر اٹھ رہا ہے۔

دہشت کے مارے میرا جسم سرد پڑ گیا۔ میں اٹھ کر وہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ حلق خشک بلکہ کڑوا ہو گیا۔ میں ٹکٹکی باندھے تابوت کو دیکھ رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکنا آہستہ آہستہ کھلتے کھلتے ایک طرف کو ڈھلک گیا اور چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ یہ بڑا گہرا سرد اور ڈراؤنا سناٹا تھا۔ میرا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی اچھل کر باہر آ جائے گا۔

میری نظریں تابوت پر جمی ہوئی تھیں۔

میرے دیکھتے دیکھتے تابوت میں سے نسواری رنگ کے دھوئیں کا غبار سا نکلنے لگا۔ یہ دھواں مکڑی کے جالے کی طرح کا تھا۔ پتلا اور ٹھہرا ٹھہرا سا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تابوت کے اوپر آ کر وہ مکڑی کے جالے کی طرح تن گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ تابوت میں سے ایک انسانی سر آہستہ آہستہ باہر نکل کر اوپر اٹھنا شروع ہو گیا۔

یہ ایک عورت کا سر تھا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ عورت کا جسم بہت بڑا تھا۔ یہ اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا گیا۔ پھر اس کا سر چھت کے ساتھ لگ گیا۔ دہشت کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ وہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تابوت سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگا ایسی جگہ بیٹھا تھا۔ جہاں ایک تو اندھیرا تھا اور دوسرے میرے آگے ساتھ ساتھ لگے ہوئے دو ستون تھے۔

میں نے سمٹ کر اپنے آپ کو ستونوں کی اوٹ میں کر لیا کہ اس تابوت والی بلا کی مجھ پر نظر نہ پڑے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس بلا کی مجھ پر نظر پڑ گئی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔

وہ منحوس عورت ایک بہت بڑے اونچے لمبے جن کی طرح تابوت سے آدھی باہر نکلی ہوئی تھی اور اس کا سر چھت کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی پھر وہ آہستہ آہستہ گھوم کر میری طرف ہو گئی۔ میں مزید سکڑ کر ستونوں کے پیچھے ہو گیا۔ اس کا چہرہ اب میری طرف تھا۔ مجھے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جہاں دو سیاہ سوراخ تھے۔ اور اس کے کان اس کے کندھوں تک لٹکے ہوئے تھے۔ بند ہونٹوں میں سے دو نوکیلے دانت نکل کر نیچے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔

خوف کے مارے مجھے پسینے آ رہے تھے۔ میں سانس لیتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا۔ خدا جانے کیا وجہ تھی کہ ابھی تک اس نے مجھ پر حملہ نہ کیا تھا۔ شاید میں اسے نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ اس کی آنکھیں نہیں تھیں۔ آنکھوں کی جگہ دو سیاہ گڑھے نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس بلا کے سانس لینے کی صرف آواز آ رہی تھی۔

وہ نیچے ہوتی گئی اور پھر تابوت میں بیٹھ گئی۔

اب اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ تابوت میں سے باہر نکل آئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا نیچے کا دھڑ غائب تھا۔ اس کی دونوں بانہیں لٹک رہی تھیں۔ اس کا اوپر کا دھڑ ہوا میں لٹکا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرا خون خشک ہو گیا تھا۔ جسم پر موت کی بے حسی طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے چیخ مارنی چاہی لیکن میری آواز نہ نکل سکی۔ یہ کوئی چڑیل ہی ہو سکتی تھی۔ وہ میرے بالکل سامنے آ کر رک گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ اس کا اب بھی مجھ سے سات آٹھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس کا بازو لمبا ہوتا گیا اور پھر اس کا لمبے نوکیلے ناخنوں والا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھا۔ میں نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔

اس عورت نما چڑیل نے مجھے گردن سے پکڑ کر زمین سے اوپر اٹھا لیا تھا۔ اب میں بھی اس کے ساتھ ہوا میں لٹکنے لگا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب قسم کی دبی دبی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ مجھے اسی طرح اٹھائے تابوت کے پاس لے آئی پھر اس نے مجھے تابوت میں پھینک دیا۔ میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے اوپر گرا۔ تابوت کی تہہ میں پتھر بچھے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس بلا کے حلق سے ایک بھیانک چیخ کی آواز نکلی جس کے ساتھ ہی میری بھی چیخ نکل گئی۔

اس بلا نے زور سے تابوت کا ڈھکنا بند کر دیا۔ تابوت کے اندر گھپ اندھیرا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں قبر میں زندہ دفن کر دیا گیا ہوں۔ باہر خاموشی چھا گئی تھی۔ جس بلا نے مجھے تابوت میں بند کیا تھا اس کے سانس لینے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ تابوت کے اندر میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے دو تین لمبے لمبے سانس

لیے اور تابوت کی چھت پر زور زور سے مکے مارنے لگا۔ میں نے دو تین بار ڈھکنے کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اس طرح بند ہو گیا جیسے اب نہیں کھلے گا۔

میں تابوت کی چھت اور دیواروں پر ہاتھ بھی مار رہا تھا اور چلا بھی رہا تھا کہ مجھے باہر نکالو۔ مجھے باہر نکالو۔ اچانک مجھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں خاموش ہو گیا۔ کوئی تابوت کے قریب آ رہا تھا۔ یہ سوائے اس منحوس بلا کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اپنی حالت پر رونا آ رہا تھا کہ میں خواہ مخواہ کیوں اسٹیشن پر ٹرین سے اتر گیا اور اگر اتر بھی گیا تھا تو مجھے جے دیو کے ساتھ ان غاروں کو دیکھنے نہیں آنا چاہیے تھا۔ باہر سے کسی عورت کی آواز آئی۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں تابوت کھول رہی ہوں۔"

یہ آواز کسی عام عورت کی تھی۔ اس بلا کی آواز نہیں تھی۔ میں کان لگا کر سننے لگا۔ باہر سے تابوت کا ڈھکنا کھل گیا۔ ڈھکن کے اٹھتے ہی ایک دم دن کی روشنی ہو گئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دالان میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے سامنے ایک لڑکی ہاتھ میں چھڑی لیے کھڑی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا تھا۔ میں چونک پڑا۔ یہ وہی ٹرین والی اداس آنکھوں والی لڑکی تھی جس کے عشق میں دیوانہ ہو کر میں ٹرین سے اتر کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا۔ اور آخر اس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ لڑکی بھی مجھے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ کہنے لگی۔

"تم ریل گاڑی میں تھے۔ یہاں کیسے آ گئے؟"

میں اسے کیا کہتا کہ میں وہاں کیسے آ گیا تھا۔ میں تابوت سے باہر نکل آیا تھا۔ دالان کا سارا ماحول ہی بدل گیا تھا۔ اندھیرا غائب ہو گیا تھا۔ دیواروں کے اوپر قدیم طرز کے روشندان کھل گئے تھے جن میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ چھت کے ساتھ پہلے جو جالے لٹک رہے تھے وہ اب غائب ہو گئے تھے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

اس نے کہا۔

"تم یوگی مت کی پہاڑی والے پرانے مندر میں ہو۔ میں پہاڑی پر جڑی بوٹیاں اکٹھی کرنے آئی تھی کہ مندر میں سے کسی کے چلانے کی آواز سن کر ادھر آ گئی۔

میں نے کہا۔

"سب سے پہلے مجھے یہاں سے باہر نکالو۔"

وہ مجھے لے کر دالان کی طرف گئی تو وہاں دروازہ تھا جس کے کواڑ نہیں تھے۔ باہر دن کی روشنی ہی روشنی تھی۔ میں سوچنے لگا یہ سب کچھ جو میرے ساتھ ہوا ہے کہیں میں نے دن کے وقت کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھا۔ پہاڑی کی ڈھلان اتر کر ہم نیچے آ گئے۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"یہاں جو شمشان بھومی ہے اس کے باوے کا لڑکا جے دیو مجھے رام جنی کے غار دکھانے لایا تھا۔ وہ غار کس طرف ہیں؟"

لڑکی کہنے لگی۔

"وہ ٹیلے کی دوسری طرف ہیں۔ چلو میں تمہیں وہاں لیے چلتی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔

"اس مندر میں تابوت کیوں پڑا ہے۔ مندروں میں تو مورتیاں ہوتی ہیں۔ یہ تابوت کہاں سے آ گیا؟"

لڑکی ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر کہنے لگی۔

"تمہیں اس طرف نہیں جانا چاہیے تھا۔"

ہم ٹیلے کی ڈھلان پر اس جگہ آ گئے جہاں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غار شروع ہوتے تھے۔ باہر جے دیو کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہیں بڑا تلاش کیا۔"

میں نے کہا۔

"تمہارے غاروں میں بھٹک گیا تھا۔ اس نے مجھے باہر نکالا ہے۔"

"کس نے؟"

جے دیو نے پوچھا۔

□.....□.....□

میں نے پلٹ کر دیکھا تو اداس آنکھوں والی لڑکی وہاں نہیں تھی۔ وہ تو جیسے کسی چھلاوے کی طرح اچانک غائب ہوگئی تھی۔ جے دیو حیران تھا کہ مجھے کون سی لڑکی غاروں میں سے نکال لائی ہے اور میں حیران ہو رہا تھا کہ اداس آنکھوں والی جو لڑکی مجھے تابوت میں سے نکال کر لائی تھی وہ کہاں غائب ہوگئی ہے۔ جے دیو نے پوچھا۔

"تم کسی لڑکی کی بات کر رہے تھے؟"

میں نے اسے اداس آنکھوں والی لڑکی کا حلیہ بتایا تو میں نے دیکھا کہ اس لڑکے کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"وہ تمہیں کہاں ملی تھی؟"

میں نے اس سے بہت کچھ چھپالیا۔ صرف اتنا بتایا کہ یہ لڑکی مجھے یوگی مت پہاڑی کی دوسری جانب ملی تھی اور اس نے مجھے یہاں تک کا راستہ بتایا تھا۔ جے دیو خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگا کہ!

"میرے ساتھ گھر چلو۔"

وہ مجھے اپنے شمشان بھومی والے کوارٹر میں لے گیا۔ اس نے دروازہ بند کرلیا اور کہنے لگا۔

"اس مکان سے باہر مت نکلنا۔ میں پتاجی کو بلاتا ہوں۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آخر بات کیا ہے۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔ تم یہ سب کچھ کس لیے کر رہے ہو؟"

جے دیو بولا۔

"تم بڑے خوش قسمت ہو کہ اس لڑکی نے تمہیں کچھ نہیں کہا اور تم جان بچا کر آ گئے۔"

جے دیو کی باتوں سے اس لڑکی کے بارے میں میری حیرانی اور میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

جے دیو بولا۔

"موہن بھیا! وہ لڑکی جو تمہیں غاروں میں سے نکال کر لائی تھی وہ ایک بھٹکی ہوئی آتما ہے۔ اس کا نام ترشنا ہے۔ وہ جس آدمی کو دکھائی دیتی ہے وہ آدمی اگلے روز مر جاتا ہے۔ اگر نہ مرے تو ترشنا کی بھٹکی ہوئی آتما خود آ کر اسے مار ڈالتی ہے۔ اب تم یہاں سے باہر نہ نکلنا۔ میرے پتاجی ابھی آ کر تم پر ایسا جادو ٹونہ کر دیں گے کہ ترشنا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

اس سے پہلے کہ میں جے دیو سے کچھ اور پوچھتا وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں حیرت میں گم ہوگیا اور سوچنے لگا کہ کیا واقعی یہ لڑکی بھٹکی ہوئی روح ہے؟ اور جس کسی کو ملتی ہے وہ اگلے روز مر جاتا ہے اور اگر نہ مرے تو وہ خود آ کر اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ ساری کہانی مجھے جھوٹی لگ رہی تھی۔ ہندو لوگوں کا عقیدہ بڑا کمزور ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کے توہمات پر زبردست یقین رکھتے ہیں۔ مجھے جے دیو کی باتوں پر حیرانی ضرور ہوئی مگر یقین بالکل نہیں آیا تھا۔ یہ کہانی مجھے الف لیلیٰ کی کسی کہانی کی طرح لگی مگر یہ کہانی ہی تھی۔ محض ایک کہانی جسے

لوگوں نے اپنی طرف سے مبالغہ شامل کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا۔ اس قسم کی من گھڑت اور مبالغہ آمیز کہانیاں میں پہلے بھی ان علاقوں میں ہندو لوگوں کی زبانی بہت سن چکا تھا۔

اتنے میں جے دیو اپنے دبلے پتلے بوڑھے باپ کو لے کر آ گیا۔ اس نے اداس آنکھوں والی لڑکی ترشنا کے بارے میں جو نئی کہانی سنائی وہ یوں تھی کہ ترشنا کے ماں باپ بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ وہ اسی گاؤں کی رہنے والی تھی اور اپنے ماں باپ کی واحد اولاد تھی۔ ماں باپ کے مرنے کی بعد اس کے دادا نے اس کی پرورش کی۔ جب وہ جوان ہوئی تو دادا نے گاؤں کے ایک لڑکے سے اس کا بیاہ کر دیا۔ شادی کی پہلی رات اس کا خاوند مر گیا۔ اس گاؤں کے لوگ پرانی رسومات کے بڑے سختی سے پابند تھے اور ان میں یہ طے تھا کہ اگر کسی عورت کا خاوند شادی کی پہلی رات کو مر جاتا تھا تو اس کی نو بیاہتا دلہن کو اپنے خاوند کی چتا پر بیٹھ کر ستی ہونا پڑتا تھا۔ یعنی اپنے خاوند کے مردے کے ساتھ خود بھی جل جانا پڑتا تھا لیکن ترشنا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ جل کر نہیں مرے گی۔ چنانچہ جب ترشنا کے خاوند کی لاش کو جلانے کے لیے شمشان کی طرف لے جانے لگے تو ترشنا گھر سے بھاگ گئی۔ گاؤں والے اس کے پیچھے بھاگے اور اسے دریا کے گھاٹ پر جا کر دبوچ لیا۔ ترشنا چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ میں ستی نہیں ہونا چاہتی۔ مجھے آگ میں نہ ڈالو۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ مگر وہاں اس کی فریاد کون سنتا' اس کا بوڑھا دادا بھی اسے نہیں بچا سکتا تھا۔ چنانچہ لوگوں نے ترشنا کو زبردستی اٹھا کر چتا کی لکڑیوں پر ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کے خاوند کی لاش کے ساتھ لٹا دیا اور اس کے اوپر گھی چھڑک کر آگ لگا دی۔ کہتے ہیں کہ آگ لگتے ہی ترشنا کی خوفناک چیخ بلند ہوئی اور وہ تڑپ کر بالکل سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس کے دونوں ہاتھ پاؤں لوہے کے تار سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ شعلے اس کے جسم کو جلا رہے تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ترشنا آگ کے بگولے کی طرح چتا کے اوپر گھومنے لگی اور گھومتے گھومتے وہاں کھڑے لوگوں کی طرف بڑھی۔ اس کی چیخیں بلند ہو رہی تھی۔ لوگ جوتیاں چھوڑ کر بھاگ اٹھے۔ لڑکی ترشنا کے سارے جسم کو آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ بگولے کی طرح گھوم رہی تھی۔ گھومتے گھومتے وہ شمشان گھاٹ کے احاطے میں چکر لگانے لگی۔ پھر وہ زمین پر گر پڑی اور جل کر راکھ ہوگئی۔ اس کی راکھ اور ہڈیاں ساری رات وہیں پڑی رہیں۔ صبح اس کا بوڑھا دادا اپنی پوتی کے پھول یعنی ہڈیاں اور راکھ لینے آیا تاکہ وہ انہیں دریا میں بہا سکے۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا چھوٹا سا گھڑا تھا۔ جے دیو کا باپ اسے اس جگہ لے گیا جہاں اس کی پوتی ترشنا آگ کے شعلوں میں لپٹی زمین پر گر کر جل کر راکھ ہوگئی تھی۔ وہاں ترشنا کی ہڈیاں اور راکھ پڑی تھی۔ جے دیو کا باپ اشلوک وغیرہ پڑھتے ہوئے ترشنا کے پھول اٹھا کر مٹی کے مٹکے میں ڈالنے لگا۔ جے دیو کے باپ کا کہنا ہے کہ جب وہ ترشنا کی ساری ہڈیاں اور راکھ سمیٹ کر برتن میں ڈال چکا تو اس نے جہاں ترشنا جل مری تھی ترشنا کو زمین پر لیٹے ہوئے دیکھا وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ ترشنا کے دادا نے پوچھا۔

"کیا ہوا پجاری جی؟"

جے دیو کے پجاری باپ نے اس وقت تو ترشنا کے دادا کو کچھ نہ بتایا صرف اتنا ہی کہا کہ وہ یونہی ڈر گیا تھا لیکن بعد میں اس نے اپنے بیٹے جے دیو کو بتایا کہ اس نے جہاں ترشنا جل کر مری تھی وہاں ترشنا کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بالکل زندہ حالت میں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ سیاہ تھا اور بال جل چکے تھے۔ اس نے ایک بھیانک چیخ مار کر جے دیو کے باپ سے کہا تھا کہ میں تم لوگوں سے اپنی جان کا بدلہ لوں گی اور پھر غائب ہوگئی تھی۔ جے دیو کے باپ نے بتایا کہ اب کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ترشنا بالکل زندہ حالت میں اپنے دادا کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر اپنے گاؤں آتی ہے حالانکہ اس کا دادا بھی مر چکا ہے۔ گاؤں کے اسٹیشن پر اتر کر وہ دادا کے ساتھ یکے میں سوار ہو کر اپنے گاؤں کی طرف آجاتی ہے۔ اس دوران اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتی نہ اس کا یکہ کسی کو نظر آتا ہے۔ جو کوئی اس کو دیکھ لیتا ہے وہ اس کے دوسرے ہی دن مر جاتا ہے۔ اگر نہ مرے تو ترشنا کی آتما خود آ کر اسے مار ڈالتی ہے۔ جے دیو کا باپ کہنے لگا۔

"اس واقعے کو چار سال بیت گئے ہیں۔ ان چار سالوں میں ترشنا کی بھٹکی ہوئی آتما گاؤں کے صرف تین آدمیوں کو نظر آئی تھی۔ وہ تینوں کے تینوں اگلے روز مر گئے تھے۔"

میں نے جے دیو کے باپ کو بتایا کہ ترشنا کی بھٹکی ہوئی روح مجھے ریل گاڑی میں بھی اپنے دادا کے ساتھ نظر آئی تھی اور میں نے اس یکے کو بھی گاؤں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

جے دیو کے باپ نے پوچھا۔

"ریل گاڑی میں کیا وہ تمہیں دیکھ کر مسکرائی تھی؟"

میں نے کہا۔

"ہاں، جب ٹرین اسٹیشن پر رک گئی تھی اور وہ اپنے دادا کے ساتھ ڈبے سے اترنے لگی تھی تو اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا تھا اور وہ مسکرائی تھی۔"

"اس کے بعد آج جب وہ تمہیں یوگی مت کے غار کے باہر ملی تھی تو اس نے تم سے کوئی بات کی تھی؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس نے کہا تھا کہ میں ادھر جڑی بوٹیوں کی تلاش میں آئی ہوں۔ آؤ میں تمہیں راستہ دکھائی ہوں اور وہ مجھے وہاں لے آئی تھی جہاں جے دیو پہلے سے موجود تھا۔"

بوڑھے پجاری نے گھبرا کر جے دیو سے پوچھا۔

"جے دیو تم نے تو ترشنا کی آتما کو نہیں دیکھا؟"

جے دیو بولا۔

"نہیں پتا جی! وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔"

میں نے بوڑھے سے کہا۔

"جے دیو کے پاس پہنچنے کے بعد جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے یہ لڑکی غار سے نکال کر لائی ہے تو جے دیو نے پوچھا تھا کہ کون سی لڑکی؟ میں نے گردن موڑ کر کہا تھا کہ یہ لڑکی اور اس وقت ترشنا کی بھٹکتی روح غائب ہو چکی تھی۔"

بوڑھے نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

"ہے بھگوان! تیری بڑی کرپا ہے کہ اس منحوس آتما نے میرے بیٹے کو نہیں دیکھا۔ نہیں تو میرا بیٹا بھی موت کے منہ میں چلا جاتا۔"

تب بوڑھے نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"موہن! تم بڑی بھاری مصیبت میں پھنس چکے ہو۔ ترشنا کی آتما نے تمہیں صرف دیکھا ہی نہیں ہے بلکہ تم سے باتیں بھی کی ہیں۔ اب تمہارا زندہ رہنا ناممکن ہے۔"

میں ان کی اس قسم کی باتوں پر دل میں ہنس رہا تھا لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میرے دل میں اس وقت یہ خوف بھی سر اٹھانے لگا تھا کہ کہیں واقعی ترشنا کی آتما مجھے ہلاک نہ کر دے۔ ایک تو میری عمر چھوٹی تھی۔ دوسرے مجھے اس قسم کے واقعات کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ میرا اپنے ربّ العالمین پر ایمان بھی

پختہ تھا مگر تقاضائے بشری اور کم عمری کے باعث میں دل میں ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں میں ان کفار کے توہمات اور جادو ٹونے کے چکر میں پھنس کر سچ مچ نہ مارا جاؤں۔ میرے ضمیر میں یہ کانٹا بھی کھٹک رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے چنانچہ میں دل میں بار بار خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگ رہا تھا۔ چناں چہ جب بوڑھے پجاری نے کہا۔

"موہن! تم میرے بیٹے کے دوست ہو۔ میں ترشنا کی آتما سے تمہیں بچانے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔ میں کچھ منتر پڑھ کر اس کوارٹر کے اردگرد پھونک دوں گا۔ ان منتروں کی طاقت کے اثر سے کل ترشنا کی بدروح اس کوارٹر میں داخل نہ ہو سکے گی اور کم از کم کل وہ تم پر حملہ نہیں کر سکے گی۔"

میں بھی ان لوگوں کی مشرکانہ باتوں سے متاثر ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"لیکن اس کے بعد بھی وہ مجھے ہلاک کر سکتی ہے۔ میں کہاں کہاں اس بدروح سے اپنے آپ کو بچاتا پھروں گا۔"

جے دیو کے باپ نے کہا۔

"اس کا علاج، اس کا اپائے بھی میرے پاس ہے۔ میں تمہیں منتر پھونک کر ایک مہرہ دے دوں گا۔ وہ مہرہ تم اپنی جیب میں بڑی حفاظت سے رکھنا۔ جب تک یہ مہرہ تمہارے پاس رہے گا ترشنا کی آتما تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکے گی۔ بس تم صرف کسی طرح آج کی رات اس کمرے میں بندرہ کر گزار دو۔"

اس کے بعد جے دیو کا باپ منتر پڑھتے ہوئے کوارٹر کے گرد چکر لگانے لگا۔ جے دیو نے مجھے بتایا کہ پتا جی نے منتر اور اشلوک پڑھتے ہوئے کوارٹر کے پندرہ چکر لگائے ہیں۔ چکر پورے کرنے کے بعد بوڑھا میرے کمرے میں آ کر بولا۔

"موہن! میں نے اپنا منتر پورا کر لیا ہے۔ اب تم کل سارا دن اس کمرے میں بند رہو گے۔ ایک پل کے لیے بھی باہر قدم نہیں رکھو گے۔ جے دیو تمہارے لیے بھوجن پانی لا کر دے جایا کرے گا۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے دوسرے دن اپنے آپ کو کوارٹر کے اس بوسیدہ کمرے میں بند کر لیا۔ کسی وقت مجھے لگتا کہ میں خوامخواہ توہم پرست لوگوں کی باتوں میں آ گیا ہوں۔ مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ پھر خیال آتا کہ کہیں ان لوگوں کی باتیں سچ نہ نکل آئیں اور ترشنا کی بدروح سچ مچ گلا گھونٹ کر مجھے مار نہ ڈالے۔ ایک دو دفعہ میرے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ میں کیوں ان لوگوں کی باتوں میں آ کر کمرے میں قید ہو گیا ہوں۔ مجھے یہاں سے بھاگ کر سیدھا اسٹیشن پر چلے جانا چاہیے۔ وہاں سے دلی جانے والی کوئی گاڑی مجھے مل ہی جائے گی لیکن میں کمرے سے باہر قدم نہ رکھ سکا۔ جے دیو مجھے آ کر دوپہر اور رات کو کھانا وغیرہ دے گیا تھا۔

دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ اگلا دن طلوع ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سر سے بلا ٹل گئی۔ اب آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں اس علاقے میں رہوں گا ہی نہیں تو ترشنا کی بدروح کہاں آئے گی۔

صبح کے وقت جے دیو کا باپ آ گیا۔ کہنے لگا۔

"موہن! بھگوان کی تم پر بڑی کرپا ہوئی ہے کہ میرے منتروں نے تمہیں ترشنا ایسی بلا سے بچا لیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ رات کو وہ آئی تو نہیں تھی؟ تمہیں چیخیں تو سنائی نہیں دیں؟ تمہارے سینے میں آ کر تمہارا گلا دبانے کی کوشش نہیں کی؟"

میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ترشنا کی بدروح خواب میں بھی مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے جے دیو کے باپ کو بتادیا کہ کچھ نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔

''میں نے اپنے گورو مہان گورو گورکھ ناتھ کے منتروں کا جاپ کیا تھا۔ ترشنا کی بدروح آ کر تمہیں کیسے تنگ کر سکتی تھی۔''

میں نے کہا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب میں یہاں سے چلے جانا چاہتا ہوں۔''

''تم کہاں جاؤ گے؟'' جے دیو کے باپ نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

''میں دلی جاؤں گا۔ دلی میں میرے ماتا پتا رہتے ہیں۔''

وہ کہنے لگا۔

''میں کم از کم تین چار دن سے پہلے یہاں سے جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم کم از کم تین دن ہمارے پاس اس کوارٹر میں ہی رہو۔ میں منتر پھونک کر مہرہ اپنے ساتھ لایا ہوں۔ یہ تم اپنے پاس رکھو گے۔ تمہیں کوارٹر میں بند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کوارٹر سے نکل کر ادھر ادھر چل پھر سکتے ہو لیکن میں کم از کم تین دن تمہیں اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتا ہوں۔''

میں نے یونہی کہہ دیا۔

''لیکن میرا دلی جانا بہت ضروری ہے۔ مجھے گھر سے نکلے کئی روز ہو گئے ہیں۔ میرے ماتا پتا میرے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

بوڑھے پجاری نے سوچ کر کہا۔

''موہن بیٹا! میری ایک بات مان لو۔ گورکھ ناتھ کا مہرہ میں تمہیں دے رہا ہوں۔ اس کی طاقت ترشنا کی آتما کو تمہارے پاس نہیں آنے دے گی لیکن میں چاہتا ہوں کہ کم از کم تم دو دن اور میرے پاس رہ جاؤ۔ اس کے بعد بے شک بے فکر ہو کر چلے جانا۔''

بت پرستوں کے ماحول میں رہنے کی وجہ سے ان کے توہمات کا مجھ پر بھی کچھ اثر ہو چکا تھا۔ یہ قدرتی بات تھی اور میں کوئی پختہ عمر کا آدمی بھی نہیں تھا۔ چودہ پندرہ سال کی میری عمر تھی میں نے سوچا کہ چلو دو دن اور رہ لیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میں آنے والی کسی بلا سے بچ جاؤں کیونکہ یوگی مت کے پرانے مندر میں، میں ایک بلا کے قابو آ چکا تھا اور خدا نے مجھے وہاں سے نکالا تھا۔ اگر خدا میری مدد نہ فرماتا تو پتہ نہیں قبر ایسے تابوت کے اندر میرا کیا حال ہوتا۔ میں زندہ بھی رہتا یا نہ رہتا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ جس لڑکی ترشنا کی بدروح کے بارے میں یہ لوگ مجھے ایسی ایسی خوفناک باتیں بتا رہے تھے اس نے مندر میں آ کر مجھے تابوت سے باہر نکالا تھا۔ اگر وہ بہ قول جے دیو کے باپ کے واقعی میری جان کی دشمن تھی اور مجھے ہلاک کرنا چاہتی تھی تو مجھے بند تابوت سے کیوں نکالتی؟ وہیں مجھے مرنے کے لیے چھوڑ دیتی۔ اگر وہ لڑکی ترشنا زندہ انسانی حالت میں نہیں تھی اور اس کی بدروح تھی تو وہ مجھے بڑی آسانی سے وہیں ہلاک کر سکتی تھی۔ جب ان باتوں کا خیال آتا تو مجھے جے دیو کے باپ کی ساری باتیں جھوٹی لگتیں اور میرے دل سے ترشنا کی بدروح کا خوف کچھ دیر کے لیے نکل جاتا لیکن پھر کفر غالب آ جاتا اور میرا ناپختہ ذہن توہمات کا شکار ہو جاتا کہ کیا پتا ترشنا کی روح واقعی کسی وقت اچانک نمودار ہو کر میرا گلا دبا دے۔

عجیب شش و پنج کی حالت تھی میری لیکن میں نے وہاں مزید دو دن ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب وہ اداس آنکھوں والی لڑکی جو مجھے ریل گاڑی میں ملی تھی اور جس سے مجھے محبت ہو گئی تھی میرے دل و دماغ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے غائب ہوگئی تھی اور اس کی جگہ ایک ڈراؤنی چڑیل نمودار ہوگئی تھی جو مجھے ہلاک کرنے کے لیے میرا پیچھا کررہی تھی۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ میں نے ان لوگوں کی باتوں کو سچ مان لیا تھا ورنہ کسی کسی وقت جب مجھ پر خالص محبت اور صرف محبت کا غلبہ ہوتا تو اس لڑکی کی معصوم مسکراہٹ والا بھولا بھالا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا اور مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکی کوئی چڑیل بھی ہوسکتی ہے۔

□.....□.....□

اس کے باوجود یوگی مت کے ٹیلے کے مندر والی چڑیل کا ڈراؤنا مسئلہ اپنی جگہ پر قائم تھا۔ ابھی تک میں اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ وہ حقیقت تھی یا میرا دن میں دیکھا ہوا کوئی ڈراؤنا خواب تھا۔ جے دیو کے پتاجی نے مجھے منتروں والا مہرہ دے دیا تھا۔ یہ کالے رنگ کا خوبانی کی گٹھلی کے برابر تھا میں اس مصیبت کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن مجبور ہوکر رکھ لیا تھا کہ جہاں اور سب کچھ ہورہا ہے وہاں یہ بھی سہی۔

مزید ایک دن گزر گیا۔ کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ میں کوارٹر سے نکل کر ٹہلنے کے لیے کھیتوں میں یا ندی کی طرف نکل جاتا تھا۔ اس روز کا ذکر ہے کہ شام کے قریب کچھ لوگ مرگھٹ میں جلانے کے واسطے ایک مردہ لے کر آئے۔ جے دیو نے بتایا کہ یہ شہر کی ایک گانے بجانے والی طوائف کی لاش ہے جو اسی گاؤں کی رہنے والی تھی اور اس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میری لاش کو میرے گاؤں والے مرگھٹ میں نذر آتش کیا جائے۔ لاش کے ساتھ چھ سات آدمی بھی تھے۔ جے دیو کے باپ نے مچان پر لکڑیاں چن دی تھیں۔ عورت کی لاش کو لکڑیوں کے اوپر لٹا کر اس کے اوپر لکڑیوں کی ایک اور تہہ لگادی۔ ایک آدمی نے لکڑیوں پر پیتل کی کٹوری میں سے گھی انڈیل دیا۔ ان کے ساتھ آخری رسومات کے وقت اشلوک پڑھنے والا کوئی برہمن وغیرہ نہیں تھا۔ یہ کام جے دیو کے باپ نے ہی انجام دیا۔ تین چار آدمی جو عورت کا مردہ لے کر شہر سے آئے تھے ان میں سے ایک نے چتا کو آگ دکھادی۔ تھوڑی دیر بعد لکڑیوں نے آگ پکڑ لی اور شعلے بلند ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی مردے کو لانے والے آدمی جے دیو کے باپ کو کچھ پیسے وغیرہ دے کر واپس چلے گئے۔ میں اور جے دیو جلتی ہوئی چتا سے کچھ فاصلے پر املی کے درخت کے نیچے بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اس کا باپ چتا کو آگ لگا کر کچھ دور ایک تخت پوش پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ میں نے جے دیو سے پوچھا۔

"آگ لگنے سے مردے کو تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہوگی۔"

وہ بولا۔

"آدمی جب مرجاتا ہے تو اس کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔ وہ تو پتھر ہوجاتا ہے۔ اس کو چاہے زمین میں دبادو چاہے آگ میں جلادو سب ایک برابر ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن آدمی کو آگ لگانا مجھے اچھا نہیں لگا۔"

جے دیو بولا۔

"یہ تو دھرم کی بات ہے۔ ہماری ماتاجی کہا کرتی تھیں کہ جب ہم مردے کے جسم کو آگ لگاتے ہیں تو اگنی دیوی اسے اٹھا کر لے جاتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ اگنی دیوی کون ہے۔ کہاں سے آکر مردے کو اٹھا کر لے جاتی ہے؟"

جے دیو نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور بولا۔

"تم ہندو ہوکر اگنی دیوی کو نہیں جانتے؟ اگنی دیوی آگ کی دیوی ہے۔ وہ آکاش سے آتی ہے اور مردے

کے جسم کو اٹھا کر آکاش کی طرف لوٹ جاتی ہے۔"

مجھے فوراً خیال آگیا کہ میں نے تو جے دیو کے آگے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا ہوا ہے۔ میں نے کہا۔

"اچھا اچھا..... ہاں اب میں سمجھ گیا میں بھول گیا تھا۔"

اتنے میں جے دیو کا باپ تخت پوش سے اٹھ کر ناریل ہاتھ میں لیے آیا اور جے دیو سے کہنے لگا۔

"ان لوگوں میں سے عورت کے پھول اکٹھے کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ وہ کہہ گئے ہیں کہ آپ خود ہی پھول اٹھا کر ندی میں بہا دینا۔ ہمیں جلدی شہر پہنچنا ہے۔ میں رات کو مردے کے پھول ایک کٹورے میں ڈال کر رکھ دوں گا۔ تم صبح صبح ندی پر اشنان کرنے جاتے ہوئے ساتھ لے جانا اور ندی میں بہادینا۔ میں سونے جارہا ہوں۔ تم بھی جاکر آرام کرو۔"

جے دیو کا بوڑھا باپ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد جے دیو کہنے لگا۔

"موہن! ایک کام کرتے ہیں۔ میں صبح صبح اشنان کرنے کے لیے نہیں اٹھ سکتا۔ مردہ تھوڑی دیر کے بعد جل کر راکھ ہوجائے گا۔ میں سلاخوں سے انگارے ہٹا کر بڑے چمٹے سے مردے کی ہڈیاں اور کچھ راکھ چتا میں سے اٹھا کر مٹی کے مرتبان میں ڈال کر تمہیں دے دوں گا۔ تم اسے اپنے کمرے کے کونے میں رکھ دینا۔ کل دوپہر کو میں لے جاکر اسے ندی میں بہادوں گا۔ پتاجی نے صبح پوچھا تو میں کہہ دوں گا کہ میں نے صبح صبح ہی پھول ندی میں بہادیئے تھے۔"

ہندو لوگ اپنے مردوں کی راکھ اور ہڈیوں کو پھول کہتے ہیں۔ امیر ہندو تو اپنے عزیزوں کے پھول گنگا دریا میں لے جاکر بہاتے ہیں۔ غریب لوگ وہیں کسی ندی یا دریا میں بہادیتے ہیں۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم مٹی کا کٹورا کمرے میں رکھ دینا۔"

ہم وہیں بیٹھے رہے۔ چتا کی آگ آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئی پھر شعلے غائب ہوگئے اور صرف انگارے باقی رہ گئے۔ رات نو ساڑھے نو بجے کا وقت ہوگا۔ جے دیو اٹھ کر چتا کے قریب گیا۔ لوہے کی ایک لمبی کنڈے والی سلاخ سے اس نے لکڑی کے بڑے بڑے انگاروں کو ایک طرف ہٹادیا۔ پھر ایک بہت لمبے چمٹے سے اس نے چتا میں سے دس بارہ ہڈیاں اور تھوڑی سی راکھ نکال کر مرتبان میں ڈالی اور اسے اٹھا کر میرے کمرے میں آگیا۔ اس نے مردے کے پھول یعنی مردے کی ہڈیوں اور راکھ والا مرتبان کونے میں رکھ دیا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ کل کسی وقت اسے ندی میں بہادیں گے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کمرے کا دروازہ بند کرکے کنڈی لگادی۔ مجھے بڑی سخت نیند آرہی تھی۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا تھوڑی دیر بعد میں سوگیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ کھٹ کھٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ دروازے پر کوئی آہستہ آہستہ دستک دے رہا تھا۔ میں یہ سمجھا کہ صبح ہوگئی ہے اور جے دیو نے دوپہر کا ارادہ بدل دیا ہے اور مردے کی ہڈیوں والا مرتبان لینے آیا ہے۔ میں چارپائی سے اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ میں نے احتیاطاً پوچھ لیا۔

"کون ہے؟"

دوسری طرف سے ایک عورت کی آواز آئی۔

"میں جھانسی کی لکشمی طوائف ہوں۔ اپنے پھول لینے آئی ہوں۔"

دہشت کے مارے میرے جسم پر لرزہ سا طاری ہوگیا۔ یہ اس عورت کی آواز تھی جس کے مردہ جسم کو شام کے وقت جلا کر راکھ کرچکے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باہر سے اس عورت کی ایک بار پھر آواز آئی۔

''دروازہ کھولو میں جھانسی کی لکشمی ہوں۔ میں اپنے پھول لینے آئی ہوں۔''

میں ایک بھٹکتی بدروح کے لیے کیسے دروازہ کھول سکتا تھا۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کمرے کی صرف ایک ہی کھڑکی تھی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دہشت کی وجہ سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے سونے سے پہلے بتی بجھادی تھی۔ اتنے میں دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔ میں ڈر کر چارپائی کے پیچھے چھپ گیا۔ میری آنکھیں دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک عورت کا ہیولا سا اندر داخل ہوا۔ میرے دل کی دھڑکن خوف کے مارے ڈوب رہی تھی۔ عورت اندھیرے میں کچھ کچھ نظر آ رہی تھی۔ اس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ وہ سیدھی اس طرف آ گئی جہاں پر جے دیو نے جھانسی کی طوائف لکشمی کی ہڈیاں اور راکھ مرتبان میں رکھی ہوئی تھیں۔ عورت کا ہیولا مرتبان کے پاس آ کر رک گیا۔ مجھے عورت کے سرد آہ بھرنے کی آواز آئی۔ وہ مرتبان پر جھک گئی۔ پھر اس نے مرتبان کو اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے سے چند گز کے فاصلے پر رک گئی۔ اس نے گردن موڑ کر اس جانب دیکھا جہاں میں چارپائی کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''میرے ساتھ چلو گے۔ میں جھانسی کی رانی کے محل میں رہتی ہوں۔''

مجھ پر لرزہ طاری تھا۔ میں اسے کیا جواب دیتا۔ خوف سے میرا خون خشک ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت نہیں ہے بلکہ لکشمی کی بدروح ہے جو مرنے کے بعد اسی دنیا میں بھٹکنے لگی ہے۔ جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ بھٹکتی بدروح بولی۔

''تمہاری آتما بڑی اچھی ہے' یہاں سے چلے جاؤ۔''

اور وہ دروازے میں سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد دروازہ اپنے آپ بند ہو گیا۔ پانچ سات منٹ تک میں اسی طرح بت بنا چارپائی کے پیچھے چھپ کر بیٹھا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ روح کمرے سے جا چکی ہے اور دوبارہ نہیں آئے گی تو میں اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اب نیند مجھے کہاں آنی تھی۔ باقی کی ساری رات چارپائی پر کبھی بیٹھ کر اور کبھی لیٹ کر پہلو بدلتے گزار دی۔ دن نکل آیا میں نے دیکھا کہ کونے میں لکشمی طوائف کی راکھ اور ہڈیوں والا مرتبان نہیں تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ رات کو میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ جب مرتبان غائب پایا تو مجھے یقین کرنا پڑا کہ رات کو مردہ لکشمی کی بدروح آئی تھی اور اپنے پھول لے گئی ہے۔

دن کافی نکل گیا تھا کہ جے دیو آ گیا۔ کہنے لگا۔

''میں مردے کے پھول ندی میں بہا آؤں پھر اکٹھے بیٹھ کر ناشتہ کریں گے۔''

میں خاموش رہا۔ جے دیو میرا ہم عمر لڑکا سا ہی تھا۔ وہ اس کونے کی طرف گیا جہاں اس نے شام کو خود مرتبان رکھا تھا' مگر مرتبان وہاں نہیں تھا۔ اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا کہنے لگا۔

''مرتبان کہاں گیا؟''

میں پھر بھی خاموش رہا وہ بولا۔

''کیا بات ہے موہن! تم خاموش کیوں ہو؟ اگر صبح صبح تم نے مرتبان کی راکھ اور ہڈیاں ندی میں بہا دی ہیں تو یہ بڑی اچھی بات کی ہے تم نے۔''

میں نے کہا۔

''میں نے مردے کے پھول ندی میں نہیں

بہائے۔''

جے دیو اور زیادہ حیران ہو کر بولا۔

''تو پھر مرتبان کہاں چلا گیا؟''

میں نے کہا۔

''مرتبان میں جس مردہ عورت کی راکھ اور ہڈیاں تھیں وہ خود اسے لے گئی ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

جے دیو میرے پاس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جب میں نے اسے رات والا واقعہ سنایا تو میرا منہ تکنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے فوراً جا کر اپنے پتاجی کو یہ واقعہ سنا دیا۔ اس کا بوڑھا باپ میرے پاس آ گیا کہنے لگا۔

''کیا تم پورے وشواس کے ساتھ کہتے ہو کہ رات جو عورت اپنے پھول لینے آئی تھی اس نے اپنا نام لکشمی بتایا تھا؟''

میں نے کہا۔

''بالکل میں پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ اگر یہ کوئی سپنا ہوتا تو مرتبان کو تو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔''

''اس عورت نے کیا کہا تھا؟'' بوڑھے نے پوچھا

میں نے کہا۔

''اس نے دروازے پر دستک دی۔ میں جاگ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ دوسری طرف سے اس نے کہا۔ میں جھانسی کی لکشمی ہوں میں اپنے پھول لینے آئی ہوں۔ میں ڈر کر چارپائی کے پیچھے چھپ گیا کیونکہ جھانسی کی لکشمی کو تو آپ شام کو جلا چکے ہیں۔ عورت نے دوبارہ کہا دروازہ کھولو۔ میں جھانسی کی لکشمی ہوں میں اپنے پھول لینے آئی ہوں۔ میں ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ اپنے آپ کھل گیا اور میں نے ایک عورت کے ہیولے کو دیکھا۔ وہ اندر آئی اور سیدھی کمرے کے اس کونے کی طرف گئی جہاں اس کی راکھ اور ہڈیاں والا مرتبان پڑا تھا۔ اس نے مرتبان اٹھایا اور واپس چل پڑی۔ دروازے کے پاس آ کر اس نے میری طرف گردن موڑ کر دیکھا اور کہنے لگی۔ میرے ساتھ چلو گے؟ میں جھانسی کی رانی کے محل میں رہتی ہوں۔ اس کے بعد وہ دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد دروازہ اپنے آپ بند ہو گیا۔''

جے دیو اور اس کا بوڑھا باپ دونوں بڑی حیرت سے میری بات سن رہے تھے۔ جب میں نے بات ختم کی تو بوڑھا بولا۔

''تم خوش قسمت ہو کہ اس کے ساتھ نہیں گئے۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ میں جھانسی کی رانی کے محل میں رہتی ہوں۔ اس عورت کو جو کہ جھانسی کی مشہور طوائف تھی جھانسی کی رانی کے محل کے کھنڈر میں لے جا کر ہی گلا دبا کر مار دیا گیا تھا۔ پولیس اس کے قاتلوں کو تلاش کر رہی ہے۔''

میں نے جے دیو کے باپ سے کہا۔

''اب میرا جی یہاں سے اکھڑ گیا ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں اور کوئی بدروح مجھے نہ چمٹ جائے۔ اس لیے میں آج یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

بوڑھا کہنے لگا۔

''ابھی ترشنا کی بھٹکتی روح کے چلے کے دو دن باقی ہیں۔ میرا چلہ پورا نہ ہوا تو ترشنا کی بدروح تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس لیے میری مانو دو دن اور رک جاؤ اور مجھے چلہ پورا کر لینے دو۔''

مگر میں نے دل میں وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اور جے دیو نے ناشتہ کیا اس کے بعد میں وہاں سے بھاگنے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ترکیبیں سوچنے لگا؟ جے دیو کچھ دیر کے بعد چلا گیا۔ اس کے باپ نے مجھے کمرے سے باہر نکلنے سے سختی سے منع کیا تھا لیکن مجھے اب اس کے منتروں اور اس کے چلے وغیرہ کی کوئی پروا نہیں تھی۔ مجھے یہی ڈر لگا ہوا تھا کہ یہ جگہ بدروحوں کا مسکن بن چکی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بلا میرے پیچھے بھی لگ جائے۔ میری جیب خالی تھی۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ مجھے ٹرین میں بغیر ٹکٹ سفر کرنا تھا۔ میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا عادی تھا۔ مجھے صرف اتنا ہی کرنا تھا کہ وہاں سے بھاگ کر ریلوے اسٹیشن پر پہنچوں اور جو پہلی گاڑی دلی کی طرف جا رہی ہو اس میں بیٹھ جاؤں۔ میں کمرے سے نکل آیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں نہ تو جے دیو تھا اور نہ اس کا باپ ہی مجھے دکھائی دیا۔ موقع بڑا اچھا تھا۔ میں کھیتوں کی طرف چل دیا۔ اسٹیشن کا راستہ مجھے معلوم تھا۔ میں جلدی جلدی چل رہا تھا لیکن میں نے طے کر رکھا تھا کہ اگر جے دیو یا اس کا باپ آ بھی گیا تو میں واپس جانے سے صاف انکار کر دوں گا۔

مگر میرے پیچھے کوئی نہ آیا۔ کھیتوں سے نکل کر میں چھوٹی کچی سڑک پر ہو گیا جو سیدھی ریلوے اسٹیشن کو جاتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ دلی جانے والی گاڑی کب آئے گی۔ اس نے بتایا کہ ایک گاڑی ابھی ابھی نکل گئی ہے۔ اب ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دوسری گاڑی آئے گی۔ میں پلیٹ فارم پر ہی بیٹھ گیا۔ ٹکٹ میرے پاس نہیں تھا۔ مگر میں بے فکر ہو کر بیٹھا تھا۔ ٹکٹ چیکر نے آ کر ٹکٹ چیک بھی کیا تو زیادہ سے زیادہ یہی کرے گا کہ مجھے اسٹیشن سے باہر نکال دے گا۔ میں کچھ دیر بعد دوبارہ آ جاؤں گا۔ ان سارے چکروں سے میں اس کم عمری میں ہی گزر چکا تھا۔ مشکل صرف اس وقت پیش آتی تھی جب ٹرین میں ٹی ٹی ٹکٹ چیک کرتا تھا۔ میری کم عمری کی وجہ سے آج تک کسی ٹکٹ چیکر نے مجھے ریلوے پولیس کے حوالے نہیں کیا تھا۔ بس وہ مجھے ٹرین سے اتار دیتا تھا۔ اگر اس وقت ٹرین کسی اسٹیشن پر کھڑی ہوتی تھی تو میں پلیٹ فارم پر اتر کر ادھر ادھر ہو جاتا۔ ٹرین چلتی تو دوڑ کر اس کے آخری ڈبے میں سوار ہو جاتا تھا۔ بڑودہ لائن پر بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہوئے میں نے اس قسم کے ایڈونچر کئی بار کیے تھے۔ مصیبت اس وقت پڑ جاتی تھی جب ٹکٹ چیکر مجھے رات کے وقت کسی ویران اسٹیشن پر اتار دیتا تھا۔

اس وقت چونکہ دن تھا اس لیے مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ چنانچہ میں پلیٹ فارم پر ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہا۔ میں نے کرتہ پاجامہ اور چپل پہن رکھی تھی اور کوئی سامان میرے ساتھ نہیں تھا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر تھی اس عمر میں میں کہاں سامان لے کر سفر کرتا پھرتا۔ سامان کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اب ان دنوں کا تصور ذہن میں لاتا ہوں تو بڑا حیران ہوتا ہوں کہ میں اتنے لمبے لمبے سفر بغیر ساز و سامان کے اور وہ بھی بغیر ٹکٹ کیسے کر لیا کرتا تھا۔ گاڑی آ کر پلیٹ فارم پر رکی تو میں تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ یہ گاڑی دلی جا رہی تھی۔ اس کی ایک بوگی کے اوپر بمبئی جھانسی دلی کی تختی لگی ہوئی تھی۔ گاڑی تھوڑی دیر کے لیے ہی رکی اور پھر چل پڑی۔ میری اس زمانے میں ایک عادت رہی تھی کہ میں کسی ایک ڈبے میں ٹک کر نہیں بیٹھتا تھا۔ دو تین اسٹیشن گزر جاتے تو میں کسی دوسرے ڈبے میں چلا جاتا۔ یہ ضرور دیکھ لیتا تھا کہ یہ ڈبہ تھرڈ کلاس کا ہی ہے۔ یہاں سے گاڑی چلی تو دو چار اسٹیشن گزر جانے کے بعد میں تھرڈ کلاس کے ایک اور ڈبے میں آ گیا۔ یہاں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ میں دروازے کے پاس

کھڑا ہو گیا اور باہر کا نظارہ کرتا اور کھیتوں، درختوں اور پہاڑوں، ٹیلوں کو پیچھے کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔

وہاں سے دلی کافی دور تھا۔ کوئی بڑا اسٹیشن آتا تو میں پلیٹ فارم پر اتر کر گھومنا پھرنا شروع کر دیتا۔

□.....□.....□

کتابوں رسالوں کے اسٹال پر جا کر رسالوں کی تصویریں دیکھتا۔ فرسٹ کلاس کے ریفریشمنٹ روم کے سامنے سے ضرور گزرتا کیونکہ وہاں سے اکثر چائے کی خوشبو آیا کرتی تھی جو مجھے بڑی پسند تھی۔ چائے آج کل بھی پاکستان میں بڑی معیاری ملتی ہے مگر اس زمانے میں پٹنہ کے کئی برانڈ ہوتے تھے۔ ایک اور نج پیکو چائے ہوا کرتی تھی۔ اس کی خوشبو مجھے اپنے ساتھ اڑا کر جنگلوں، سمندروں اور چائے کے ان دیکھے باغات کی طرف لے جاتی تھی۔

بڑے اسٹیشنوں کے پلیٹ فارموں پر ان دنوں اتنا رش نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ میں ۴۲۔۱۹۴۱ء کی بات کر رہا ہوں۔ حیرت کی بات ہے اور اس کا میں نے کافی مشاہدہ کیا ہے کہ اس زمانے میں ہر بڑے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم کی فضا الگ ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر بمبے بڑودہ لائن پر ہر دوئی نام کا ایک اسٹیشن آتا تھا۔ یہ چھوٹا سا شہر ہوا کرتا تھا اور یہاں کے لڈو بڑے مشہور تھے۔ اس اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بڑی بوندی والے لڈوؤں کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوتی تھی۔ اس خوشبو میں گلاب کے عرق کی دھیمی دھیمی مہک بھی ہوتی تھی۔ جو ہر دوئی کے لڈوؤں میں ڈالا جاتا تھا۔

یہاں پھیری والے ہر دوئی کے لڈو لے لو ہر دوئی کے لڈو لے لو کی آوازیں لگاتے پھرتے تھے۔ ان کے پاس مٹی کے کوزے ہوتے۔ ہر کوزے میں مالٹے کی سائز کے دو لڈو ہوتے تھے۔ لڈوؤں پر سفید بورا چینی کی بڑی باریک سی تہہ جمی ہوتی تھی جس میں سے لڈو کی بڑی بوندیاں زرد موتیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ اسی طرح بھوساول کے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرتی تو مجھے اس کے پلیٹ فارم پر ہمیشہ ہری چھیل کے کیلوں کی ہلکی ہلکی مہک آیا کرتی تھی۔ یہاں کے ہری چھیل کے کیلے بڑے مشہور تھے۔

ان پر نسواری دھبوں کے نشان بالکل نہیں ہوتے تھے۔ بالکل سرسبز ہوتے تھے مگر اندر سے بے حد میٹھے، نرم اور خوشبودار ہوتے تھے۔ اسی طرح لکھنؤ کے اسٹیشن پر مختلف عطریات اور پان کے قسم قسم کے قواموں کی خوشبوئیں پھیلی ہوتی تھیں۔ لکھنؤ کا ریلوے اسٹیشن اپنی نفاست، نزاکت اور خوب صورتی کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔

اس کی عمارت لاہور کے ریلوے اسٹیشن کی عمارت کی ہو بہو نقل تھی۔ اس کے پلیٹ فارم پر پان سگریٹ کے اسٹال بھی ہوا کرتے تھے۔ پتا نہیں اب ہوتے ہیں کہ نہیں۔ یہ اسٹال بڑے بنے سنورے ہوتے تھے۔ یہاں ایک بہت بڑا آئینہ ضرور لگا ہوتا تھا۔ جس کے سامنے کھڑے ہو کر گاہک اپنے بال وغیرہ درست کیا کرتے تھے۔ پان سگریٹ کے اسٹالوں پر اتنی خوشبوئیں اڑتی تھیں کہ آدمی کو محسوس ہونے لگتا کہ یہ پان سگریٹ کا نہیں بلکہ لکھنؤ کے مشہور عطر سازوں اصغر علی، محمد علی کے عطریات کا اسٹال ہے۔

کلکتے جاتے ہوئے جھریا کا اسٹیشن آتا تو اس کے پلیٹ فارم پر اترتے وقت مجھے پتھر کے کوئلوں کی ہلکی ہلکی بو ضرور محسوس ہوتی۔ جھریا میں کوئلے کی کانیں تھیں اور یہاں انجن پر پتھر کا کوئلہ لادا جاتا تھا۔ بمبئی کے اسٹیشن پر مجھے ہمیشہ ایرانی ہوٹلوں میں پی جانے والی چائے اور بارش کی خوشبو آتی تھی۔

ایک چائے اور اوپر سے بارش۔ بارش میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چائے۔ چائے میں بارش۔ پہلی بار جب میں آٹھویں جماعت سے بھاگ کر بمبئی سینٹرل کے اسٹیشن پر پہنچا تھا تو مجھے بارش اور چائے کی اس خوشبو نے ریلوے اسٹیشن سے باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔ اسی طرح سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو کی طرف سفر کرتے ہوئے راستے میں ایک چھوٹے سے جنگلاتی ریلوے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو اس وقت بارش ہو رہی تھی اور اسٹیشن کے سرخ مٹی والے پلیٹ فارم سے مٹی اور اناس کی خوشبو آ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہاں اناس بیچنے والی سیلونی لڑکیاں آ گئی تھیں۔ انہوں نے کیلے کے سبز پتوں پر کٹے ہوئے اناس کے قتلے رکھے تھے اور آواز لگا رہی تھیں۔ پائن ایپل سر! فائیو سینٹ سر! ویری سوئٹ سر!

یہ میرے ماضی کی آوازیں اور میرے ماضی کی خوشبوئیں ہیں جو میرے حال کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی ہیں۔ ایک دن یہ ساری آوازیں' یہ ساری خوشبوئیں' یہ سارے معصوم خوب صورت چہرے مجھے اور میرے ماضی اور میرے حال کو لے کر مستقبل کی نورانی روشنیوں کی وادیوں میں اتر جائیں گے۔

ابھی تک میں یہ بیان کر رہا تھا کہ میں بغیر ٹکٹ کے تھا اور ایک ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھا بمبئی سے دلی کی جانب سفر کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ڈبے میں ٹی ٹی نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ خواہ مخواہ کی مشکل میں پھنس جاؤں گا۔

لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ آدھا دن ٹرین میں سفر کرتے گزر گیا۔ رات ہو گئی ایک اسٹیشن سے گاڑی چلی تو ٹی ٹی صاحب ہمارے ڈبے میں دوڑ کر چڑھ گئے۔ ٹی ٹی ہمیشہ دوڑ کر اس وقت ڈبے میں چڑھتے تھے جب ٹرین چل پڑتی تھی۔ شاید اس خیال سے کہ بغیر ٹکٹ کا کوئی مسافر اگر ڈبے میں موجود ہو تو وہ ڈبے سے اتر نہ جائے۔

میں نے ٹی ٹی کو ڈبے میں چڑھتے دیکھ لیا تھا۔ آگے کوئی بڑا اسٹیشن آنے والا تھا۔ اب یاد نہیں رہا کہ وہ کون سا اسٹیشن تھا۔ بہر حال ٹی ٹی کو دیکھ کر میرا دل ایک دو بار زور سے دھڑکا پھر میں سنبھل گیا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو چکی تھی ورنہ میں کھڑکی میں سے باہر چھلانگ لگا دیتا۔ مسافروں کے ٹکٹ چیک کرتے کرتے وہ میرے پاس آ گیا۔ بولا۔

"چل بے لڑکے ٹکٹ دکھا۔"

میں نے اداکاری شروع کر دی۔ کبھی کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالتا۔ کبھی پاجامے کی جیبوں کو ٹٹولتا۔ اس زمانے میں ایسے پتلون نما پاجامے ہوا کرتے تھے جن میں دو جیبیں لگی ہوتی تھیں۔ ٹی ٹی فوراً سمجھ گیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہا ہوں۔ میں نے کہا۔

"پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ میں نے اسی جیب میں رکھا تھا۔"

ٹی ٹی نے مجھے کان سے پکڑ کر کھڑا کیا اور بولا۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔ جی تو چاہتا ہے اگلے اسٹیشن پر تمہیں ریلوے پولیس کے حوالے کر دوں مگر تمہاری عمر پر ترس آتا ہے۔ بس یہی کر سکتا ہوں کہ جہاں گاڑی رکے وہاں تمہیں نیچے اتار دوں گا۔"

بدقسمتی سے گاڑی کی رفتار ہلکی ہونے لگی اور تھوڑی دیر بعد گاڑی رات کے اندھیرے میں ایک ویران جنگل میں رک گئی۔ شاید آگے کوئی سگنل نہیں گرا تھا یا لائن کی مرمت ہو رہی تھی۔

ٹی ٹی مجھے اٹھا کر ڈبے کے دروازے پر لے آیا۔ گاڑی نے سیٹی دی اور دوبارہ چل پڑی۔ ٹی ٹی نے مجھے زبردستی ٹرین سے نیچے اتار دیا۔ میں ریلوے لائن کے پتھروں پر سے پھسل کر دور جا گرا۔ اگر میں کسی

ہموار پلیٹ فارم پر ہوتا تو دوڑ کر ٹرین کے کسی ڈبے کے دروازے کو پکڑ کر ٹرین میں سوار ہو سکتا تھا۔ دو تین بار میں ایسا کر چکا تھا۔ مگر وہاں کوئی پلیٹ فارم نہیں تھا اور میں ریلوے لائن سے بھی نیچے ڈھلان پر تھا۔

رات کے اندھیرے میں کسی ڈبے کے دروازے کی آہنی ہتھی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے ٹرین گزر گئی اور میں اس کے سب سے پچھلے ڈبے کی سرخ بتی ہی دیکھتا رہ گیا جو رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔

کچھ دیر تو میں حسرت و یاس کے عالم میں ریلوے لائن کے پاس کھڑا ٹرین کی سرخ بتی کو نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا پھر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اسی طرف چل پڑا جس طرف ٹرین گئی تھی۔

یہ مجھے علم ہو چکا تھا کہ آگے کسی بڑے شہر کا اسٹیشن آ رہا تھا۔ میں دل میں یہ امید لیے چلا جا رہا تھا کہ آگے جو بڑا شہر ہے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ ہر طرف رات کا سناٹا تھا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

پہلے تو گھپ اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اندھیرے میں درختوں اور ریلوے لائن کے دھندلے دھندلے خاکے نظر آنے لگے اور میں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ وہاں نہ تو کہیں ریلوے لائن کی مرمت ہو رہی تھی اور نہ کسی سگنل کی بتی ہی نظر آ رہی تھی۔ پھر خدا جانے ٹرین کیوں رک گئی تھی۔ شاید وہ صرف مجھے نیچے اتارنے کے لیے رکی تھی۔ مجھے نیچے اتارا اور آگے چل دی۔

خدا جانے میں کتنی دیر چلا ہوں گا کہ ایک ندی کا پل آ گیا۔ میں پل پر سے گزر گیا۔ سانپوں کا بھی مجھے ڈر لگا ہوا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ سانپ ریل گاڑی کے پہیوں کی آواز کے عاشق ہوتے ہیں اور برسات کی راتوں میں ریل کی پٹڑی پر لیٹ کر دور سے آتی ہوئی گاڑیوں کے پہیوں کی تھرتھراہٹ کو محسوس کر کے مست ہو جاتے ہیں۔ میرے قدموں کی آواز سے کوئی بھی سانپ گھبرا کر مجھے ڈس سکتا تھا مگر خدا کا شکر ہی رہا۔ اگر اندھیرے میں کوئی سانپ ریلوے لائن پر لیٹا بھی ہوا تھا تو اس نے میری طرف توجہ نہ کی لیکن ایک آدمی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

ریل کی پٹڑی زمین سے چھ سات فٹ کی بلندی پر بنی ہوئی تھی۔ یہ آدمی نیچے چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی جو جل رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں میں سے نکلا تو مجھے نظر آیا۔ وہ سامنے کی جانب سے میری طرف آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ وہیں رک گیا تھا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے آواز دی۔

"کون ہو؟"

میں رک گیا۔ میں نے کہا۔

"گاڑی چھوٹ گئی تھی۔ پیدل اگلے اسٹیشن پر جا رہا ہوں۔"

وہ آدمی لالٹین ہاتھ میں لیے اوپر میرے پاس آ گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں لمبا بانس تھا۔ دیہاتی آدمی تھا کہنے لگا۔

"اگلا اسٹیشن تو کوسوں دور ہے۔ راستے میں کوئی شیر چیتا مل گیا تو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں پریشان ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

"پھر میں کیا کروں؟"

کہنے لگا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ گاؤں قریب ہی ہے۔ وہاں رات گزار کر صبح چلے جانا۔"

اس کے لہجے میں بڑی شفقت تھی۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہم کھیتوں میں سے گزر رہے تھے۔ شاید دیہات کے کھیت تھے کیونکہ چاولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو کسی وقت آ جاتی تھی۔ ایک دو میل جانے کے بعد ایک گاؤں کی دو تین بتیاں دکھائی دیں۔ یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے مکانوں پر اندھیرا چھا رہا تھا وہ آدمی مجھے ایک پرانی حویلی میں لے آیا۔ یہاں اس نے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ ایک عورت نے دروازہ کھول کر نیند بھری آواز میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

اس آدمی نے اپنا ہندوانہ نام بتایا جو میں بھول گیا ہوں۔ کہنے لگا۔

"پورب دادا سے کہو اس کا مہمان آیا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے لالٹین میرے چہرے کے قریب کر دی۔ عورت نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔

"اسے اندر لے آؤ۔"

دیہاتی بولا۔

"تم اسے اندر لے جا کر سلا دو۔ میں صبح پورب دادا سے مل لوں گا۔"

عورت نے مجھ سے کہا۔

"آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ۔"

مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ مجھے علم بھی کیسے ہو سکتا تھا۔ عورت نے ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر دیا۔ ڈیوڑھی میں دھیمی روشنی والی لالٹین روشن تھی۔ لالٹین کی روشنی میں عورت کی آگے مڑی ہوئی ناک سے مجھے اس پر کسی چڑیل کا گمان ہونے لگا تھا مگر اس کا لہجہ بڑا شفقت بھرا تھا۔ کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آؤ۔ اندر والے صحن میں چارپائی پر سو جانا۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر حویلی کے اندرونی صحن میں لے آئی جو چاروں طرف سے اونچی اونچی قلعہ نما دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ وہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ میں اس کو بتایا کہ بمبئی سے دلی جا رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ گاڑی رکی۔ میں نیچے اتر کر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے ذرا دور چلا گیا تو گاڑی چل پڑی۔ دوڑ کر گاڑی کو پکڑنا چاہا مگر اس کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔ میں اسے نہ پکڑ سکا۔ عورت بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ پورب دادا کی لاریاں چلتی ہیں۔ وہ تمہیں صبح کی لاری میں بٹھا دے گا۔ تم دلی چلے جانا۔"

میں نے پوچھا۔

"دلی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

عورت نے کہا۔

"زیادہ دور نہیں ہے۔ اب تم سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

وہ عورت چلی گئی۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ فوراً ہی سو گیا۔ صبح صبح اس عورت نے مجھے جگا کر کہا۔

"اٹھو..... منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لو۔"

غسل خانہ کونے میں بنا ہوا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھو لیا۔ عورت مجھے رسوئی میں لے گئی۔ وہاں چائے پک رہی تھی۔ ساتھ رات کی پکی ہوئی روٹیاں اور مکھن تھا۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ خوب ناشتہ کیا۔ عورت مجھے تھوڑی دیر بعد گھور کر دیکھ لیتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"پورب دادا کی لاریاں کہاں سے چلتی ہیں؟ مجھے وہاں چھوڑ آؤ۔ میرے پاس ٹکٹ کے پیسے ہیں۔"

عورت کے چہرے پر ایک پراسرار سا تبسم نمودار ہوا اور فوراً ہی غائب ہو گیا۔ وہ تازہ روٹیاں پکا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"صحن والی چارپائی پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ پورب دادا کا آدمی تھوڑی دیر میں آئے گا۔ اس کے ساتھ چلے جانا۔"

میں چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ حویلی کا ماحول بڑا پراسرار سا تھا۔ وہاں سوائے اس عورت کے مجھے کوئی دوسرا انسان ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک کالے رنگ کا دبلا پتلا آدمی جس نے سر پر نیلا رومال باندھ رکھا تھا صرف ایک صدری اور دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ عورت کے ساتھ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور میرا جائزہ لینے لگا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ عورت نے مجھ سے کہا۔

"یہ شامو ہے۔ اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہ تمہیں خود دلی جانے والی لاری پر بٹھا دے گا۔ جاؤ۔"

شامو کی نسواری رنگ کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے اسے اس کا شکار مل گیا ہو۔ کہنے لگا۔

"آ جاؤ بابو! آ جاؤ۔ تمہیں دلی پہنچائے دیتا ہوں۔"

میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ حویلی کے باہر ایک خستہ سی پرانی جیپ کھڑی تھی۔ جس کی چھت ترپال کی تھی۔ شامو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ کہنے لگا۔

"بابو! پنجاب سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"ہاں امرتسر سے۔"

"ہوں۔" شامو بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

جیپ کھیتوں کے درمیان بنے ہوئے کچے راستے پر گرد اڑاتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ جیپ گاؤں کی طرف جانے کی بجائے اسے ایک طرف چھوڑ کر اس سے آگے نکل گئی ہے۔ میں نے جھجکتے ہوئے شامو سے پوچھا کہ لاری اڈا گاؤں میں نہیں ہے؟ اس نے کہا۔

"پورب دادا کا لاری اڈا گاؤں سے کچھ دور واقع ہے۔ ابھی پہنچ جائیں گے وہاں۔"

جیپ کھیتوں سے نکلی تو چھوٹے بڑے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ پورب دادا کو گاؤں سے باہر لاری اڈا بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس وقت آسمان پر بادل جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہوا تو درختوں اور جنگلی جھاڑیوں والا ایک جنگل شروع ہو گیا۔

اس جنگل کے وسط میں کھلی جگہ تھی جہاں میں نے دیکھا کہ پندرہ بیس میری عمر کے لڑکے کلہاڑیاں لیے درخت کاٹ رہے تھے۔ چھ سات آدمی بندوقیں اٹھائے ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ ابھی تک مجھے ان لڑکوں کے پاؤں میں پڑے ہوئے لوہے کے کڑے نظر نہیں آئے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ ارد گرد کے قصبوں کے لڑکے ہیں جو یہاں محنت مزدوری کر رہے ہیں۔ شامو نے جیپ سے اترتے ہوئے کہا۔

"آ جاؤ۔ تمہیں دلی جانے والی لاری پر سوار کرا دوں۔"

وہاں درختوں کے نیچے کھپریل کی تین چار چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک کوٹھی لمبی تھی اور فوجی بیرک کی طرح کی تھی۔ ایک موٹا چوڑا چکلا بھاری مونچھوں والا کالے رنگ کا آدمی مونڈھے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ایک آدمی اس کے پاؤں میں بیٹھا اس کی پنڈلیاں دبا رہا تھا۔ سامنے تپائی پر کچھ پھل وغیرہ پڑے تھے۔ شامو نے مجھ سے کہا۔

"یہ پورب دادا ہے۔ یہ تمہیں دلی پہنچا دے گا۔"

اس وقت میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا۔ کم بخت چھٹی حس نے مجھے خبردار کرتے ہوئے بڑی دیر کر دی تھی۔ اگر ایک روز پہلے یہ چھٹی حس مجھے خبردار کر دیتی تو میں اس آدمی کے ساتھ کبھی نہ جاتا جو ایک رات پہلے مجھے ریلوے لائن پر ملا تھا لیکن اب دیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو چکی تھی اور جو کچھ میرے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا وہ ہونے والا تھا۔

مجھے شامو نے پورب دادا کے سامنے پیش کر دیا۔

پورب دادا کی آنکھیں نسواری تھیں۔

پورب دادا نے مجھے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

"کیوں بے! کہاں سے آیا تھا؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "پنجاب سے۔"

پورب دادا نے شامو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ارے شامو اسے کام پر لگا دے۔ جا۔"

میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا کہ میں دلی جانا چاہتا ہوں۔ مجھے کام کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر پورب دادا نے مجھے اردو میں ایک موٹی سی گالی دی اور کہا۔

"ابے تمہیں کام کی ضرورت نہیں ہے تو کیا ہوا' ہمیں تو کام کی ضرورت ہے۔"

اس سے پیشتر کہ میں کوئی جواب دیتا شامو مجھے بازو سے پکڑ کر ایک کوٹھڑی میں لے آیا جہاں ایک آدمی چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔ شامو نے اس آدمی سے کہا۔

"دادا نے کہا ہے اس کا راکھی بندھن کر دو۔"

.....☆☆☆.....

میں نے دیکھا کہ دیواروں پر لوہے کی زنجیریں اور مختلف سائز کے پاؤں میں ڈالنے والے آہنی کڑے یا بیڑیاں لٹک رہی تھیں۔ میں گھبرا گیا اور وہاں سے بھاگنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ میری عقل کہہ رہی تھی کہ تم پھنس گئے ہو۔ تمہیں رات کے وقت لالٹین والے آدمی کے ساتھ نہیں جانا چاہیے تھا۔ اب تم بری طرح پھنس چکے ہو۔ اس آدمی نے چارپائی سے اٹھ کر میری ایک پنڈلی کو ہاتھ لگا کر دیکھا اور پھر دیوار پر لٹکے ہوئے لوہے کے دو کڑے اتار کر لے آیا۔ میں نے کچھ گھبراہٹ اور کچھ غصے کے ساتھ کہا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

شامو نے کہا۔

"ارے بابو! یہ گلوالوہار ہے۔ تمہارے پاؤں میں کڑا ڈال کر تمہارا راکھی بندھن کر رہا ہے۔ تم ذرا پہن کر تو دیکھو۔"

جونہی وہ آدمی میری طرف بڑھا میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور اونچی آواز میں کہا۔

"خبردار جو میرے پاؤں میں کڑا ڈالنے کی کوشش کی۔"

اس کے ساتھ ہی شامو نے اتنی زور سے مجھے ایک تھپڑ مارا کہ میں نیچے گر پڑا اور میرے ہونٹوں کے کنارے سے خون بہنے لگا۔ شامو مجھے گالیاں دینے لگا۔ اس نے اپنے آدمی سے کہا۔

"اسے پکڑ کر ڈالو اس کے پاؤں میں بیڑیاں۔"

میں چکرا گیا تھا۔ سہم گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ بڑے ظالم جابر قسم کے لوگ ہیں اور مجھے قید کر رہے ہیں۔ اب میں ان کے قبضے میں ہوں۔

میرے پاؤں میں لوہے کے دو کڑے ڈال دیئے گئے۔ ان کڑوں کے ساتھ گز ڈیڑھ گز کی ایک زنجیر بھی بندھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں قدم قدم چل تو سکتا تھا مگر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ شامو نے اس کوٹھڑی میں سے ایک کلہاڑی اٹھا کر دے دی اور کہا۔

"چل بے میرے ساتھ۔"

شامو مجھے کوٹھڑی سے نکال کر اس طرف بڑھا جہاں دس پندرہ لڑکے درختوں کی کٹائی کر رہے تھے۔ میں ٹھیک طرح سے چل نہیں سکتا تھا مگر چلنے پر مجبور تھا۔ لوہے کے کڑے میرے پاؤں کو تکلیف دے

رہے تھے۔ وہاں جو مسلح پہرے دار لڑکوں کی نگرانی کر رہے تھے ان کے حوالے کر دیا گیا۔ انہوں نے مجھے بھی کام پر لگا دیا۔ میں نے امرتسر کے لکڑی کے ٹال پر مزدوروں کو لکڑیاں کاٹتے دیکھا تھا مگر خود کبھی کسی درخت پر کلہاڑی نہیں چلائی تھی لیکن یہاں میں قیدی تھا۔ میں نے ذرا دیر کر دی تو ایک پہرے دار نے مجھے گالی دے کر ایک تھپڑ مارا اور کہا۔

"دیکھتا کیا ہے بے! کام شروع کر۔"

میں نے مجبوراً درخت کاٹنا شروع کر دیا۔ دوسرے لڑکوں نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جسم کمزور ہو گئے تھے۔ چہروں پر فاقہ کشی کے آثار تھے۔

دوپہر تک میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ مشقت کرتا رہا۔ کسی لڑکے کو ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر غلطی سے کوئی لڑکا کسی لڑکے سے کوئی بات کرتا تو پہرے دار اسے مار مار کر اس کا برا حال کر دیتے۔ دوپہر کو ہمیں کھانے کے لیے دال اور باسی روٹی دی گئی۔ اس کے بعد پھر ہمیں کام پر لگا دیا۔

شام تک ہم مشقت کرتے رہے۔ میرا برا حال تھا۔ سارا جسم تھکاوٹ سے چور چور ہو گیا تھا۔ رات کو ہمیں ایک لمبی بیرک میں گھاس پھوس پر ڈال دیا گیا۔ بیرک میں صرف ایک لالٹین روشن تھی۔ دو پہرے دار بندوقیں لیے بیرک کے دونوں دروازوں پر بیٹھے پہرہ دے رہے تھے۔ تمام لڑکے اس قدر تھکن سے چور تھے کہ کسی کو ایک دوسرے سے بات کرنے کا ہوش نہیں تھا۔ سب گھاس پھوس پر گرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی سو گئے۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سارا بدن درد کر رہا تھا۔ ہونٹ جہاں سے پھٹ گیا تھا وہاں بھی زخم میں درد ہو رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ میں کیوں اس آدمی کی ساتھ چل پڑا تھا۔ مگر اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف وہاں سے فرار کی ترکیبیں ہی سوچ سکتا تھا جو بظاہر بہت مشکل دکھائی دیتا تھا۔

ایک تو یہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ سارا علاقہ ویران جنگلاتی تھا۔ ہمیں روز صبح اٹھا دیا جاتا۔ ایک ایک گلاس چائے کا ایک باسی روٹی کے ساتھ دیا جاتا۔ اس کے بعد ہمیں جانوروں کی طرح ہانک کر جہاں کٹائی ہو رہی تھی وہاں پہنچا دیا جاتا اور ہم درخت کاٹنے کی مشقت میں لگ جاتے۔ مسلح پہرے دار ہر وقت ہماری نگرانی کرتے رہتے۔

اسی طرح جب ایک ہفتہ گزر گیا تو ایک دن ہم سب کے پاؤں میں سے لوہے کے کڑے اتار دیئے گئے۔ جنگل کے تقریباً سارے سوکھے درخت ہم نے کاٹ ڈالے تھے۔ اس کے بعد ہمارے پاؤں میں رسیاں باندھ دی گئیں۔ رسیاں اس طرح باندھی گئی تھیں کہ ہم چل تو سکتے تھے مگر بھاگ نہیں سکتے تھے۔

دو دن تک ہم سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ ہمیں ندی پر لے جا کر نہلایا گیا۔ پھر سب لڑکوں کو جن کی مشقت اور کم خوراک سے پسلیاں نظر آنے لگی تھیں ایک ایک کرتا اور ایک ایک نیکر پہننے کو دی گئی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہمیں کسی اور مہم کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔

آخر یہ راز بھی کھل گیا۔

معلوم ہوا کہ ہمیں وہاں سے ایک بڑے ٹرک میں ڈال کر بمبئی لے جایا جا رہا ہے جہاں ہمیں ایک اور ایجنٹ کے ہاتھوں فروخت کر دیا جائے گا اور وہ ایجنٹ ہمیں کسی طریقے سے بحری جہاز میں سوار کرا کر جنوبی افریقہ لے جائے گا جہاں ہمیں کسی گھنے جنگل کی کٹائی پر لگا دیا جائے گا۔ یہ بات مجھے ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لڑکے نے سرگوشیوں میں بتائی تھی۔ اتفاق سے ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس لڑکے نے پہرے داروں سے یہ بات سنی تھی۔

میں اس انکشاف پر بڑا پریشان ہوا۔ میں کنویں سے نکل کر کھائی میں گرنے والا تھا۔ اگر ایک بار جنوبی افریقہ کے جنگلوں میں پہنچا دیا گیا تو پھر ساری زندگی وہاں سے رہائی نصیب نہیں ہوگی۔ سخت مشکل میں پھنس گیا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

پاؤں میں بندھی ہوئی رسی کی وجہ سے میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ تیسرے دن رات کے وقت وہاں ایک بہت بڑا ٹرک آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہمیں بیرک سے نکال کر اس ٹرک میں جانوروں کی طرح ٹھونس دیا گیا۔ ٹرک کے اندر دونوں جانب دیوار کے ساتھ لوہے کی ہکیں لگی ہوئی تھیں۔

ہمارے پاؤں کی رسیاں کھول کر ہمارے پاؤں میں لوہے کی زنجیریں ڈال کر زنجیروں کے کنڈے ٹرک کے ہکوں میں پھنسا دیئے گئے۔ ٹرک چاروں طرف سے بند تھا۔ صرف دیواروں کے اوپر کچھ سوراخ رکھے گئے تھے جن میں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ ٹرک کے اندر اس قدر حبس تھا کہ ہم سب قیدی لڑکوں کا برا حال ہو رہا تھا۔

آخر ٹرک چل پڑا۔ ٹرک کے چلنے سے اندر تازہ ہوا آئی تو ہم سب کی جان میں جان آئی۔ ڈرائیور کی سیٹ کے عقب میں ایک چوکور کھڑکی تھی جس میں سے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھانک کر قیدی لڑکوں کو دیکھ لیتا تھا۔ ساری رات ٹرک چلتا رہا۔ دن نکلا تو ٹرک سڑک سے ہٹ کر جنگل میں کسی جگہ کھڑا کر دیا گیا۔ یہاں ہمیں ٹرک سے نکال کر ایک جگہ درختوں کے درمیان تھوڑا بہت چلایا پھرایا گیا۔

چار مسلح پہرے دار ہمارے آگے پیچھے تھے۔ اس وقت ہمارے پاؤں کھلے تھے۔ مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ بھاگ سکتا۔ یہاں ہمیں چائے اور باسی روٹی کھانے کو دی گئی۔ ایک ندی پر ہمیں سخت پہرے میں نہلایا گیا۔ اس کے بعد ہم سب قیدی لڑکوں کے ایک ایک پاؤں میں رسی باندھ کر ایک دوسرے سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ ہم چل پھر تو سکتے تھے مگر بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بندوق لیے ایک پہرے دار ہر وقت ہمارے سر پر موجود ہوتا تھا۔

دوپہر کو ہمیں پتلی دال کے ساتھ دو دو روٹیاں کھانے کو دی گئیں۔ اسی طرح رات کو بھی ہمیں یہی کھانا دیا گیا جب رات کا اندھیرا چھانے لگا تو ہمیں واپس ٹرک میں مال مویشیوں کی طرح دھکیل کر زنجیروں کے ساتھ باندھ دیا گیا اور ٹرک چل پڑا۔

تین راتوں کے سفر سے ہم بمبئی پہنچے۔

ان لوگوں نے ٹرک بمبئی کے ساحل سمندر سے کچھ فاصلے پر ایک ویران جگہ پر کھڑا کیا تھا۔ یہاں دو آدمی آئے۔ انہوں نے ہمارا معائنہ کیا اور چلے گئے۔ یہاں ہمیں بتایا گیا کہ ہم جنوبی افریقہ جا رہے ہیں جہاں ہم محنت مزدوری کریں گے اور ہمیں نئے کپڑے بھی ملیں گے اور ہر مہینے اتنی تنخواہ دی جائے گی کہ ہم اپنے گھر والوں کو بھی پیسے بھیج سکیں گے۔ ہمیں وہاں پوری آزادی ہوگی اور ہم شہر کی سیر بھی کر سکیں گے۔ یہ سب جھوٹے دلاسے دینے والی باتیں تھیں۔ ہم سب لڑکوں کو معلوم تھا کہ ہم ایک کنویں سے نکل کر دوسرے کنویں میں گر رہے ہیں۔

میرا دل یہ سوچ سوچ کر بیٹھا جا رہا تھا کہ اگر میں بھی ان کے ساتھ جنوبی افریقہ چلا گیا تو پیچھے میرے

ماں باپ، بہن بھائیوں کا تو برا حال ہو جائے گا۔ میں تو انہیں بتا بھی نہیں سکوں گا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ یہ لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ میں کسی حادثے میں ہلاک ہو چکا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے مجھے اس قسم کی سنگین صورت حال کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ ہمیں سمندر کے کنارے ایک ویران بیرک میں بند کر دیا گیا۔ ہمیں دوسرے ایجنٹ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ یہاں ہماری نگرانی کرنے والے نئے لوگ تھے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ بڑے ایجنٹ نے ہم سب کو ایک تقریر کر کے خبردار کر دیا تھا کہ اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو اسے وہیں گولی مار دی جائے گی۔

بیرک میں ہمارے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ کسی لڑکے کے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ معلوم ہوا کہ آدھی رات کے بعد سمندر کے کنارے ایک اسٹیمر آئے گا جو ہمیں لے کر روانہ ہو جائے گا۔

میرے سامنے فرار ہونے کا صرف یہی ایک موقع تھا کہ جب تک اسٹیمر میں سوار نہیں ہوتا یہاں سے کسی طرح فرار ہو جاؤں۔ ایک بار دوسرے لڑکوں کے ساتھ اسٹیمر میں ٹھونس دیا گیا تو پھر ساری زندگی اس عذاب سے نجات حاصل نہ کر سکوں گا۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ فرار کس طرح ہوا جائے۔ دونوں پاؤں ڈیڑھ گز لمبی زنجیر سے بندھے ہوئے تھے۔

زنجیر کے ساتھ چلنا مشکل تھا۔ بھاگ کیسے جاتا۔ اس وقت ابھی رات کا پہلا پہر تھا۔ باقی جتنے بھی لڑکے تھے سب ان لوگوں نے اپنے علاقے کے ادھر ادھر کے دیہات سے پکڑے ہوئے تھے۔ سبھی غریب کسانوں اور محنت مزدوری کرنے والوں کے ان پڑھ لڑکے تھے۔ ان میں صرف میں ہی ایک پڑھا لکھا تھا۔

ان سب کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنی اس مصیبت کو قبول کر لیا تھا اور ان میں اتنی جرات نہیں تھی کہ فرار ہو سکیں لیکن میں ہر حالت میں فرار ہونا چاہتا تھا لیکن فرار کی کوئی کارگر تدبیر سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے پاس صرف چار پانچ گھنٹے ہی باقی تھے۔ اگر ان چار پانچ گھنٹوں میں یہاں سے بھاگنے میں کامیاب نہیں ہوتا تو پھر سمندر پار جنوبی افریقہ کے جنگلوں سے نکل کر اپنے وطن واپس آنا مجھے ناممکن لگتا تھا۔

میں سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا اور مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ باہر بھی خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں صرف کبھی کبھی سمندر کی لہروں کی آواز آ جاتی تھی۔ سارے لڑکے سو گئے تھے۔

مجھے ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں جاگ رہا تھا اور بھاگ جانے کو بے چین تھا مگر میرے پاؤں میں زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ سے زنجیر کو ٹٹول کر دیکھا۔ یہ لوہے کی مضبوط زنجیر تھی اور اس ایک زنجیر کو تمام لڑکوں کے پاؤں میں سے گزار کر باندھ دیا گیا تھا۔ میں نے بارک کے دروازے کی طرف دیکھا۔ مسلح پہرے دار لالٹین کی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اسٹول پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھا ہوا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سوئے ہوئے لڑکوں پر نظر ڈال لیتا تھا۔ میں نے خدا سے دعا مانگی کہ یا اللہ پاک! میرے یہاں سے فرار ہونے کا غیب سے کوئی سبب پیدا کر دے۔

یہ دعا مانگنے کے چند لمحوں کے بعد مجھے اپنے کانوں میں کسی کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ پہلے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سمجھا کہ میرے آس پاس سوئے ہوئے لڑکوں میں سے کوئی آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ میں نے ان پر نگاہ ڈالی۔ سب سو رہے تھے۔ دوسری بار پھر وہی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ میں سنبھل گیا۔ میں لیٹا ہوا تھا مگر جاگ رہا تھا۔ تیسری بار عورت کی دھیمی آواز کے ساتھ مجھے اس کے الفاظ بھی صاف سنائی دیئے۔ اس نے کہا۔

"اٹھو۔ باہر نکل آؤ۔ میں کھڑی ہوں۔"

میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ یہ سمجھ کر ڈر گیا کہ یہ کسی بھوت پریت کی آواز ہے۔ چوتھی بار پھر وہی مدھم آواز آئی۔

"ڈرو نہیں۔ میں کوئی چڑیل نہیں ہوں۔ میں ترشنا ہوں۔ تم نے میری آواز نہیں پہچانی؟ میں تمہیں یہاں سے نکالنے آئی ہوں۔"

میں بے اختیار ہو کر اٹھ بیٹھا۔ پھر فوراً خیال آیا کہ پہرے دار نے دیکھ لیا تو وہ مجھے گالیاں بکنے لگے گا۔ ترشنا نے کان میں کہا۔

"پہرے دار کا خیال نہ کرو۔ میں نے اسے گہری نیند سلا دیا ہے۔"

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ لالٹین کی روشنی میں مسلح پہرے دار سر نیچے ڈالے سو رہا تھا۔ زنجیر کھل گئی تھی میں آہستہ سے اٹھا اور سوئے ہوئے لڑکوں کے درمیان احتیاط سے پاؤں اٹھاتا دروازے کی طرف بڑھا۔ پہرے دار سچ مچ بڑی گہری نیند سو رہا تھا اور خراٹے بھی لے رہا تھا۔

میں اس کے قریب سے ہو کر بارک سے باہر نکل آیا۔ باہر آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا۔ چاندنی رات میں مجھے بارک کی دیوار کے پاس ایک لڑکی کھڑی نظر آئی۔ میں اس کی طرف جاتے ڈر رہا تھا کیونکہ اب یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ترشنا ایک نارمل لڑکی نہیں ہے بلکہ واقعی ایک بدروح ہے۔ ترشنا نے مجھے ہچکچاتے دیکھا تو خود چل کر میرے پاس آ گئی۔ اس نے نیلے رنگ کی بڑی خوب صورت ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی اور بالوں میں سفید پھول سجے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے لباس سے ایسے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی جو میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"میرے ساتھ آ جاؤ۔"

□.....□.....□

ترشنا میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چل پڑی۔ مجھے وہاں چار آدمی چاندنی رات میں نظر آئے جو رائفلیں لیے ٹہل رہے تھے۔ میں نے ترشنا کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"گھبراؤ نہیں۔ ہم انہیں نظر نہیں آئیں گے۔"

اور واقعی ہم انہیں نظر نہ آئے۔ ہم ان کے درمیان سے ہو کر گزر گئے اور کسی نے ہماری طرف توجہ نہ کی۔ ترشنا نے کہا۔

"جب تک میں نے تمہارا ہاتھ پکڑ رکھا ہے تم کسی کو نظر نہیں آؤ گے۔ ہاتھ چھوڑ دوں گی تو تم سب کو نظر آنے لگو گے۔"

میں نے پوچھا۔

"ترشنا! تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں سخت مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

بھٹکی ہوئی بدروح ترشنا نے کہا۔

"جس دنیا میں ہم بھٹکتی ہوئی بدروحیں رہتی ہیں اس دنیا کا اپنا ایک نظام ہے۔ اپنے کچھ اصول ہیں۔ کچھ قانون ہیں۔ جب ہمیں اجازت ملتی ہے تو ہم انسانوں کی دنیا میں آ جاتی ہیں۔ مجھے اچانک تمہارا خیال آ گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تم بہت بڑی مصیبت میں ہو۔ پس میں اجازت لے کر تمہاری مدد کرنے آ گئی۔"

میں نے ترشنا سے کہا۔

"تم جب پہلی بار مجھے ریل گاڑی میں اپنے دادا کے ساتھ ملی تھیں تو مجھے خیال بھی نہیں آیا تھا کہ تم کوئی بھٹکی ہوئی روح ہو۔ تم نے بھی مجھ پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ جب تم نے مجھے جوگی کی پہاڑی والے مندر کی چڑیل سے بچایا تھا تو اس وقت بھی تم نے مجھ پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ تم کوئی بھٹکی ہوئی روح ہو۔ اب تم نے مجھے یہ سب کچھ کیسے بتا دیا؟"

ترشنا کہنے لگی۔

"اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تمہیں شمشان گھاٹ کے بوڑھے نے میرے بارے میں بہت سی من گھڑت باتیں بتا دی تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ میں جس کسی کو نظر آ جاؤں پھر میں اسے دوسرے دن آ کر مار ڈالتی ہوں جبکہ یہ جھوٹ ہے۔ میں ایسا نہیں کرتی۔ پس میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اب تم سے جب بھی ملاقات ہو گی تو تم پر اپنی اصلیت ظاہر کر دوں گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک بھٹکی ہوئی بد روح ہوں مجھے چین اور سکون نصیب نہیں ہے لیکن میں شیطانی بدروح نہیں ہوں کیونکہ میں نے زندگی میں کسی کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ مجھے میرے گاؤں کے لوگوں نے پکڑ کر چتا پر بٹھا کر جلا دیا تھا اور میں مر گئی تھی۔ میں نے کسی سے انتقام بھی نہیں لیا۔ میں مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کر کے اپنے پاپوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں تاکہ میرے پاپوں کی سزا کچھ کم ہو جائے۔ میں نے بھی زندگی میں بڑے پاپ کیے ہیں اور یاد رکھو جو کوئی چھوٹے سے چھوٹا پاپ بھی کرتا ہے اسے اس کی سزا مرنے کے بعد بھگتنی پڑتی ہے اور جب تک ایک پاپی روح اپنے پاپوں کی سزا بھگت کر پاک صاف نہ ہو جائے وہ آسمانوں کی پاکیزہ دنیا میں داخل نہیں ہو سکتی اور اس دنیا کی فضاؤں میں ہی بھٹکتی رہتی ہے۔"

میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"تمہیں میرا خیال کیوں آ گیا تھا؟"

ترشنا نے کہا۔

"اس لیے کہ تم مجھے اچھے لگے تھے۔ میں نے جب پہلی بار تمہیں ریل گاڑی میں دیکھا تھا تو تم پہلی نظر میں ہی مجھے اچھے لگے تھے۔ بس پھر تمہارا خیال مجھے کیوں نہ آتا۔"

مجھے ترشنا کی زبانی یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ اگر میں اسے چاہتا تھا تو وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اگر وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے تو پھر کیا ہوا۔ محبت بھی

چوہدری محمد ارشد.....کمالیہ
پروردۂ طوفان کو کشتی کی نہیں حاجت
موجوں کے تلاطم میں ساحل نظر آتا ہے

خرم حمید چوہدری.....ٹوبہ ٹیک سنگھ
پیشِ نظر ہے عشق تو ہرگز نہ دعا مانگ
قرباں ہو شمع حسن پہ اور خوں بہا نہ مانگ

سید حشمت.....بکیر اشریف
پتے اڑے ہوا سے مگر آج بھی رہا
وہ رابطہ قدیم جو شاخ و شجر میں تھا

جاوید اختر.....کمالیہ
پھیلا ہوا ہے رنگ فضاؤں میں نور کا
آنچل میں چاندنی ہے کہ چہرہ حضور کا

رانا اسرار احمد خان.....کمالیہ
پھیلا تو میری زیست کا عنواں بنا وہ شخص
سمٹا تو ایک نام میں تحلیل ہو گیا

قمر الدین انصاری.....کمالیہ
پاس تھا ناکامیٔ صیاد کا اے ہم سفر
ورنہ میں اور اُڑ کے آتا دانے کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک روحانی جذبہ ہی ہوتا ہے اور میں اپنی نوعمری کے جس حصے میں سے گزر رہا تھا اس وقت انسان کی روح پوری طرح بیدار ہوتی ہے۔

ترشنا مجھے ساتھ لے کر اس علاقے سے کافی دور نکل آئی تھی۔ جنگل اور سمندر ہمارے پیچھے رہ گیا تھا اور دور کچھ فاصلے پر بمبئی شہر کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے ترشنا سے کہا۔

"مجھے اپنے بہن بھائی اور ماں باپ بہت یاد آرہے ہیں۔ میں ان کے پاس واپس جانا چاہتا ہوں مگر میرے پاس ریل گاڑی کا ٹکٹ خریدنے کے پیسے نہیں ہیں اور میں اس دفعہ بغیر ٹکٹ سفر کرنے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں پھر کوئی ٹی ٹی مجھے راستے میں نہ اتار دے۔"

ترشنا مسکرا رہی تھی۔ چاندنی رات میں اس کا چہرہ بڑا خوب صورت لگ رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"میں تمہیں ٹکٹ لے دوں گی۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔" میں نے اس سے کہا۔

"ابھی ساری رات پڑی ہے۔ دلی امرتسر کی طرف دن کے وقت ہی بمبئی سے گاڑی جاتی ہے۔ تم ایسا کرو مجھے ریلوے اسٹیشن کا راستہ بتادو۔"

وہ کہنے لگی۔

"میں تمہارے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر جاؤں گی۔ مجھے تمہیں ٹکٹ لے کر بھی تو دینا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بمبئی کا اسٹیشن تو یہاں سے کافی دور ہوگا۔"

وہ بولی۔ "ہمارے لیے کوئی شے دور یا نزدیک نہیں ہوتی۔ ہم تھوڑی دیر میں اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔"

باتیں کرتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس نے دوبارہ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

"اب ہم بہت جلد اسٹیشن پر پہنچ جائیں گے۔"

مجھے نہیں پتا کہ پھر کیا ہوا۔ ہم نے ایک بڑی سڑک عبور کی۔ اس کے بعد سامنے والے میدان میں داخل ہو گئے۔ اس میدان میں سے گزرے تو ہم بمبئی شہر کے روشنیوں سے جگمگاتے علاقے میں آ گئے تھے۔ ترشنا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کہنے لگی۔

"اب لوگوں کو تم نظر آنے لگے ہو۔ میں نظر نہیں آرہی۔ صرف تم مجھے دیکھ سکتے ہو۔ وہ سامنے بوری بندر کا اسٹیشن ہے۔"

میں نے نگاہیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ واقعی کچھ فاصلے پر بمبئی کا عظیم الشان عمارت والا بوری بندر اسٹیشن موجود تھا۔ اگرچہ اس وقت رات کے دس گیارہ بجے کا وقت ہوگا لیکن سڑکوں پر گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ صرف بسیں نہیں چل رہی تھیں۔ ہم بہت بڑے چوراہے کو پار کر کے اسٹیشن کے بڑے دروازے کے سامنے آ گئے۔ ترشنا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگی۔

"اب تم کسی کو نظر نہیں آرہے۔ ہم بڑی آسانی سے گیٹ میں سے گزر جائیں گے۔"

گیٹ میں سے گزرنے کے بعد ہم پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ترشنا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کہنے لگی۔

"تمہاری گاڑی اسی پلیٹ فارم پر سے جائے گی۔ تم یہاں بنچ پر بیٹھو میں تمہارے لیے ٹکٹ لے کر ابھی آتی ہوں۔"

ترشنا کی بھٹکی ہوئی روح مجھے ایک بنچ پر بٹھا کر چلی گئی۔

میں اسے پلیٹ فارم کی روشنیوں میں گیٹ کی طرف جاتے دیکھ رہا تھا۔ عجیب بات تھی میں اسے دیکھ رہا تھا لیکن دوسرا کوئی انسان اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر وہ میری نظروں سے بھی اوجھل ہو گئی۔ میرا خیال ہے بمشکل تین منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے دور سے ترشنا آتی نظر آئی۔ وہ میرے پاس

آ کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ریلوے کا ٹکٹ تھا۔ کہنے لگی۔

"یہ میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لائی ہوں۔ یہ بمبئی سے امرتسر تک کا ٹکٹ ہے۔" میں نے کہا۔

"تم فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خواہ مخواہ لے آئی ہو میں تو ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتا ہوں۔"

وہ بولی۔

"لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم اس دفعہ فرسٹ کلاس میں سفر کرو۔"

میں نے کہا۔

"میرا حلیہ اور میرا لباس تو بالکل تھرڈ کلاس کے مسافروں جیسا ہے۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بالکل اجنبی لگوں گا۔ کہیں ٹی ٹی مجھے پکڑ نہ لے کہ میں نے یہ ٹکٹ کہاں سے چرایا ہے۔"

ترشنا نے ذرا غصیلی آواز میں کہا۔

"میں اس ٹی ٹی کو ایسا مزا چکھا دوں گی کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔"

میں نے کہا۔

"لیکن تم تو مجھ سے جدا ہو جاؤ گی۔"

وہ بولی۔

"اب میں تم سے جدا نہیں ہو سکتی۔ تم سے الگ ضرور ہو جایا کروں گی۔ مگر تم سے جدا نہیں ہوں گی۔ مجھے تمہارا ہر وقت خیال رہے گا۔ تم جب بھی مجھے یاد کرو گے میں تم سے ملنے آ جاؤں گی۔"

پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

"تم مجھے یاد کرو گے نا؟"

میری عمر ہی جذبات کے شباب کی عمر تھی۔ میں اس کی محبت میں سرشار ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں تمہیں ہر وقت یاد کروں گا ترشنا۔"

وہ بڑی خوش ہوئی، کہنے لگی۔

"میں تمہیں ایک بات بتاتی ہوں۔ تم امرتسر میں رہتے ہو۔ مجھے معلوم ہے۔ امرتسر شہر میں سیتلا مندر کے پیچھے ایک مرگھٹ یعنی شمشان گھاٹ ہے یعنی وہ جگہ جہاں ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔ جب کبھی تمہیں میری یاد آئے اور تم مجھے ملنا چاہو تو اس مرگھٹ میں سورج غروب ہونے کے بعد آ جانا اور مجھے آہستہ سے تین بار آواز دینا۔ میں آ جاؤں گی۔"

ہم باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ ترشنا نے ٹرین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تمہاری گاڑی آ گئی ہے۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں خود فرسٹ کلاس میں بٹھاتی ہوں۔"

تھرڈ اور انٹر کلاس کے مسافر اپنا سامان لیے ٹرین میں سوار ہونے لگے تھے۔ فرسٹ کلاس کا ایک ڈبہ خالی پڑا تھا۔ ہم اس ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔

"اس سے پہلے میں نے فرسٹ کلاس میں کبھی سفر نہیں کیا۔"

ترشنا بولی۔

"تم آرام سے اپنے گھر پہنچو گے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

پھر اچانک اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"تمہارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔"

وہ بولی۔

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا راستے میں تم بھوکے رہو گے؟"

اس نے اپنے ہاتھ کی ایک مٹھی میرے سامنے بند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی اور جب کھولی تو اس میں سو سو کے دو نوٹ تھے۔ کہنے لگی۔

"یہ تم اپنے پاس رکھو۔"

دو سو روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ ایک آدمی اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ ہمارے ڈبے میں سوار ہوا تو ترشنا نے میرے کان کے قریب ہو کر کہا۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔ پھر ملیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ ڈبے سے اتر گئی۔ میں نے کھڑکی میں سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ ترشنا پلیٹ فارم پر کہیں بھی نظر نہ آئی۔ وہ جا چکی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ ترشنا سے واقعی مجھے محبت ہو گئی تھی۔

میں اسے محبت ہی کہوں گا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہوئے اپنے شہر امرتسر پہنچ گیا۔ والد صاحب نے تھوڑی بہت پٹائی کی اور مجھے نویں جماعت میں داخل کرا دیا۔ مگر اسکول میں میرا جی بالکل نہیں لگتا تھا۔

ایک بار پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ مجھے زنجیریں ڈال دی گئی ہیں۔ میں ان زنجیروں کو توڑ کر ایک بار پھر فرار ہونے کے بارے میں سوچنے لگا۔

ترشنا نے مجھے جو دو سو روپے دیئے تھے ان میں سے صرف بیس روپے ہی خرچ ہوئے تھے۔ باقی سارے پیسے میرے پاس ہی تھے۔ جو میں نے اپنی چھوٹی سی الماری میں کتابوں کے نیچے چھپا کر رکھ دیئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دفعہ بغیر ٹکٹ سفر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مجھے بنگال کے جنگل اور کلکتے کی بارشیں بہت یاد آ رہی تھیں چنانچہ میں نے کلکتے کی طرف فرار ہونے کا پروگرام بنانا شروع کر دیا۔ تیاریاں تو مجھے کوئی کرنی نہیں تھیں۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھے ان ہی کپڑوں میں نکل جانا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دانت صاف کرنے کے لیے ایک ٹوتھ برش جیب میں رکھ لیتا تھا۔ نیو تھیٹرز کی فلموں میں ایک ہیروئن آیا کرتی تھی جو مجھے بے حد اچھی لگتی تھی۔

اس کا فلمی نام جمنا دیوی تھا۔ یہ لمبے قد کی دبلی پتلی لڑکی تھی جو اکثر خاموش رہتی تھی۔ کسی بھی فلم میں میں نے اسے زیادہ باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔ نیو تھیٹرز کی فلم "زندگی" نئی نئی ریلیز ہوئی تھی جس میں جمنا نے سہگل کے ساتھ ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں جمنا کے پراسرار خاموش کردار نے میرے جذبہ عشق کے لیے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

میں نے سوچ رکھا تھا کہ کلکتے جا کر پہلا کام یہ کروں گا کہ جمنا دیوی کے درشن کروں گا۔ "زندگی" فلم کا آخری سین ہر وقت میری آنکھوں کی سامنے رہتا تھا۔ جب جمنا جنگل میں دریا کے کنارے ایک جھونپڑی میں آخری سانس لے رہی ہوتی ہے اور سہگل اس کے سرہانے بیٹھا اسے لوری سناتا ہے۔

سوجا راج کماری! سوجا۔ جب وہ لوری گا چکتا ہے تو جمنا کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور سہگل دل گداز لہجے میں اسے مخاطب کر کے کہتا ہے۔

"سو گئیں راج کماری! ہمیشہ کے لیے سو گئیں۔"

اور خاموشی سے اٹھ کر ناریل کے درختوں میں سے گزرتا دریا کی طرف چلا جاتا ہے۔ میں نے ریلوے اسٹیشن پر جا کر پتا کیا کہ کلکتے کون کون سی گاڑیاں کس کس وقت جاتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک تو ہوڑہ ایکسپریس ہے جو صبح کے ساڑھے نو بجے چلتی ہے۔ دوسری گاڑی کلکتہ ایکسپریس ہے جو رات کے وقت آٹھ بجے پشاور سے آتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے امرتسر سے روانہ ہو جاتی ہے۔

میرے لیے رات کے آٹھ بجے والی گاڑی زیادہ موزوں اور محفوظ تھی کیونکہ اس وقت والد صاحب کے جاسوس مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ والد صاحب کے یہ جاسوس کوئی پیشہ ور جاسوس نہیں تھے اور میرے پیچھے ہر وقت میری جاسوسی نہیں کرتے تھے۔ اصل میں والد صاحب کے جاننے والوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ ان میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ چنانچہ ریلوے اسٹیشن پر بھی والد صاحب کے دوست موجود تھے۔ یہ لوگ مجھے دیکھتے ہی سمجھ جاتے کہ میں گھر سے فرار ہو رہا ہوں۔ میری شہرت بھی ایسی ہی تھی چنانچہ وہ مجھے اسٹیشن پر ہی روک لیتے تھے۔ رات کے وقت ریلوے اسٹیشن پر ان لوگوں سے بچ کر نکلا جا سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے رات کی گاڑی پر فرار ہونے کا پروگرام طے کر لیا۔

ایک دن پہلے میں نے اپنے جوتوں کو پالش کیا۔ اپنا رومال بھی دھو کر استری کر لیا۔ دوسرے دن مجھے امرتسر سے بھاگنا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ کل میں اسکول نہیں جاؤں گا اور حساب کے ماسٹر صاحب میرا کان نہیں مروڑیں گے۔ حساب میں میں بے حد نکما تھا۔ حساب کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

حساب کے پیریڈ میں ماسٹر صاحب بغیر یہ سوچے کہ اس طالب علم پر میری حد سے بڑھی ہوئی اور ہتک آمیز سرزنش کا کیا اثر پڑے گا۔ سب طالب علموں کے سامنے میری بے عزتی کر دیا کرتے تھے۔ اور مجھے میرے نام سے نہیں بلکہ کھوٹا پیسہ کہہ کر بلاتے تھے جو مجھے سخت ناگوار گزرتا تھا۔ گھر سے بھاگنے کا میں نے سوائے اپنے چھوٹے آرٹسٹ بھائی مقصود کے اور کسی سے ذکر نہیں کیا۔ اس کو میں نے اس لیے راز دار بنا لیا تھا کہ وہ بھی اسکول اور گھر سے بھاگ جانے کے پروگرام بنایا کرتا تھا۔ مگر بھاگا کبھی نہیں تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس بار کلکتے جا رہا ہوں اور نیو تھیٹرز کی ہیروئن جمنا دیوی سے بھی ملوں گا تو وہ بڑا خوش ہوا کہنے لگا۔

"تمہارے پاس ریل گاڑی کا کرایہ ہے؟"

میں نے اسے بتا دیا کہ میرے پاس ڈیڑھ سو سے زیادہ روپے موجود ہیں۔ اس نے مشتبہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تم نے کہیں چوری تو نہیں کی۔"

میں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ یہ میرے اپنے پیسے ہیں۔"

وہ بولا۔

"تمہارے پاس یہ پیسے کہاں سے آ گئے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"پرسوں میں کمپنی باغ کی سیر کر رہا تھا کہ ایک جگہ کسی کا بٹوہ گرا ہوا دیکھا۔ اٹھا کر کھولا تو اس میں ایک سو اسی روپے تھے۔ میں نے بٹوہ وہیں پھینک دیا اور پیسے اپنے پاس رکھ لیے۔"

□.....□.....□

میں آرٹسٹ بھائی کو ترشنا کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ آرٹسٹ بھائی مجھ سے دو ڈھائی سال ہی چھوٹا تھا اور ہماری آپس میں بڑی دوستی تھی۔ ہم دونوں کا مزاج بھی ایک ہی تھا۔ بارش اور نیو تھیٹرز کے گانے اور فلم چتر لیکھا کے گیت میری طرح اسے بھی بہت پسند تھے۔ وہ واٹر کلر میں جنگلوں اور سمندروں کی تصویریں بھی بنایا کرتا تھا۔ تصویر بنا بنا کر انہیں لپیٹ کر اپنے لکڑی کے صندوق میں رکھ دیتا تھا۔ سوائے میرے کسی کو دکھاتا نہیں تھا۔ کسی کے سامنے تصویر بھی نہیں بناتا تھا۔ تصویر بناتے وقت اگر کوئی اس کے پاس آ کر تصویر دیکھنے لگتا تو آرٹسٹ بھائی کا چہرہ غصے میں لال ہو جاتا تھا اور وہ سخت لہجے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں تصویر دیکھنے والے کو جھڑک دیتا تھا کہ تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ کہنے لگا۔

"یار چتر لیکھا کی فلم بھی کلکتے میں ہی بنی تھی۔ اس فلم میں رام دلاری نے بڑے زبردست گانے گائے ہیں۔ اگر ہو سکے تو کلکتے میں رام دلاری کو ضرور ملنا۔"

میں نے کہا۔

"سب سے پہلے تو میں جمنا دیوی سے ملوں گا۔ اس کے بعد کوئی دوسرا کام کروں گا۔"

آرٹسٹ بھائی نے کہا۔

"میں اسٹیشن پر تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

میں نے اسے کہا۔

"اگر ہم دونوں ساتھ ساتھ ریلوے اسٹیشن پر گئے تو کوئی نہ کوئی جاسوس ضرور ہمارے پیچھے لگ جائے گا اور پھر والد صاحب کو خبر کر دے گا اور میں کلکتے نہیں جا سکوں گا۔"

آرٹسٹ بھائی بولا۔

"ٹھیک ہے پھر تم اکیلے ہی چلے جانا۔"

میں نے قمیص پاجامہ پہن رکھا تھا۔ پاجامہ پتلون ٹائپ کا تھا جس کی دو جیبیں تھیں۔ ایک جیب میں میں نے ٹوتھ برش رکھ لیا اور قمیص کی جیب میں ایک سو اسی روپے کاغذ میں لپیٹ کر رکھ لیے۔

گاڑی یعنی کلکتہ ایکسپریس رات کے ساڑھے آٹھ بجے چھوٹتی تھی۔ میں ساڑھے سات بجے ہی گھر سے نکل کر کچھ دیر تک کمپنی باغ میں پھرتا رہا۔ پھر اسٹیشن پر آ گیا۔ اسٹیشن کی ایک جانب کھڑے ہو کر میں نے بڑی ہوشیاری سے جائزہ لیا کہ وہاں کوئی اپنا محلہ دار یا واقف تو نہیں ہے۔ مجھے کوئی ایسا آدمی دکھائی نہ دیا میں اوپر سے ہو کر بکنگ ونڈو پر آ گیا۔ امرتسر سے کلکتے تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور تیز تیز چلتا گیٹ میں سے گزر کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ پلیٹ فارم پر آتے ہی میں آخری سرے پر جا کر ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ وہاں ارد گرد کوئی آدمی نہیں تھا۔ جب گاڑی کے آنے میں پانچ سات منٹ رہ گئے تو میں اٹھ کر وہیں بینچ کے پیچھے ٹہلنے لگا۔

پلیٹ فارم پر بہت بڑی گھڑی لگی ہوتی تھی۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے دیکھ لیتا تھا۔

لاہور کی طرف سے جب کلکتہ ایکسپریس شور مچاتی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو میں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹرین رکی تو میں تھرڈ کلاس کا ڈبہ تلاش کرنے لگا۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔ آخر میں تھرڈ کلاس کا ایک ڈبہ نظر آ گیا اور سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے ڈبے کے دوسرے دروازے کے پاس جا کر فرش پر ہی بیٹھ گیا اور ٹرین کے چلنے کی دعائیں مانگنے لگا۔ میں نے اپنا چہرہ دروازے کی طرف کر رکھا تھا تاکہ اگر کوئی کھڑکی میں سے جھانک کر اندر دیکھے تو میں اسے نظر نہ آؤں۔ یہی دھڑکا لگا تھا کہ پیچھے سے کوئی آواز نہ دے دے کہ کہاں جا رہے ہو تم؟

خدا خدا کر کے انجن نے سیٹی دی۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور گاڑی پلیٹ فارم سے کھسکنا شروع ہو گئی۔ جب ٹرین امرتسر کے ریلوے یارڈ سے بھی گزر گئی اور شریف پورے اور رام باغ والے پھاٹک بھی نکل گئے اور ٹرین نے بھی تھوڑی اسپیڈ پکڑ لی تو میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ڈبے کا جائزہ لیا۔ ڈبہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک سیٹ پر دو دو مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ اوپر برتھ پر بھی مسافر لیٹے ہوئے تھے۔ جب ٹرین رات کے اندھیرے میں کمپنی باغ اور چالیس کنوؤں والے پھاٹک سے بھی آگے نکل گئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں کلکتے کی بارشیں، کلکتے کے جنگل اور جمنا دیوی کو دیکھ سکوں گا۔

میں کلکتے پہنچ گیا۔

اس وقت کلکتے میں بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اسٹیشن پر اترتے ہی مجھے فضا میں اناس اور چائے کی خوشبو آئی۔ میں اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک جگہ سائبان کے نیچے کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ یہ میرا کلکتے میں چوتھا پھیرا تھا۔ شہر کی سڑکیں میرے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ زکریا اسٹریٹ میں میرے لوہ گڑھ والے پھوپھا کے بیٹے سلیمان کی قالین بافی اور شالوں کو چرخ چڑھانے کی دکان تھی۔ اس کے پاس جاتے ہوئے میں اس لیے گھبراتا تھا کہ وہ پیچھے گھر والوں کو خبر کر دے گا اور گھر والوں میں سے کوئی نہ کوئی آ کر مجھے پکڑ کر لے جائے گا۔ میرا دوسرا ٹھکانہ امرتسر کے اپنے ایک دوست جے جے کا فلیٹ تھا۔ جے جے کے والد صاحب خشک میوے کا بزنس کرتے تھے۔ جے جے میرے ساتھ آٹھویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ پھر اس کے والد صاحب اسے کلکتے لے گئے اور وہیں کسی اسکول میں اسے داخل کرا دیا۔ جے جے دبلا پتلا گورے رنگ کا شرمیلا سا لڑکا تھا۔ پڑھائی میں بہت تیز ہوا کرتا تھا۔ گھر میں ہر وقت کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ پہلے جے جے کے فلیٹ پر ہی جانا چاہیے۔

میں نے ایک رکشہ پکڑا اور کلکتے کی بارش میں بھیگتے بازاروں میں سے گزرتا ہوا جے جے کے فلیٹ والی بلڈنگ کے باہر پہنچ گیا۔ جے جے گھر پر ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں۔"

کہنے لگا۔ "میرے ابو کو نہ بتانا۔ کہہ دینا کہ میں زکریا اسٹریٹ والے رشتے داروں کے ساتھ آیا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چنانچہ جب جے جے کے والد صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں یہی بتایا۔ وہ اس سے پہلے بھی مجھے زکریا اسٹریٹ میں اپنے پھوپھا زاد کی دکان پر دیکھ چکے تھے۔ ویسے بھی جے جے کے والد صاحب اپنے کاروبار میں اس قدر الجھے رہتے تھے کہ انہیں کاروبار کے سوا کسی دوسری بات کا کم ہی ہوش ہوتا تھا۔ شام کو میں اور جے جے تال جھیل کی طرف سیر کرنے نکل گئے۔ جے جے نے پوچھا۔

"اسکول سے چھٹی لے کر آئے ہو کیا؟"

میں نے کہا۔ "یہی سمجھ لو۔"

کہنے لگا۔ "تمہیں اپنی پڑھائی کا حرج نہیں کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "یار تم تو مجھے نصیحتیں نہ کرو۔"

بولا۔ "میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اس لیے تمہیں کہہ رہا تھا۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ اس بار کب تک آوارہ گردی کا ارادہ ہے؟"

میں نے کہا۔

"اس دفعہ میں چٹاگانگ کے سمندری جنگلوں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔"

جے جے بولا۔

"اس طرف مت جانا۔ ابو کا ایک دوست کہہ رہا تھا کہ ادھر جادو ٹونہ کرنے والے بیراگی ہوتے ہیں اور جنگلوں میں ایسے ایسے زہریلے سانپ ہوتے ہیں جو اچھل کر آدمی کے ماتھے پر ڈستے ہیں۔"

میں ہنسنے لگا۔ "ایسے سانپ تو ہر جنگل میں ہوتے ہیں بلکہ شہروں میں بھی ہوتے ہیں۔ باقی رہی جادو ٹونے والی بات۔ تو میں جادو ٹونہ کو نہیں مانتا۔"

جے جے نے کہا۔ "پھر بھی میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ چٹاگانگ کے جنگلوں کی طرف نہ جاؤ۔"

میں نے جے جے کو بتایا کہ میں تو وہاں جانے کا پکا ارادہ کر چکا ہوں۔ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں ضد کا پکا ہوں اور ایک بار میرے دل میں کسی طرف جانے کا خیال آ جائے تو میں اس کی طرف ضرور جاتا ہوں۔ اپنی اسی ضد کی وجہ سے مجھے زندگی میں فائدہ بھی بڑا ہوا اور نقصان بھی بہت پہنچا ہے۔

جے جے نے پوچھا۔

"چٹاگانگ جا کر رہو گے کہاں؟"

میں نے کہا۔

"کسی چھوٹے سے ہوٹل میں دو ایک روز کے لیے ٹھہر جاؤں گا۔ میرے پاس اس بار تھوڑے پیسے ہیں۔ اس کے بعد وہاں کے جنگلوں کی طرف نکل جاؤں گا۔"

جے جے نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ کہنے لگا۔

"معلوم نہیں تمہارے اندر کس خانہ بدوش کی روح سمائی ہوئی ہے۔"

تین دن کلکتے میں جے جے کے ہاں رہنے کے بعد ایک روز میں ریل گاڑی میں سوار ہو کر چٹاگانگ روانہ ہو گیا۔ کافی لمبا سفر تھا۔ چٹاگانگ پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں چٹاگانگ اتنا ترقی یافتہ شہر نہیں تھا۔ سڑکیں صاف ستھری اور اونچی نیچی تھیں۔ کلکتے کے مقابلے میں یہاں ٹریفک کا رش بالکل نہیں تھا۔ بازار کشادہ تھے اور سڑکوں کی دونوں جانب پختہ فٹ پاتھوں پر ناریل اور سنبل کے گھنے درخت جھکے ہوئے تھے۔

میں نے ریلوے اسٹیشن ہی سے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ چنانچہ اسی ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا۔ رات کا کھانا کھا کر بازار کی سیر کرنے نکل آیا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ ریستورانوں میں بنگالی گانوں کی

ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ کچھ دیر گھومنے پھرنے کے بعد میں ہوٹل میں واپس آ گیا۔ رات کو جلدی سو گیا۔ صبح کافی دن چڑھے آنکھ کھلی۔ نیچے آ کر چائے وغیرہ پی۔ ہوٹل کا مالک ایک سکھ سردار جی تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"کہاں سے آئے ہو لڑکے؟"

میں نے جب امرتسر کا نام لیا تو خوش ہو کر بولا۔

"تم تو ہمارے گوروؤں کی نگری کے رہنے والے ہو۔ ادھر کیا لینے آئے ہو؟"

میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ مجھے اس طرف کے جنگلات دیکھنے کا بہت شوق ہے اور یہی شوق مجھے یہاں کھینچ لایا۔"

سردار بڑا حیران ہوا۔ کہنے لگا۔

"اوئے تمہاری اپنی عمر ہی کتنی ہے اور تم جنگلوں کی سیر کرنے جا رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہے یہاں کے جنگل کتنے خطرناک ہیں؟"

میں نے کہا۔

"جی سردار جی! چاہے کچھ بھی ہو۔ میں گھر سے یہی ارادہ لے کر نکلا ہوں اور اس علاقے کے جنگل دیکھ کر ہی واپس جاؤں گا۔"

جب سردار کو یقین ہو گیا کہ میں پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں اور ہر حالت میں اپنی ضد پوری کر کے رہوں گا تو کہنے لگا۔

"تم ہمارے گوروؤں کی نگری کے رہنے والے ہو۔ میں نہیں چاہوں گا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ ٹھیک ہے۔ کاکسز بازار کے اندرونی جنگل میں میرا ایک دوست بشن سنگھ ٹھیکیدار رہتا ہے۔ وہ درختوں کی کٹائی اور چیرائی کا کاروبار کرتا ہے۔ یہ درختوں کی کٹائی کا سیزن ہے۔ آج کل وہ وہیں پر ہے۔ میں تمہیں اس کے نام خط لکھ دوں گا۔ تم اس کے پاس چلے جاؤ۔ وہاں رہ کر تم ارد گرد کے جنگلوں کی سیر کر سکو گے۔"

سردار جی نے مجھے بڑا اچھا موقع بہم پہنچا دیا تھا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ چٹاگانگ میں دو دن سیر کرنے کے بعد میں کاکسز بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔ سردار جی نے مجھے اپنے دوست بشن سنگھ کے نام ایک خط لکھ کر دے دیا تھا۔ کاکسز بازار وہاں سے کافی دور واقع تھا۔ ایک چھوٹے سے جنگلاتی اسٹیشن تک میں نے چھوٹی لائن کی ریل گاڑی میں سفر کیا۔ اس کے بعد ایک کھڑکھڑاتی ہوئی مسافروں سے بھری بس میں بیٹھ کر کاکسز بازار پہنچا۔ سردار جی نے مجھے پورا نقشہ بنا کر بتا دیا تھا کہ کہاں کہاں سے مجھے جانا ہوگا۔ میں نقشے کے مطابق ایک بیل گاڑی پر سفر کرتا جنگل میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں بشن سنگھ ٹھیکیدار کی آرا مشینیں کٹائی کا کام کر رہی تھیں۔ علاقے کے مزدور بھی کام میں لگے تھے۔ میں نے ایک مزدور سے بشن سنگھ کا پوچھا تو اس نے لکڑی اور بانس سے بنے ہوئے ایک کوارٹر کی طرف اشارہ کیا۔ لکڑی اور بانس کا یہ کاٹیج نما کوارٹر زمین سے کوئی چار فٹ بلند ایک مچان پر بنا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں کوارٹر کے برآمدے میں سردار بشن سنگھ کے سامنے بانس کے صوفے پر بیٹھا تھا اور بشن سنگھ وہ خط پڑھ رہا تھا جو مجھے چٹاگانگ والے سردار جی نے دیا تھا۔ خط پڑھ کر بشن سنگھ نے اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لیا اور بولا۔

"کیا تم جنگل میں شکار کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں، میں صرف جنگلوں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔"

بشن سنگھ کہنے لگا۔

"بھئی واہ۔ یہ جنگل کوئی لاہور کا چڑیا گھر نہیں ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ تم اس کی سیر کرتے پھرو گے۔ یہ تو سندر بن کے جنوبی جنگل ہیں۔ یہاں دنیا کے سب سے زیادہ خونخوار شیر، چیتے اور زہریلے سانپ رہتے ہیں۔ میری مانو اور ایک دو دن یہاں رہ کر واپس چلے جاؤ۔"

میں نے کہا۔

"سردار جی! اب میں اتنی دور سے یہاں آیا ہوں۔ کم از کم ایک آدھ دن ہی مجھے جنگل کی سیر کر لینے دیں۔ پھر واپس چلا جاؤں گا۔"

بشن سنگھ کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

"اس وقت تو دن ڈھل رہا ہے۔ کل صبح تمہیں ایک آدمی کے حوالے کر دوں گا۔ وہ تمہیں جنگل کی سیر کرا دے گا۔"

شام ہوئی تو سردار بشن سنگھ دو جنگلی مرغیاں شکار کر کے لے آیا۔ نوکر نے انہیں پکایا۔ ساتھ چاول اور سلاد تھا۔ کھانے کے بعد میری چارپائی بانس کے بنے ہوئے ایک جھونپڑے کے باہر برآمدے میں ڈال دی گئی۔ کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے الاؤ روشن کر دیا گیا۔ سردار بشن سنگھ نے بتایا کہ یہ آگ رات کو اس لیے روشن رکھی جاتی ہے کہ کوئی درندہ ادھر کا رخ نہ کرے۔

رات ہوئی تو جنگل میں گہری خاموشی چھا گئی۔ آدھی رات کے وقت جبکہ میں ابھی جاگ رہا تھا دور سے شیر کی دہاڑ سنائی دی۔ بنگالی نوکر نے مجھے آ کر کہا۔

"بابو شیر بول رہا ہے۔ کوئی پتہ نہیں ادھر آ جائے۔ چارپائی اندر کر لو۔"

میں چارپائی جھونپڑی کے اندر لے گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ کچھ دیر تک شیر کے گرجنے کی گونج سنائی دیتی رہی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ جانے کس وقت میں سو گیا۔ صبح اٹھا تو کافی دن نکل آیا تھا۔ میں اٹھ کر درختوں کے نیچے پھرنے لگا۔ جہاں گھاس اور جھاڑیوں کے اوپر درختوں کی چھاؤں نہیں تھی وہاں جھاڑیوں کے پتے اور گھاس شبنم میں شرابور تھی۔ گھاس میں قسم قسم کے چھوٹے بڑے پھول کھلے ہوئے تھے۔ دھوپ کی سنہری کرنیں درختوں کی شاخوں میں سے ترچھی ہو کر آ رہی تھیں۔ کئی درختوں پر ابھی تک چڑیاں اور پرندے بول رہے تھے۔ فضا پاکیزہ اور شفاف تھی۔ ہوا ابھی شبنم میں بھیگی ہوئی تھی۔ بعض درخت اتنے اونچے تھے کہ سر اٹھا کر دیکھنے سے بھی پورے نظر نہیں آتے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد سردار جی نے ایک دبلا پتلا بنگالی میرے ساتھ کر دیا کہنے لگے۔

"یہ بھلوا ہے۔ یہ تمہیں اپنے ساتھ رکھ کر جنگل کی سیر کرائے گا۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ تم بھی جنگل میں زیادہ دور جانے کی کوشش نہ کرنا۔"

بنگالی ملازم جس کا نام بھلوا تھا میرے آگے آگے چل پڑا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نیزہ تھا۔ جب ہم کٹائی کے علاقے سے نکل کر ایک دوسرے جنگل میں داخل ہوئے تو میں نے بھلوا سے پوچھا۔

"بھلوا! میں نے سنا ہے بنگال میں جادو ٹونہ کرنے والے بیراگی سادھو بھی ہوتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟" بھلوا بولا۔

"بیراگی لوگ بہت کم جادو ٹونہ کرتے ہیں لیکن یہاں کے سپیرے بڑے زبردست جادو ٹونہ کرتے ہیں۔ بعض سپیروں کے پاس ایسی ناگنیں ہیں جو دن کے وقت سانپ کی شکل میں پٹاری میں بند رہتی ہیں اور رات کو عورت بن جاتی ہیں۔"

(باقی آئندہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk